افتادگانِ خاک

The Wretched of the Earth

فرانز فینن

Frantz Fanon

فہرست

پیش لفظ
کچھ تشدد کے بارے میں
تشدد بین الاقوامی پس منظر میں
بیساختگی...اس کی قوت اور کمزوری
قومی شعور کے خطرات
کچھ قومی تہذیب کے بارے میں
قومی تہذیب اور جدوجہد آزادی کی باہمی بنیادیں
نوآبادیاتی جنگیں اور ذہنی امراض
حرف آخر
حوالہ جات

پیش لفظ

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس سرزمین پر دو ارب لوگ بستے تھے: آدھے ارب انسان اور ڈیڑھ ارب دیسی۔ ''حق اول الذکر کے پاس تھا اور فریضہ دوسروں کے پاس۔ ان دونوں کے درمیان چھوٹے

موٹے بادشاہ، جاگیردار اور سرمایہ دار تھے' سر سے پیر تک مصنوعی اور بناوٹی، جن کا کام دلالی تھا۔ نو آبادیوں میں تو حقیقت ننگی تھی مگر ''مادروطن'' کے فرزند اسے ملبوس دیکھنا پسند کرتے تھے۔ یورپی باشندوں کو ان سے محبت کرنی پڑتی تھی کچھ اس طرح جیسے ماں سے محبت کی جاتی ہے۔ یورپی دانشوروں نے دیسی دانشوروں کا ایک خاص طبقہ ڈھالنے کا تہیہ کیا۔ انہوں نے ہونہار نوجوانوں کا انتخاب کیا۔ انہیں مغربی تہذیب کے اصولوں سے داغا۔ اسی طرح جیسے گرم لوہے سے داغتے ہیں۔ ان کے منہ میں بلند آہنگ فقرے ٹھونسے۔ شاندار چپچپے الفاظ بھرے جو دانتوں سے چپک کر رہ گئے۔ کچھ دن ''مادروطن'' میں گذار کر انہیں گھر واپس بھیج دیا جاتا۔ اب ان پر سفیدی پھر جاتی تھی۔ یہ وہ چلتے پھرتے دروغ تھے جن کے پاس اپنے بھائیوں کے لئے کوئی پیغام نہ ہوتا... وہ محض بازگشت تھے۔ پیرس سے' لندن سے' ایمسٹرڈم سے' ہم یہ الفاظ ادا کرتے ''یونانی تہذیب! انسانی برادری'' اور پھر افریقہ اور ایشیا کے کسی گوشے میں ہونٹ کھلتے... ''تہذیب!... برادری!'' یہ زمانہ سنہری زمانہ تھا۔

یہ دور ختم ہوا۔ اب منہ خود بخود کھلنے لگا۔ زرد اور کالی آوازیں اب بھی ہماری انسان پسندی ہی کی بات کرتیں مگر اب وہ ہمیں غیر انسانیت پر مطعون کرنے لگیں۔ ناپسندیدگی کے مہذب اظہار پر ہم ناخوش نہ ہوتے اور اول اول تو ہمیں اس پر فخر آمیز تعجب ہوتا اچھا؟ اب یہ خود بخود بولنے گے؟ ذرا دیکھنا ہم نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا! ہمیں اس پر کوئی شبہ نہ تھا کہ بالآخر وہ ہمارے نصب العین اپنا لیں گے اس لئے کہ وہ ہمیں ان کا پابند نہ رہنے پر مطعون کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یورپ کو اپنے مشن کا ایقان ہو جاتا، کہ بالآخر اس نے ایشیائی اقوام کو مہذب بنا دیا۔ اس نے یونانی لاطینی نیگروؤں کی ایک نئی نسل تیار کر دی اور ہم آپس میں یہ کہتے' جیسے دنیا والے کہتے ہیں ''بہر حال انہیں چیخنے چلانے دو' اس طرح ان کا دل ٹھنڈا ہوتا ہے، گرجنے والے برستے نہیں۔''

اب اس منظر پر ایک نئی نسل ابھری جس نے مسائل کا رخ موڑ دیا۔ ناقابل یقین صبر وسکون کے ساتھ نئے ادیبوں اور شاعروں نے ہم پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہماری اقدار اور ان کی زندگی کے صحیح حقائق ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے' اور یہ کہ وہ ان اقدار کو نہ تو پورے طور پر رد کر سکتے ہیں نہ ہی انہیں کلیتاً ہضم کر سکتے ہیں۔ کم وبیش وہ یہ کہنا چاہتے تھے ''تم ہمیں وحشی بنا رہے ہو' تمہاری انسان پسندی ہمیں بتاتی ہے کہ ہم دنیا کے انسانوں کے برابر ہیں مگر تمہارے نسلی امتیازات ہمیں دوسروں علحدہ کر دیتے ہیں۔'' ہم نے بہت اطمینان سے ان کی باتیں سنیں۔ نو آبادیاتی حکام کو ہیگل کے مطالعے کے لئے تنخواہ نہیں ملتی۔ اسی لئے وہ اس کا مطالعہ کم ہی کرتے ہیں لیکن انہیں یہ بتانے کے لئے کسی فلسفی کی ضرورت نہیں کہ غیر مطمئن ضمیر اپنے ہی تضادات میں پھنس جاتا ہے۔ ایسے لوگ کہیں کے نہیں رہتے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ

ان کی بے اطمینانی کا تسلسل جاری رکھا جائے۔ پھر وہ باتوں کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ اور ماہرین نے ہمیں یہ بتایا کہ اگر اپنی آہ زاری کے دوران میں وہ کوئی ٹھوس مطالبہ بھی کریں گے تو وہ انضمام کا مطالبہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس مطالبہ کو منظور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے وہ نظام جس کی بنیاد لاتعداد استحصال پر ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ تباہ ہو جائے گا۔ یہ کافی ہے کہ انہیں گاجر دکھائی جاتی رہے اور وہ سرپٹ دوڑتے رہیں گے۔ جہاں تک بغاوت کا تعلق ہے، ہمیں اس سلسلے میں مطلق پریشان نہ ہونا چاہئے۔ بھلا کونسا ایسا دیسی باشندہ ہوگا جو نیک فرزندان یورپ کو محض اس لئے قتل کرے گا کہ وہ خود انہیں طرح کا یورپی ہونا چاہتا ہے؟ مختصراً یہ کہ ہم نے ان غیر مطمئن روحوں کو ہمت افزائی کی اور اسے نیک شگون سمجھا کہ نیگرو کو بھی ''گاں کور'' انعام دیا جائے۔ یہ 1939 سے پہلے کی بات ہے۔

اب 1961 ہے۔ سنیئے: ''ہمیں بنجر دعاؤں اور مکروہ نقالی میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے۔ یورپ کو اپنے حال پر چھوڑو کہ وہاں لوگ انسان کے موضوع پر بات کرتے نہیں تھکتے لیکن جہاں بھی انہیں انسان نظر آتا ہے اسے قتل کر دیتے ہیں: اپنی ہر سڑک کے موڑ پر... دنیا کے گوشے گوشے میں.... صدیوں تک انہوں نے نام نہاد روحانی واردات کے نام پر کم وبیش پوری انسانیت کا گلا گھونٹے رکھا ہے۔'' یہ لہجہ نیا ہے۔ اس طرح بولنے کی کسے ہمت ہوئی؟ یہ ایک افریقی ہے۔ تیسری دنیا کا ایک انسان۔ ایک سابق ''دیسی۔'' وہ مزید کہتا ہے ''یورپ آج ایسی دیوانگی اور ناعاقبت اندیشی کی دوڑ میں مبتلا ہے کہ اب اس نے تمام تر ہدایت ودانش سے قطع نظر کر لی ہے اور سر کے بل ایک گہری کھائی میں گر رہا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اس سے بچنے کی کوشش کریں۔'' دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اب ختم ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا بیان خوشگوار نہیں لیکن ہم سب اسے مانتے ہیں۔ کیوں، میرے یورپی ساتھیو، کیا ہمیں اپنے دلوں کی گہرائیوں تک میں اس کا یقین نہیں ہے؟

تاہم یہاں ایک استثنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک فرانسیسی دوسرے فرانسیسیوں سے یہ کہتا ہے کہ ''اب یہ ملک ختم ہوا چاہتا ہے اور میرا خیال ہے کہ 1930 کے بعد سے تقریباً روز ہی یہ سننے میں آتا ہے۔ تو یہ محض جذباتی بات ہوتی ہے۔ محبت اور غصے سے سلگتے کہنے والا خود کو بھی اپنے ہم وطنوں میں ہی شامل کرتا ہے۔ اور پھر وہ بالعموم ''تاوقتیکہ'' کا بھی اضافہ کرتا ہے۔ اس کا مفہوم بالکل واضح ہے اس میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے یعنی اگر اس کی ہدایات پر بالتفصیل عمل نہ کیا گیا تو اور محض صورت میں ملک تباہی کا شکار ہو جائے گا۔ مختصراً یہ کہ ایک تنبیہہ ہے جس کے ساتھ مشورہ بھی شامل ہے اور یہ بیان اس لئے بھی کم دہشت انگیز ہے کہ یہ قومی تعلق خاطر کا اظہار ہے۔ لیکن اس کے برعکس جب فین یورپ کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ تیزی سے تباہی کی طرف جا رہا ہے تو یہ خطرے کا احساس دلانے کے بجائے محض

مرض کی تشخیص ہے۔ یہ ڈاکٹر نہ تو یہ کہتا ہے کہ اس کا مرض لا دوا ہے۔ کہ معجزے بھی ہوتے ہیں ہیں...نہ ہی وہ علاج بتا تا ہے۔ وہ تو محض خارجی شواہد اور ان علامتوں کی بنیاد پر جو اس کے مشاہدے میں آئی ہیں یہ استناد کرتا ہے کہ وہ مرنے کے قریب ہے۔ علاج سے وہ منکر ہے۔ اس کے پاس کرنے کو اور بہتیرے کام ہیں۔ اسے اس کی مطلق پروا نہیں کہ وہ مرے یا جئے اسی سبب سے اس کی کتاب اہانت آمیز ہے۔ اور اگر آپ از رہ تفنن پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہیں ''لو۔ اب اس نے ہمیں چکر میں ڈال دیا ہے۔'' تو آپ اس اہانت کی اصلیت کو نہیں پہنچے۔ اس لئے کہ فینن نے آپ کو چکر دینا مطلق نہیں چاہا ہے۔ اس کی کتاب بعض لوگوں کے لئے نہایت گرما گرم چیز ہے مگر جہاں تک آپ کا تعلق ہے یہ اتنی سرد ہے جیسے برف۔ وہ آپ کے بارے میں تو اکثر گفتگو کرتا ہے مگر آپ سے نہیں کرتا۔ کالے ''گاں کورا' اور زرد ''نوبل'' اب ختم ہو گئے۔ نو آبادیاتی ملک الشعرا کا دور چلا گیا۔ اب ایک فرانسیسی بولنے والا سابق دیسی اس زبان سے نئے تقاضے پورے کراتا ہے، اسے استعمال کرتا ہے اور محض نو آبادیاتی باشندوں سے مخاطب ہے۔ ''پس ماندہ ممالک کے باسیو! متحد ہو جاؤ!'' کیسا زوال ہے! والدین کے لئے ہم محض بولتے تھے اور اولاد اب ہم مواصلت کا صحیح ذریعہ بھی نہیں سمجھتی۔ اب وہ ہمارے بارے میں تقریریں کرتے ہیں۔ بے شک فینن چلتے چلتے ہمارے شہرہ آفاق جرائم کا حوالہ بھی دیتا جاتا ہے سیف' ہنوئی' مڈغا سکر۔ لیکن وہ جرائم کو مطعون کرنے میں وقت بھی ضائع نہیں کرتا۔ وہ بس انہیں استعمال کرتا ہے اور اگر وہ استعماریت کی چالوں کو نمایاں کرتا ہے اور ان روابط کے پیچیدہ عمل کی وضاحت کرتا ہے جو نو آبادکاروں کو مادر وطن کا طرفدار یا مخالف بناتے ہیں تو یہ محض اپنے بھائیوں کے لئے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ انہیں ہماری اپنی چالوں سے ہمیں مات دینا سکھائے۔

مختصراً یہ کہ تیسری دنیا نے خود کو پالیا ہے اور وہ فینن کی آواز میں اپنے لوگوں سے مخاطب ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا ابھی یکساں نہیں ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ اس میں ابھی غلامی باقی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں جھوٹی آزادی کا ایک چربہ نصیب ہو گیا ہے۔ ایسے لوگ بھی جو آزادی کے لئے اب بھی جنگ کر رہے ہیں اور ایسے جنہوں نے مکمل آزادی تو حاصل کر لی ہے مگر ہمہ وقت سامراجی تشدد کے خدشے میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ غیر یکسانیت استعماری تاریخ یا بالفاظ دیگر ظلم کا شاخسانہ ہے۔ ایک جگہ ''مادر وطن'' بعض تنخواہ دار جاگیرداروں کے تعین پر اکتفا کرتی ہے' دوسری جگہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی حکمت عملی سے اس نے ایک دیسی بورژوازی طبقہ پیدا کر دیا ہے جو سر سے پیر تک کھوکھلا ہے۔ تیسری جگہ اس نے دوہری چال چلی ہے۔ نو آبادیوں میں نو آبادکاروں کو بسایا ہے اور اس کے ساتھ اس کا استحصال بھی جاری رکھا ہے۔ اس طور سے یورپ نے افتراق اور اختلاف پھیلایا ہے' طبقات بنائے ہیں اور بعض اوقات نسلی

امتیازات بھی قائم کئے ہیں۔ یوں نوآبادیاتی معاشروں میں مختلف طبقہ بندیوں کو ابھارنے اور شدید کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔فینن کسی بات کو چھپاتا نہیں۔ ہمارے خلاف لڑنے کے لئے سابقہ نوآبادی کو پہلے اپنے آپ سے لڑنا چاہئے' یوں کہیے کہ دونوں لڑائیاں ایک ہی کل کیا جزا ہیں۔ جنگ کی گرمی سے تمام اندرونی باڑیں جل جاتی ہیں۔ تاجروں اور دکانداروں پر کٹھ پتلی بورژوازی' شہری مضافات کے لمپن پرولتاری سب کے سب دیہاتی عوام کے حق میں جو قومی انقلابی فوج کا سب سے حقیقی سرچشمہ ہوتے ہیں۔صف بستہ نظر آتے ہیں۔ان علاقوں میں جہاں استعماریت دیدہ دانستہ ہر قسم کی ترقی روک دیتی ہے' کسان جب بیدار ہوتا ہے تو فوری طور پر انقلابی طبقہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا سابقہ ننگے ظلم سے پڑتا ہے اور شہری مزدوروں کے مقابلے میں یہ طبقہ بہت مصائب کا شکار ہوتا ہے۔ اور محض اس لئے کہ بھوک سے مر نہ جائے۔ یہ مروجہ نظام کی مکمل تباہی سے کم کا مطالبہ نہیں کرتا۔ مکمل فتح کے لئے لازم ہے کہ یہ قومی انقلاب اشتمالی ہو۔ اگر اس کی روش بدل جائے، اگر مقامی بورژوازی اقتدار حاصل کر لے، تو نئی ریاست اپنی آئینی خودمختاری کے باوجود سامراجیوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ کٹنگا کی مثال اس بات کی پوری وضاحت کرتی ہے۔ پس تیسری دنیا کا اتحاد بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔ یہ ابھی اپنی ارتقائی منازل میں ہے، اس کی ابتدا ہر نوآزاد ملک میں پہلے کی طرح کسان طبقے کی سربراہی میں تمام استعمار زدہ عوام کے اتحاد سے ہوگی فینن افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے بھائیوں کے سامنے اسی بات کی وضاحت کرتا ہے۔ ہمیں ہر جگہ انقلابی اشتمالیت قائم کرنی چاہئے ورنہ ہم ایک ایک کر کے اپنے سابق مالکوں سے شکست کھا جائیں گے۔ وہ اپنی کسی بات کو چھپاتا نہیں، نہ کمزوری کو، نہ افتراق و انتشار کو، نہ ہی ضعیف الاعتقادی کو۔ کہیں تحریک کی ابتدا ہی غلط ہوتی ہے کہیں حیرت ناک ابتدائی کامیابیوں کے بعد اس کا تحرک ختم ہو جاتا ہے۔ کسی اور جگہ تحریک بالکل رک گئی ہے۔ اور اگر اسے دوبارہ شروع ہونا ہے تو کسانوں کو بورژوا طبقے کو اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ فینن اپنے قارئین کو مختلف چھلاووں کے زبردست خطرات متنبہ کرتا ہے: رہنما اور شخصیات کی پرستش سے، مغربی تہذیب سے، اور اسی قدر افریقی تہذیب ماضی کے دھندلکوں میں مراجعت سے۔ اس لئے کہ حقیقی تہذیب محض انقلابی تہذیب ہوتی ہے۔ جو ہمہ وقت بنتی رہتی ہے۔ فینن بہ آواز بلند بول رہا ہے، ہم یورپی اسے سن سکتے ہیں۔ اور یہ بات کہ آپ کے ہاتھ میں اس کی کتاب ہے۔ اس کا بین ثبوت ہے۔ کیا وہ خوف زدہ ہے کہ کہیں استعماری قوتیں اس کے خلوص سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں؟

نہیں۔ اسے خوف ہے۔ ہمارے طریق کار اب بے وقت کی راگنی ہیں۔ یہ آزادی کے حصول میں تاخیر کر سکتے ہیں اسے روک نہیں سکتے۔ اور یہ مت سمجھئے کہ ہم اپنے طور طریق بدل سکتے ہیں۔ ''مادرِ وطن'

کا فضول خواب ''نو استعماریت'' اب محض شیخی خوری رہ گیا ہے۔ ''تیسری طاقتوں'' کا وجود نہیں۔ اور اگر ان کا وجود ہے تو وہ محض ٹین ساختہ بورژوازی ہیں جنہیں استعماریت نے پہلے ہی گھوڑے پر سوار کر رکھا ہے۔ ہماری میکیاولیت کا اس بیدار دنیا میں کوئی مول نہیں ہے کہ اس نے ہمارے دروغ کو ایک ایک کر کے کچل دیا ہے۔ نو آبادکار کے پاس محض ایک چیز رہ گئی ہے۔ اور وہ ہے وحشی قوت، بشرطیکہ وہ اس کے اقتدار میں ہو۔ مقامی باشندہ کے پاس غلامی اور حاکمیت کے درمیان محض ایک انتخاب ہے۔ آپ اس کی کتاب پڑھتے ہیں یا نہیں پڑھتے، فینن کو اس کی کیا پروا؟ وہ اپنے بھائیوں کے سامنے ہمارے فریبوں کا پول کھول رہا ہے۔ اسے علم ہے کہ اب ہمارے ترکش میں کوئی تیر باقی نہیں۔ وہ ان سے یہ کہہ رہا ہے۔ ''یورپ نے ہمارے براعظموں پر اپنا پنجہ گاڑ رکھا ہے ہمیں اس کی انگلیاں اس وقت تک چھیلتے رہنا چاہئے۔ جب تک کہ وہ ہمیں چھوڑ تا نہیں۔ یہی وقت ہے، نبرٹا، ایلز بیتھ ول یا الجزائر کے شمالی علاقوں میں اب کوئی ایسی بات نہیں ہو سکتی جو ساری دنیا کے کانوں میں نہ پڑے۔ متحارب بلاک ایک دوسرے کے سامنے صف آراء ہیں اور ایک دوسرے کو روکے ہوئے ہیں۔ ہمیں اس فالج سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہمیں تاریخ کے بیچ زقند لگا دینی چاہئے اور اپنے جملے سے اسے مجبور کر دینا چاہئے کہ وہ دنیا میں پہلی بار آفاقیت کا رخ اختیار کرے۔ ہمیں جنگ شروع کر دینی چاہئے اور اگر ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں تو یہ منتظر چاقو ہی کافی ہیں۔''

یورپ والو، تم اس کتاب کو وا کرو اور میں داخل ہو جاؤ۔ چند قدم تاریکی میں چلنے کے بعد تمہیں آگ کے گرد مجتمع اجنبی لوگ نظر آئیں گے۔ ذرا قریب آؤ اور سنو۔ وہ تمہارے تجارتی مرکزوں اور ان کی حفاظت کرنے والے کرائے کے سپاہیوں کے مقدر کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جو کہ انہوں نے ان کے لئے طے کیا ہے۔ شاید وہ تمہیں دیکھیں مگر وہ اپنی آوازوں کو دھیما کئے بغیر آپس میں گفتگو کئے جائیں گے۔ ان کی یہ لاتعلقی دل کو لگنے والی ضرب ہے۔ ان کے والدین، تمہارے مخلوق، سائے کی طرح کے انسان، محض مردہ روحیں تھے۔ تم نے ہی انہیں روشنی کی جھلکیاں بخشیں۔ وہ صرف تم سے ہی کلام کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ مگر ہم ان زومبیوں کو جواب دینے کی بھی زحمت نہ کرتے تھے۔ ان کے بیٹے، آج تمہاری پرواہ بھی نہیں کرتے۔ ان کی آگ انہیں گرم کئے ہوئے ہے، اور ان کے چاروں طرف روشنی پھیلا رہی ہے۔ مگر یہ آگ تم نے نہیں جلائی۔ اب ایک فاصلے پر تم خود کو چور محسوس کرو گے۔ رات کی تاریکی میں گھرے ہوئے اور سردی سے تباہ حال۔ اب تم چکر کاٹتے رہو، ان سایوں کے درمیان جہاں سے ایک نئی صبح طلوع ہو گی اور تم دیکھو گے کہ تم خود زومبی ہو۔

ایسی صورت میں شاید تم یہ کہو کہ ہمیں اس کتاب کو پھینک دینا چاہئے۔ ہم اسے پڑھیں کیوں اگر یہ

ہمارے لئے لکھی نہیں گئی؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ فینن اپنے بھائیوں کے سامنے تمہارا کچا چٹھا کھولتا ہے۔ انہیں یہ بتاتا ہے کہ کس میکا نیکت کے باعث تم خود اپنی ذات سے کٹ گئے ہو۔ اب اس سے استفادہ کرو اور حقیقت کی روشنی میں معروضی طور پر اپنا محاسبہ کرو۔ اپنے زخموں کے نشانات اور اپنی زنجیروں کے باعث ہمارے شکار ہمیں خوب پہچانتے ہیں۔ اور انہیں کے باعث ان کی شہادت کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کافی ہے کہ وہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہم نے انہیں کیا بنا دیا ہے۔ اور اسی سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم نے خود اپنے آپ کو کیا بنا لیا ہے۔ لیکن کیا اس کا کوئی فائدہ ہے؟ ہاں ہے۔ اس لئے کہ یورپ موت کے دروازے پر کھڑا ہے۔ تم یہ کہو گے کہ تم مادر وطن کے باسی ہو اور تم یورپ کی زیادتیوں کو پسند نہیں کرتے۔ یہ صحیح ہے کہ تم خود نو آباد کار نہیں ہو، مگر تم ان سے بہتر نہیں ہو۔ وہ پہلے مہم جو تم میں سے تھے، تم نے ہی انہیں سمندر پار بھیجا اور تم کو ہی انہوں نے مالا مال کیا۔ تم نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ اگر وہ زیادہ خون بہائیں گے تو تم ان سے کوئی واسطہ نہ رکھو گے۔ اور تم نے ان سے قطع تعلق بھی کر لیا۔ مگر اس کی مثال وہی ہے کہ جیسے کوئی حکومت باہر کے کسی ملک میں فساد برپا کرنے والوں، فتنہ انگیز ایجنٹوں اور جاسوسوں کی پرورش کرے اور جب وہ پکڑے جائیں تو ان سے قطع تعلق کر لے۔ تم، جو اتنے آزاد خیال اور نرم دل ہو، تم جو تصنع کی حد تک تہذیب کا احترام کرتے ہو۔ تم اب بڑی آسانی سے یہ بھول جاتے ہو کہ تمہاری بہت سی نو آبادیاں ہیں جن میں تمہارے نام پر انسانوں کا قتل عام ہوتا ہے۔ فینن اپنے ساتھیوں سے بالخصوص ان سے بہت زیادہ مغرب زدہ ہیں، مادر وطن کے باسیوں اوان کو نو آبادیاتی نمائندوں کے درمیان مضبوط بندھنوں کا ذکر کرتا ہے۔ ذرا ہمت کرو اور اس کتاب کو پڑھو۔ اول تو یہ تمہیں شرمندہ کرے گی اور شرم بقول مارکس ایک انقلابی جذبہ ہے۔ دیکھو، میں خود اپنے داخلی خوابوں سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ میں بھی تم سے یہی کہتا ہوں کہ ''اب سب کچھ گیا اگر...'' یورپی ہونے کی حیثیت سے میں دشمن کی کتاب چرا لیتا ہوں اور اس سے یورپ کی بیماری کا علاج نکالتا ہوں۔ اسے بہتر طور پر استعمال کرو۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے۔ اگر تم سورل فاشست خیالات کو ایک طرف دھر دو تو تمیں معلوم ہوگا۔ کہ اینگلس کے بعد فینن پہلا شخص ہے۔ جس نے تاریخ کی حرکت کو دن کی واضح روشنی بخشی ہے۔ تم یہ نہ سوچو کہ اس کی گرم مزاجی یا ناخوش گوار بچپن نے اس میں تشدد کے لئے غیر معمولی شوق پیدا کر دیا ہے۔ وہ تو ایک مخصوص صورت حال کی تشریح کرتا ہے۔ اور بس۔ لیکن یہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ وہ قدم با قدم ان تضادات کو ترتیب دے جنہیں آزاد خیال منافقت نے پردے ڈال کر تم سے چھپا رکھا ہے اور جو ہماری زندگی کے لئے اتنی ہی ذمہ دار ہے۔ جتنی فینن کی زندگی کے لئے۔

پچھلی صدی میں متوسط طبقہ مزدوروں کو حریص مخلوق گردانتا تھا جو اپنی حریصانہ خواہشات کے

باعث لاقانونیت اختیار کرلیتا ہے۔لیکن وہ یہ ضرور کرتا تھا کہ ان وحشیوں کو اپنی ہی نوع میں شمار کرے یا کم از کم انہیں آزاد تصور کرے کہ وہ اپنی محنت بیچنے میں آزاد تھے۔انگلستان کی طرح فرانس میں بھی انسان پسندی کا تصور آفاقی تصور تھا۔

جہاں تک جبری محنت تعلق ہے، یہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔اس میں کوئی اقرارنامہ نہیں ہوتا، علاوہ ازیں اس میں دھمکی بھی ضروری ہوتی ہے۔لہٰذا ظلم بڑھتا جاتا ہے۔ہمارے سمندر پار کے فوجی مادر وطن کے انسانی برداری کے تصور کو رد کر دیتے ہیں۔اور انسانی نسل پر متعدد اصولوں کو منطبق کرتے ہیں۔چونکہ کوئی شخص جرم کا مرتکب ہوئے بغیر اپنے جیسے انسانوں کو نہ غلام بنا سکتا ہے، نہ لوٹ سکتا ہے اور نہ قتل کر سکتا ہے۔اس لئے وہ یہ اصول وضع کرتے ہیں کہ دیسی باشندہ ہمارے جیسا انسان نہیں ہے۔ہماری فوجوں کے سپرد یہ کام ہے کہ وہ اس مجرد ایقان کو حقیقت میں بدل دے۔انہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ فتوحہ ملک کے باشندوں کو ''بندروں'' کے درجہ پر پہنچا دیا جائے۔تاکہ نوآبادکاران سے بار برداری کرانا جائز قرار دیا جا سکے نوآبادیات میں تشدد کا استعمال محض اس لئے نہیں ہوتا کہ غلاموں کو ایک فاصلے پر رکھا جائے۔بلکہ مدعا یہ ہوتا ہے کہ ان کی انسانیت ختم کردی جائے۔اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی روایات کو مٹا دیا جائے۔ان کی زبان کی جگہ اپنی زبان رائج کی جائے۔اور ان کی تہذیب دیئے بغیر برباد کر دیا جائے۔ محض جسمانی تکان ہی انہیں ساکت کر دے گی۔بھوک اور بیماری کے باوجود اگر ان میں کوئی ولولہ باقی رہ گیا تو خوف اس کام کی تکمیل کر دے گا۔کسانوں پر بندوقیں تانی جاتی ہیں۔غیر فوجی ان کی زمین چھینتے آتے ہیں اور کوڑے مار مار کر مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کے واسطے زمین کاشت کریں۔اگر کوئی کسان زور آزمائی پر آمادہ ہو تو فوجی گولی چلاتے ہیں۔اور مردہ جسم زمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے اور اگر وہ ہتھیار ڈال دے تو خود ذلیل ہوتا ہے۔اور انسان ہی نہیں رہتا۔شرم اور خوف اس کے کردار میں دراڑیں ڈال دیتے ہیں اور اس کی اندرونی ذات ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔سارا کاروبار فاتحانہ انداز میں ماہرین کے ذریعے ہوتا ہے۔''نفسیاتی ادارے'' کل ہی قائم نہیں کئے گئے نہ ہی ''ذہن شوئی'' کل وجود میں آئی۔تاہم ان تمام کاوشوں کے باوجود حصول مقصد کہیں نہیں ہوا۔نہ کانگو میں جہاں نیگروؤں کے ہاتھ کاٹے جاتے تھے، نہ انگولا میں جہاں حال میں ہی غیر آسودہ لوگوں کے ہونٹوں میں سوراخ کر کے تالے دیئے جاتے تھے۔میں یہ نہیں کہتا کہ آدمی کو جانور بنا دینا ناممکن ہے۔میں صرف یہ کہتا ہوں کہ آپ اس حد تک جا ہی

نہیں سکتے جب تک کہ انہیں کافی کمزور نہ کر دیں۔محض گھونسوں سے کام نہیں چلے گا۔آپ کو بھوک زیادہ بڑھانی ہوگی۔اور غلامی میں یہی وقت ہے۔

اس لئے کہ جب آپ اپنی ہی نوع کے کسی شخص کو پالتو جانور بنالیں تو آپ اس کی صلاحیت کار کو کم کر دیتے ہیں۔آپ اسے کتنا ہی کم دیں' کھیت کا مزدور جتنا لاتا ہے بالآخر اس سے زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ اس سبب سے نو آبادکار اس امر پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ اسے نصف شکستگی کی حالت میں چھوڑ دیں۔اس کا نتیجہ آدمی اور جانور کے درمیان دیسی باشندہ نکلتا ہے۔شکستہ، فاقہ، زدہ، بیمار، خوف زدہ، مگر محض ایک خاص حدتک۔یہ انسان خواہ وہ سیام فام ہو، زرد فام ہو، یا سفید فام، ہمیشہ یکساں کرداری خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔وہ مکار، سست اور چور ہوتا ہے اس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہوتا اور وہ محض تشدد کو ہی سمجھتا ہے۔

بے چارہ نو آبادکار! اس کے تضادات نمایاں ہوجاتے ہیں اور اس کا حال شکستہ ہوجاتا ہے۔اسے چاہئے کہ جنہیں وہ لوٹتا ہے۔انہیں قتل کر ڈالے۔جیسا جنوں کے بارے میں کہا جاتا ہے۔لیکن یہ ناممکن ہے اس لئے کہ وہ ان کا استحصال بھی کرتا ہے۔اب چونکہ وہ مکمل قتل عام نہیں کرسکتا اور غلامی کو جانوروں کی سطح تک نہیں پہنچا سکتا۔اس لئے اس کا نظم وضبط ڈھیلا پڑ جاتا ہے، مشین پیچھے کی طرف چلنا شروع کر دیتی ہے۔اور ایک سخت گیر منطق انہیں ختم استعمار پر مجبور کر دیتی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ فوری طور پر نہیں ہوتا۔اول اول تو یورپی حکومت جاری رہتی ہے۔یورپی جنگ ہار چکتا ہے۔لیکن یہ شکست نمایاں نہیں ہوتی۔اسے ابھی یہ علم نہیں ہوتا کہ دیسی باشندہ ابھی محض ''نصف دیسی'' ہوا ہے۔اس کی باتیں سنئے تو پتہ چلے گا کہ وہ دیسیوں سے برا برتاؤ اس لئے کرتا ہے کہ ان کی بدخصلتی کو جوان میں جڑ پکڑ گی ہے۔ختم کر دے یا دبا دے۔اس طرح تین نسلوں کے بعد خطرناک جبلت رونما نہ ہو سکے گی۔آخر وہ کس قسم کی جبلت مراد لیتا ہے؟ وہ جبلت جو غلاموں کو اپنے مالکوں کے قتل کی ترغیب دیتی ہے۔کیا وہ یہاں اپنے ہی ظلم کو پہچان نہیں سکتا جس کا رخ اب خود اس کی سمت میں مڑ چکا ہے؟ ان مظلوم کسانوں کی بربریت میں کیا وہ خود اپنی نو آبادکارانہ بربریت کو شناخت نہیں کرسکتا جو ان کی رگ رگ میں پیوست ہوچکی ہے، اور جواب لاعلاج ہے؟ اس کا سبب تلاش کرنا بہت آسان ہے۔یہ نادر شاہی مخلوق، اپنی مطلق طاقت کے نشہ میں سرشار اور اس کے خاتمے کے خوف سے دوچار، اب یہ واضح طور پر یاد نہیں رکھتی کہ کبھی وہ بھی انسانی جامے میں تھی۔اب وہ خود کو انسان کے بجائے ''کوڑا'' یا ''بندوق''

سمجھنے لگتا ہے۔ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر ان کے جبلی محرکات کی راہیں متعین کر دی جائیں تو ''ادنی نسل'' کے لوگوں کو پالتو جانوروں کی سطح پر لایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس عمل پر وہ انسانی یادوں اور ان پر مرتسم انمٹ نشانات کا محاسبہ نہیں کرتا۔ مزید برآں ایک چیز اور ہے جسے وہ مطلق نہیں سمجھتا۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنی اصل حیثیت سے جو دوسروں نے ہمیں دی ہے اور مطلق اور بھرپور انکار کریں۔ ہم نے کہا تھا تین نسلیں؟ مگر دوسری نسل جب اپنی آنکھ کھولتی ہے تو وہ اپنے والدین پر کوڑے برستے دیکھتی ہے۔ نفسی طب کی اصطلاح میں وہ زندگی بھر کے لئے ''جراحت خوردہ'' ہو جاتے ہیں۔ لیکن تشدد کی یہ مسلسل تکرار انہیں کلیتاً دبانے کے بجائے ایک ایسے نا قابل برداشت تضاد میں ڈھکیل دیتی ہے۔ جس کا خمیازہ یورپی نو آباد کار کا جلد یا بدیر بھگتنا پڑے گا۔ اس کے بعد جب ان کی باری آتی ہے، جب وہ یہ جان لیتے ہیں کہ ذلت، بھوک اور مصائب کیا ہوتے ہیں۔ ان کا جوش وخروش کوہ فشاں کا زور وشور اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس میں اتنی ہی قوت ہوتی ہے جتنی استبداد نے ان پر صرف کی تھی۔ تم کہتے ہو کہ وہ تشدد کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتے؟ بالکل صحیح، اول اول تو تشدد محض نو آباد کار کرتا ہے اور پھر وہ جلد ہی اسے اپنا لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ہی تشدد ہمیں واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جس طرح آئینہ کے سامنے ہمارا ہی عکس ہم سمیلنے کو آگے بڑھتا ہے۔

اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ یہ جنونی غصہ، یہ تلخی اور بدمزاجی، ہمیں قتل کر دینے کی ہمہ وقت خواہش، پٹھوں کا یہ مستقل تناؤ جو ڈھیلا پڑنے سے گھبراتا ہے۔ یہ سب انہیں انسان بنا دیتا ہے۔ انسان.... محض نو آبادکاروں کے سب، کہ وہ انہیں بار برداری کا جانور بنانا چاہتے ہیں... نو آبادکاروں کے سبب اور نو آبادکاروں کے خلاف، نفرت، اندھی نفرت جو اب تک مجرد صورت میں ہے، محض یہی ان کی دولت ہے۔ مالک اسے للکارتا ہے کہ وہ انہیں جانور بنا دینا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اسے مطلق ختم کرتا ہے کہ اس کا اپنا مفاد اسے درمیان مین ہی روک دیتا ہے۔ پس یہ ''نصف دیسی'' اب بھی انسانی حیثیت برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ جابروں کی قوت اور کمزوری ہے۔ جو دیسیوں میں پہنچ کر جانوروں کی سطح پر اترنے سے صاف انکار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اب اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ ہم سب سمجھ سکتے ہیں۔ وہ فطرتاً قابل ہوتے ہیں۔ یقیناً... یہ بھی شر انگیزی کی ایک صورت ہے۔ وہ مکار اور چور ہوتے ہیں۔ ذرا اندازہ کیجئے! لیکن ان کی چھوٹی موٹی چوریاں ایک ایسی مزاحمت کا آغاز ہیں جو ابھی غیر منظّم ہے۔ یہ تو خیر

کچھ نہیں۔ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے زعم میں خالی ہاتھ بندوقوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان کے ہیرو ہیں۔ دوسرے خود انسانی سطح پر لانے کے لئے یورپیوں کو قتل کرتے ہیں۔انہیں گولی ماردی جاتی ہے۔اب یہ ڈاکو ہوں یا شہید، ان کی اذیت خوفزدہ عوام کو رفعتوں سے ہم کنار کرتی ہے۔

ہاں خوف زدہ، اس لئے کہ اس نئی سطح پر نوآبادیاتی تشدد دیسی باشندوں کے دلوں میں خوف وہیبت کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے۔اس سے میری مراد محض وہ خوف نہیں ہے جو وہ ہمارے تشدد کے بے پناہ ذرائع سے محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ وہ خوف بھی جو ان کا بے پناہ غصہ ان میں پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی جانب تنی ہوئی بندوقوں اور اس ہیبت ناک داخلی مجبوری اور خواہش قتل کے درمیان جو ان کی روح گہرائیوں میں سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی شناخت وہ ہمیشہ نہیں کر سکتے، گھر جاتے ہیں۔ اس لئے اول اول یہ ان کا تشدد نہیں ہوتا، ہمارا ہوتا ہے۔ جو ان میں سما کر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ان مظلوم انسانوں کا پہلا عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے چھپے ہوئے غصے کو اندر دبا دیں۔ جسے ان کی اور ہماری اخلاقیات مذموم گردانتی ہے، مگر جو ان کی انسانیت کی آخری پناہ گاہ ہے۔فینن کو پڑھو، تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح اپنی بے چارگی کے دور میں دیسی باشندوں کے اجتماعی لاشعور کا اظہار ان کی مجنونانہ محرکات میں ہوتا ہے۔

اگر یہ دبا ہوا غصہ کوئی راہ نہ پائے تو اندر ہی اندر گھل گھل کر یہ مظلوم انسان کو ہی تباہ کر دے گا۔خود کو اس خبر سے نجات دلانے کے لئے وہ آپس میں ایک دوسرے کو بھی قتل کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اصل دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے مختلف قبائل آپس میں لڑتے ہیں۔اور آپ نوآبادیاتی حکمت عملی پر بھروسہ کر سکتے ہیں کہ وہ ان کی آپس کی دشمنیوں کو برقرار رکھتی ہے۔ وہ شخص جو اپنے بھائی کے خلاف اپنا چاقو اٹھاتا ہے، یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے مشترکہ ذلت کی شبیہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برباد کر دیا ہے، گو کفارے کے طور پر استعمال ہونے والے یہ مقتول اپنی خون کی پیاس نہیں بجھاتے۔توپوں کے خلاف قدم بڑھانے کو وہ محض ایک ہی طریقے سے روک سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہمارا ہی کام سرانجام دیں۔اس طرح وہ خود ہی انسان کشی کا کام تیز تر کر دیں گے۔ جسے وہ پہلے رد کر دیتے ہیں۔نوآبادکار کی پر مسرت نگاہوں کے سامنے وہ اپنے ہی لوگوں سے بچنے کے لئے مافوق الفطرت عناصر کو باڑھ کو طور پر استعمال کرتے ہیں کبھی قدیم اور ہیبت ناک دیومالائی رسومات کو زندہ کرتے ہیں اور کبھی ضعیف الاعتقادی کے بندھنوں میں خود کو جکڑ لیتے ہیں۔اس طرح سے وہم سے مغلوب انسان اپنی داخلی ضروریات سے فرار حاصل کرتا ہے۔ وہ بعض ایسی

رسومات سے خود کو باندھ لیتا ہے جو ہمہ وقت اس کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھتی ہیں۔ وہ رقص کرتے ہیں۔ اور رقص انہیں مشغول رکھتا ہے۔ یہ ان پٹھوں کے تکلیف وہ تناؤ کو ڈھیلا کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ رقص مخفی طور پر، اور بسا اوقات ان کے سمجھے بغیر انکار کا سوانگ ہوتا ہے۔ جس کا اظہار وہ نہیں کر سکتے۔ اور اس قتل کا جسے وہ سر انجام نہیں دے سکتے۔ بعض علاقوں میں آخری حربہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی حلول ارواح.... پہلے وقتوں میں یہ ایک سیدھا سادا مذہبی تجربہ تھا۔ جس کا مطلب تھا عقیدت مندوں کا پاک و برتر چیزوں سے راز و نیاز، مگر اب وہ اسے ذلت و نامرادی کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ ممبو جمبو اور قبیلے کے دیگر اوتار ان پر آجاتے ہیں اور ان پر مسلط ہو کر ان کے تشدد کو وجد کی کیفیت کے ذریعے برباد کرتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا مکمل اخراج ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ اوتار ان کا تحفظ بھی کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر نو آبادیاتی عوام استعماری کشیدگی سے خود کو اس طرح بچاتے ہیں کہ مذہبی کشیدگی میں بہتر پناہ ڈھونڈتے ہیں جس کا عجیب و غریب نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر دونوں کشیدگیوں کو باہم ضم کر دیتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے طاقت ثابت ہوتی ہے۔ پس بعض وہم زدگی کی صورت میں یہ بنتی ہے کہ وہم زدہ شخص جو اپنے بھوت کے ہمہ وقت کے طعنوں سے تنگ آچکا ہے۔ ایک نیک دن فرشتے کی آواز سننی شروع کر دیتا ہے۔ جو اسے مبارکباد دیتا ہے۔ لیکن طعنے اس کے باوجود بند نہیں ہوتے۔ اب صرف یہ ہوتا ہے کہ طعنوں کے بعد مبارک باد بھی ملتی ہے۔ یہ ایک حفاظتی ترکیب ہے۔ مگر قصہ بھی یہیں تمام ہو جاتا ہے۔ ذات دو ٹکرے ہو جاتی ہے۔ اور مریض جنون کا شکار ہونے لگتا ہے۔ مگر بعض دوسرے منتخب بدقسمتوں کے لئے ایک اور آسیب بھی ہوتا ہے جس کے بارے میں ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔ اور وہ ہے مغربی تہذیب۔ آپ کہیں گے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو دوسروں کی عبادت گاہوں کے بجائے اپنے ہی ممبو جمبو کو ترجیح دیتا۔ بالکل ٹھیک، آپ نے صورت حال سمجھ لی ہے، لیکن پوری نہیں۔ اس لئے کہ آپ ان میں سے نہیں ہیں... یا کم از کم ابھی تک نہیں ہیں۔ ورنہ آپ کو یہ علم ہو جاتا کہ وہ انتخاب نہیں کر سکتے، انہیں دونوں کو رکھنا پڑتا ہے۔ دو دنیائیں۔ جس کا مطلب دو آسیب زدگیاں، وہ رات بھر رقص کرتے ہیں اور صبح سویرے اجتماعی سننے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ روز بروز دراڑ بڑھتی جاتی ہے۔ ہمارا دشمن اپنے بھائیوں کا ساتھ چھوڑ کر ہم سے مل جاتا ہے۔ اس کے بھائی بھی یہی کرتے ہیں۔ ''دیسی باشندے'' کی صورت حال ایسی اعصابی صورت حال ہوتی ہے جو نو آباد کار خود نو آبادیاتی عوام کی اجازت سے وہاں

پھیلاتا ہے۔ اور اسے برقرار رکھتا ہے۔

انسانی حالات کا بیک وقت دعویٰ اور ان سے انکار۔ یہ دھماکے سے پھٹ جانے والا تضاد ہے اور اسی سبب سے دھماکہ ہوتا ہے۔ یہ بات آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ اور ہمارا زمانہ وہ ہے۔ جب فلیتے کو آگ لگائی جارہی ہے، جب بڑھتی ہوئی آبادی اپنے ساتھ زیادہ بڑا قحط لاتی ہے، اور جب یہ نومولود موت سے زیادہ زندگی سے خائف نظر آتے ہیں، تو تشدد کا سیلاب تمام رکاوٹوں کو بہالے جاتا ہے۔ الجیریا اور انگولا میں اگر یورپی دکھائی دے تو قتل کردیا جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب ہمارے ہتھیار ہماری سمت واپس لوٹ رہے ہیں۔ یہ تشدد کا تیسرا دور ہے۔ اب اس کا رخ ہمارے طرف ہے۔ اس کی ضرب ہم پر پڑ رہی ہے۔ مگر ہم پہلے ہی کی طرح اب بھی اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ہم نے ہی اس کا آغاز کیا تھا۔ ''آزاد خیال'' اب بھونچکا ہیں۔ اب وہ خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے دیسیوں کے ساتھ کافی خوش خلقی کا مظاہرہ نہیں کیا، اور یہ کہ یہ بہتر اور عقل کی بات ہوتی کہ ہم انہیں حتی المقدور کچھ نہ کچھ حقوق دے ہی دیتے۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتے کہ ہم دیسیوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے بلا سفارش اس مخصوص کلب کا ممبر بنالیں جو ہماری نوع کا کلب ہے۔ اور اب یہ وحشت خیز مجنونانہ ہیجان ان سے بھی ویسا ہی برتاؤ کر رہا ہے۔ جیسا برے نو آبادکاروں کے ساتھ۔ وطن کے بائیں بازو والے بھی پریشان ہیں۔ وہ دیسی باشندوں کی صحیح صورت حال سے واقف ہیں۔ اور اس انتہائی ظلم کو سمجھتے ہیں۔ جس کا انہیں شکار کیا جاتا ہے۔ وہ ان کی بغاوت کو برا نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسے پیدا کرنے میں سب کچھ ہمارا ہی کیا دھرا ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ سوچتے ہیں کہ آخر ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ یہ گوریلے یہ جتانے پر تلے ہوئے ہیں کہ وہ شجاع ہیں، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ انسان ہیں یہی طریقہ سب سے بہتر ہے۔ بعض اوقات بائیں بازو والے انہیں ڈانٹتے بھی ہیں۔ ''تم لوگ حد سے بڑھتے جارہے ہو۔ اب ہم مزید تمہاری حمایت نہیں کرسکتے'' دیسی باشندے ان کی حمایت کی پروا نہیں کرتے۔ اس سے جو انہیں فائدہ ہوتا ہے اسے وہ ہمہ وقت ٹھکرانے کو تیار رہتے ہیں۔ ایک بار جنگ شروع ہوگئی تو انہیں اس ٹھوس حقیقت کا پتہ چل گیا کہ ہم میں سے ہر ایک نے اپنا کردار ادا کیا ہے اور ان سے کچھ نہ کچھ ضرور چھینا ہے۔ اب انہیں کسی کو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وہ کسی کے ساتھ بہتر برتاؤ نہیں کریں گے۔

اب انہیں محض ایک فرض ادا کرنا ہے اور ایک مقصد حاصل کرنا ہے۔ یعنی ہر ممکن طریقے سے استعمار

کو باہر نکالنا۔ہم سے زیادہ اندیش لوگ بالاخر اس فرض اور مقصد کو تسلیم کرلیں گے۔لیکن اس آزمائش میں ہمیں مجبوراً وہ غیر انسانی طریق کار بھی دیکھنے پڑتے ہیں جو یہ انسان سے کم تر مخلوق انسانیت کا منشور حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ پس انہیں فوراً یہ منشور دینا چاہئے تا کہ وہ پرامن طریقے کار سے خود کو اس کا مستحق بنانے کی کوشش کرسکیں۔ دیکھا آپ نے ہمارے اعلیٰ ترین لوگ بھی نسلی تعصّبات سے عاری نہیں ہیں۔

بہتر ہے کہ وہ فینن کو پڑھیں۔ وہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہ نہ دبنے والا تشدد محض غیض و غضب نہیں ہے، نہ وحشی جبلتوں کا اظہار ہے، نہ ہی یہ احتجاج ہے۔ یہ وہ عمل ہے۔جس کے ذریعے انسان خود کو تخلیق کررہا ہے۔میرا خیال ہے کہ ہم کبھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے۔مگر اب اسے بھول چکے ہیں کہ تشدد کے زخموں کے علاج اخلاق کے اظہار سے ممکن نہیں۔انہیں تو محض تشدد ہی مندمل کرسکتا ہے۔ دیسی باشندہ اپنے ہتھیاروں کی طاقت سے نوآبادکار کو باہر نکال کر استعمار کے پیدا کردہ اعصابی امراض کا علاج کرتا ہے۔ جب اس کا غصہ بدل جاتا ہے تو وہ اپنی کھوئی معصومیت واپس پالیتا ہے۔اپنی ذات کا ادراک کرلیتا ہے اور اس طرح کو تخلیق کرتا ہے۔ہم جو اس جنگ سے بہت دور ہیں اسے بربریت کی فتح سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ جنگ خود بخود بتدریج مگر یقینی طور پر، باغیوں کی آزادی کی ضامن بنتی ہے۔اس لئے کہ آہستہ آہستہ ان میں اور ان کے چاروں طرف استعماری اندھیرے چھٹتے جاتے ہیں۔ایک بار شروع ہوجائے تو اس جنگ سے امان نہیں۔آپ خود خوفزدہ ہوں یا دوسروں کو خوفزدہ کریں۔یعنی یا تو آپ خود کو مصنوعی زندگی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں جو آپ کو ٹکڑے ٹکڑے کردے گی یا پھر آپ منضبط زندگی کا پیدائشی حق حاصل کریں۔ جب کسان اپنے ہاتھ میں بندوق لے لیتا ہے تو پرانی دیومالاؤں اور رسوم کا اثر ونفوذ ختم ہو جاتا ہے اور ایک ایک کر کے تمام ممنوعات بھلادی جاتی ہیں۔ باغی کا ہتھیار اس کی زندگی کی ضمانت ہوتا ہے۔اس لئے کہ جنگ شروع ہو تو قتل کرنا پڑتا ہے۔کسی یورپی کو قتل کرنے کا مطلب ایک پنتھ دو کاج ہوتا ہے،یعنی ظالم اور مظلوم انسان باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ زندہ شخص پہلی بار اپنے قدموں کے تلے قومی سرزمین کو محسوس کرتا ہے۔ اس لمحے قوم اس سے دامن کشاں نہیں ہوتی۔ وہ جہاں کہیں جاتا ہے۔قوم اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔اس کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ اس کی آزادی سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔لیکن پہلے ہی اچنبھے کے بعد استعماری فوج کاروائی شروع کردیتی ہے

اور تب یا تو سب کے سب متحد ہو جائیں یا پھر قتل ہو جائیں۔ قبیلہ داری مخاصمتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور بالآخر ختم ہونے لگتی ہیں۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ ان مخاصمتوں سے انقلاب کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ گہری وجہ یہ ہے کہ پہلے بھی انہوں نے بجز اس کے اور کوئی کام نہیں کیا کہ تشدد کا رخ غلط دشمنوں کی سمت موڑا اور اگر یہ مخاصمتیں باقی رہ جاتی ہیں، جیسا کہ کانگو میں، تو اس کا سبب یہ ہے کہ انہیں استعماریت کے ایجنٹ برقرار رکھتے ہیں۔ قوم آگے کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ اپنے ہر فرزند کے لئے وہ وہاں موجود ہوتی ہے جہاں اس کے تمام بھائی مصروف پیکار ہوں۔ وہ احساس جو آپس میں رکھتے ہیں اس نفرت کے بالکل برعکس ہوتا ہے جو وہ آپ کے لئے محسوس کرتے ہیں۔ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک قتل کرتا ہے اور کسی وقت بھی قتل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ فینن اپنے قارئین کو ''بے ساختگی'' کے حدود اور ''تنظیم'' کی ضرورت اور اس کے خطرات سے آگاہ کرتا ہے۔ تاہم ہر موڑ پر وہ خواہ کتنا ہی کام کیوں نہ کرتا ہو، انقلابی شعور گہرا ہوتا جاتا ہے بچی کھچی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اب الجزائری قومی محاذ آزادی کے سپاہی کی ''ماتحتی الجھن'' کے بارے میں گفتگو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

آنکھوں کا پردہ ہٹ جانے کے بعد کسان اپنی ضروریات کا اندازہ لگاتا ہے۔ پہلے تو وہ اتنی زیادہ تھیں کہ اس کی موت لے آتیں۔ لیکن وہ انہیں نظر انداز کئے ہوئے تھا۔ اب وہ انہیں اپنے لئے لازمی خیال کرتا ہے۔ یہ تشدد جو عوام سے پھوٹتا ہے اور جو انہیں مسلسل پانچ برس کھڑا رکھتا ہے۔ آٹھ برس جیسا کہ الجزائریوں نے کیا ہے۔ اس تشدد میں فوجی، سیاسی اور سماجی ضروریات کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جنگی کمان اور عہدوں کے سوال اٹھا کر ایسے نئے ڈھانچے کھڑے کئے جاتے ہیں جو بعد ازاں امن کے اولین ادارے قرار پائیں گے۔ اب نئی روایات کا انسان خوفناک حال سے پیدا شدہ مستقبل کا انسان ہوگا۔ اب ہم اسے ایک ایسے قانون کے ذریعے جائز حقوق کا حامل دیکھتے ہیں۔ جو روز بروز جنگ سے بنتا ہے اور بنے گا۔ ایک بار جب آخری نوآبادکار قتل ہو جائے گا، وطن لوٹ جائے گا، یا ان میں ضم ہو جائے گا تو اقلیتی نسل ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ اشتمالیت کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن یہی کافی نہیں ہے اور باغی اس پر اکتفا نہیں کرتا۔ آپ یقین کریں کہ وہ اپنی جان کی بازی اس لئے نہیں لگاتا کہ سابق ''مادر وطن'' کے باشندے کی حیثیت حاصل کرلے۔ آپ دیکھئے وہ کتنا پرسکون ہے! شاید وہ ایک دوسرے ڈئین بین پھواں (1) کا خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ وہ اس پر انحصار کر رہا ہے۔ وہ تو ایک فقیر ہے جو

اپنی غربت کے ساتھ بھرپور طور پر مسلح امرا کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ فیصلہ کن فتوحات کی توقع میں، یا اس توقع کے بغیر ہی وہ اپنے مخالفوں کو اتنا تھکا تا ہے کہ وہ اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ خوفناک نقصانات کے بغیر نہیں ہوگا۔ استعماری فوج بے حد خونخوار ہو جاتی ہے۔ علاقوں کو مختص کر لیا جاتا ہے۔ باغیوں کے قلع قمع کی تدابیر عمل میں لائی جاتی ہیں۔ آبادیوں کے تبادلے ہوتے ہیں۔ انتقامی کارروائیاں ہوتی ہیں۔ عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ باغی اسے جانتا ہے۔ یہ نیا انسان اب اپنی زندگی یوں شروع کر دیتا ہے جیسے اس کی زندگی خاتمے پر ہو وہ خود کو ایک امکانی لاش تصور کرتا ہے۔ وہ محض اس خطرے کو ہی تسلیم نہیں کرتا کہ اسے بالآخر اسے قتل ہونا ہے۔ بلکہ اس کو اس امر کا یقین ہوتا ہے۔ اس امکانی مردہ انسان کے بیوی بچے ختم ہو چکے ہیں۔ اس نے اتنے انسانوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے کہ اب وہ فتح کو اپنی زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اب وہ نہیں، بلکہ دوسرے فتح کا پھل چکھیں گے۔ وہ اب ان سب باتوں سے بیزار ہو چکا ہے۔ لیکن دل کی بیزاری ناقابل یقین شجاعت کا سرچشمہ ہے۔ ہمیں ہماری انسانیت ناامیدی اور موت کے اس طرف ملتی ہے، اس یہی انسانیت تشدد اور موت کے ماورا ملتی ہے۔ ہم نے ہوائیں لوٹیں، وہ ان کا بگولا۔ وہ جس تشدد کی تخلیق سے اسی سے ہر لحہ اپنی انسانیت اخذ کرتا ہے ہم اس کے بل پر انسان بنے رہے، اب وہ ہمارے بل پر انسان بن رہا ہے، مگر ایک مختلف انسان، بہتر صلاحتیوں کا انسان۔

فینن اس مقام پر رک جاتا ہے۔ اس نے راہ دکھا دی ہے۔ وہ ان لوگوں کا نمائندہ ہے جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ اتحاد کا داعی ہے۔ یعنی تمام تر اختلافات اور علاقائی عصبتیوں کے برعکس پورے افریقی براعظم کے اتحاد کا۔ اس نے اپنا مقصد حل کر لیا ہے۔ اگر ختم استعمار کے تاریخی مظہر کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا تو ہو ہمارا ذکر بھی کرتا۔ مگر اس کی خواہش یہ نہیں ہے۔ لیکن جب ہم کتاب بند کرتے ہیں تو مصنف سے قطع نظر اس کا استعدلال ہمارے ذہن میں جاری رہتا ہے۔ اس لئے کہ ہم باغی عوام کی طاقت کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی طاقت سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ اور اب ہم خود بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یوں تشدد خود اپنی فطرت کے اعتبار سے ہمیں تبدیل کرتا ہے، جس طرح اس نے ''نیم دیسیوں'' کو تبدیل کر دیا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے طور پر سوچنا چاہئے.... بشرطیکہ ہم ذرا بھی غور وفکر کرتے ہوں۔ آج اس یورپ میں، جو فرانس، بلجیم اور انگلستان پر لگی ہوئی ضربات کے باعث سکتے کی

حالت میں ہے، اپنے ذہن کو ذرا بھی ادھر ادھر لگانا ایسا ہی ہے جیسے استعماریت کے جرم میں خود کو شامل کرنا۔ اس کتاب کو کسی دیباچے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اور بھی کہ اس کا تخاطب ہم سے نہیں ہے۔ تاہم میں یہ دیباچہ اس لئے لکھ دیا ہے کہ اس کے استدلال کو کسی سیر حاصل نتیجے تک پہنچاؤں۔ اس لئے کہ ہم یورپ والے بھی ختم استعمار سے دو چار ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم میں سے ہر ایک کے اندر چھپا ہوا نوآبادکار جڑ سے اکھڑ رہا ہے۔ اگر حوصلہ ہو تو ہم خود کو دیکھیں کہ ہمارا کیا حال ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی انسانی پسندی کے انکشاف کا بالکل عریاں حالت میں جائزہ لینا ہے جس کا ہم ہمہ وقت پرچار کرتے رہتے ہیں۔ آپ اسے بالکل ننگا دیکھ سکتے ہیں اور یہ کوئی دل کش منظر نہیں ہے۔ یہ نظریہ جھوٹ کا نظریہ ہے۔ لوٹ مار کا مکمل جواز۔ اس کے شیریں الفاظ، اس کی معقولیت کا تصنع، ہمارے ظلم وتشدد کے لئے قانونی عذر بنا رہا ہے۔ یہ بھی ایک پر لطف بات ہے کہ عدم تشدد میں یقین رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو ظالم ہیں اور نہ مظلوم۔ اچھا ٹھیک ہے، اگر آپ مظلوم نہیں تو جب وہ حکومت جو آپ کے ووٹ سے قائم ہوئی اور جب وہ فوج، جس میں آپ کے چھوٹے بھائی کسی جھجک یا ندامت کر رہے ہیں نسل کشی پر تل گئی ہو تو آپ بلا شک وشبہ ظالم ٹھہرتے ہیں۔ اور اگر آپ مظلوم بننا پسند کرتے ہیں اور ایک دو دنوں کے لئے جیل جانے کا خطرہ مول لیتے ہیں تو آپ محض یہ طے کرتے ہیں کہ اپنا لوہا آگ سے نکال لیں۔ لیکن آپ اسے نکال نہیں سکیں گے اسے آخر تک وہیں رہنا ہے۔ ذرا اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اگر آج ہی تشدد شروع ہو جائے اور اگر سرزمین پر ظلم واستحصال کبھی نہ رہا ہو تو شاید عدم تشدد کا نعرہ جھگڑے کو ختم کر دے۔ لیکن اگر ساری حکومت اور آپ کے عدم تشدد کے تصورات دونوں ہی ایک ہزار برس کے ظلم سے متعین ہوتے ہوں تو آپ کا یہ انفعالی رجحان آپ کو ظالموں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔

آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم استحصال کنندہ ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم نے ''نئے براعظموں'' میں پہلے سونے اور دھاتوں پر ہاتھ صاف کیا اور پھر ان کے پیڑول پر۔ اور یہ سب چیزیں ہم پرانے ممالک میں لے آئے۔ ان کے نتائج بھی شاندار نکلے۔ جیسا کہ ہمارے محلات، ہمارے گرجا گھروں اور ہمارے عظیم صنعتی شہروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور پھر جب یک بیک قیمتوں کے گرنے کا خطرہ لاحق ہوا تو نوآبادیاتی منڈیوں کے باعث یہ ضرب نرم پڑ گئی یا پھر اس کا رخ پھر گیا۔ دولت سے مالا مال ہو کر یورپ نے اپنے باشندوں کو قانونی طور پر انسانی حق دے دیا۔ لیکن ہمارے انسان ہونے کا مطلب یہ

ہے کہ ہم استعمار کے جرم میں شریک ہیں۔ اس لئے کہ ہم میں سے ہر ایک نے بلا استثنٰی استعماری استحصال سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ موٹا زرد براعظم اب بقول فینن نرگسیت میں مبتلا ہو کر فنا ہونے والا ہے۔ کاکتو پیرس سے بیزار تھا۔ ''یہ شہر ہمہ وقت اپنے متعلق ہی گفتگو کرتا ہے۔'' کیا یورپ اس سے کچھ مختلف ہے؟ اور اے یورپ سے بھی بڑھ کر وحشی شمالی امریکہ، بول! آزادی، مساوات، انسانی برادری، محبت، وقار، حب الوطنی، تیرے پاس اور کیا ہے؟ ان تمام چیزوں کے باوجود ہم گندے نیگروؤں، گندے یہودیوں اور گندے عربوں کی نسلوں کے خلاف تقریریں کرنے سے باز نہ آئے۔ اعلٰی ذہن کے لوگ، آزاد خیال یا محض نرم دل لوگ، یہ احتجاج کرتے ہیں کہ وہ اس غیر معقولیت کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن یا تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں یا پھر بے ایمان ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے لئے نسلی انسان پسندی سے زیادہ معقول بات اور کوئی نہیں ہے کہ یورپی محض غلامی اور وحشت کی تخلیق سے ہی انسان بنا ہے۔ جب تک کہیں اور دیسی باشندوں کی آبادی قائم رہی اس دغا بازی کا راز فاش ہ ہوا۔ نسل انسانی کے تصور میں آفاقیت کا ایک مجرد مفروضہ ہمارے ہاتھ لگا جو ہمارے حقیقی اعمال پر پردا ڈالتا ہے۔ براعظم کے دوسرے طرف ایک ایسی نسل بستی تھی جس کا درجہ انسانوں سے کچھ کم تھا، اور جو ہماری مدد کے بغیر شاید ایک ہزار برس بعد ہماری حیثیت حاصل کرتے۔ مختصراً یہ کہ ہم نے غلطی سے ان کے دانشوروں کو ان کی پوری نوع کے مترادف سمجھا۔ مگر آج دیسی آبادی اپنی اصل نوعیت کا اظہار کر رہی ہے اور اسی گھڑی ہمارا مخصوص ''کلب'' اپنی کمزوری ظاہر کر رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ اب وہ کم وبیش ایک اقلیت رہ گیا ہے اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ جب دوسرے ہمارے خلاف ہو کر انسانیت کا جامہ پہن رہے ہیں تو ایسا لگتا ہے۔ کہ ہم انسان دشمن ہیں۔ اب دیسی دانشور اپنے اصل رنگ میں ظاہر ہو رہے ہیں کہ اب یہ ایک دھڑے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں۔ ہماری قیمتی اقدار بکھرنے لگی ہیں۔ غور سے دیکھئے تو آپ کو ایک قدر بھی ایسی نظر نہ آئے گی۔ جو خون آلود نہ ہو۔ اور اگر آپ کو کسی مثال کی ضرورت ہو تو ان خوبصورت الفاظ کو یاد رکھیے۔ ''فرانس کتنا فیاض ہے۔'' ہم اور فیاضی؟ اچھا تو پھر سیف کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اور اس آٹھ برس کی خوفناک جنگ کے بارے میں کیا خیال ہے، جس میں دس لاکھ سے زیادہ الجزائری جانیں ضائع ہوئیں اور پھر اذیت دہانی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ کوئی ہمیں اس بات پر مطعون نہیں کرتا کہ ہم نے اپنے ان مقاصد کو

پورا نہیں کیا...اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا اور اصل کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ یہاں تو خود فیاضی ہی مشکوک نظر آتی ہے۔اس عمدہ مترنم لفظ کے محض ایک معنی ہیں اور وہ یہ ہے قانونی چارٹر کا عطیہ۔مگر سمندر پار کے لوگوں، نئے اور آزاد لوگوں کے نزدیک کسی کو نہ قدرت ہے اور نہ حق ہے کہ وہ دوسرے کو کچھ دے۔ان میں سے ہر ایک کو ہر قسم کے اور ہر شے پر حقوق حاصل ہے۔اور جب بالآخر ایک دن یہ انسان بلوغت کو پہنچیں گے تو وہ انسانیت کی یہ تعریف نہیں کریں گے کہ وہ ساری دنیا کے باشندوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ یہ کہ وہ آپس کی ضرورت کا لامحدود اتحاد ہے۔ یہاں میں رک جاتا ہوں۔اب آپ کو کسی نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی وقت نہیں ہوگی۔آپ بس یہ کریں کہ ہماری اشرافی خوبیوں سے بس ایک بار براہ راست نظر ملائیں۔ دیکھئے وہ چیخ رہی ہیں۔وہ ان نچلے درجے کے لوگوں کی اشرافیت کے سامنے کیسے بچیں گی۔جنہوں نے دراصل آپ کی اشرافیت کو وجود بخشا تھا۔ چند برس پہلے ایک بورژوا استعمار پسند مبصر مغرب کی مدافعت میں محض یہ کچھ کہہ سکا تھا۔''ہم فرشتے نہیں ہیں۔لیکن ہم کم از کم کچھ ندامت ضرور محسوس کرتے ہیں۔'' کیا خوب اقرار ہے، پہلے ہم براعظم کے سفینے کو دوسرے ذرائع سے سطح آب پر برقرار رکھتے تھے۔ یونانی تہذیب، چارٹر، حقوق انسانی یا سواستکہ۔اب ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ ان کی قیمت کیا ہے، اب اپنے سفینے کو غرقابی سے بچانے کا واحد طریقہ عیسائیت کا احساس جرم ہے۔آپ اس کا انجام کے تصور کر سکتے ہیں۔یورپ کے جہاز میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے ہیں۔آخر اب کیا ہو گیا ہے؟ محض یہ ہوا ہے کہ ماضی میں ہم تاریخ بناتے تھے۔اب ہم پر تاریخ بن رہی ہے۔قوتوں کا تناسب الٹ گیا ہے۔ استعمار کے خاتمے کا دور شروع ہو چکا تھا۔اب ہمارے کرائے کے سپاہی محض یہ کر سکتے ہیں کہ اس کے خاتمے میں تاخیر کریں۔

ابھی سابق ''مادران وطن'' نے آخر تک جدوجہد کرنی ہے۔ابھی انہیں اپنی پوری قوت ایک ایسی جنگ میں صرف کرنی ہے جو شروع ہونے سے پہلے ہی ہاری جا چکی ہے۔اور مہم کے اختتام پر ہمیں انہیں استعمارانہ مظالم کا مظاہرہ نظر آئے گا جو اس کے شروع میں بوگو کا شاندار کارنامہ سمجھا جاتا تھا (2) لیکن اب یہ مظالم دس گناہ زیادہ بڑھ گئے ہیں پھر بھی کافی نہیں ہیں۔قومی فوج کے دستے الجزائر بھیجے جاتے ہیں اور وہاں سات سال تک بلا نتیجہ پڑے رہتے ہیں۔تشدد نے اب اپنی سمت بدل لی ہے۔ جب ہم فتح مند تھے تو ہم نے اسے استعمال کیا۔مگر اس نے ہم میں کوئی تبدیلی نہ کی۔اس نے دوسروں کو شکستہ کیا لیکن ہمارے لئے ہماری انسان پسندی مکمل طور پر بحال رہی۔''مادر وطن'' کے لوگوں نے اپنے منافعوں کے

لئے متحد ہوکر اپنے جرائم کی دولت مشترکہ کا پتسمہ کر کے اسے برادری اور محبت کا نام دیا جائے۔ آج تشدد، ہر جگہ رکاوٹیں پانے کے بعد، ہمارے سپاہیوں کے ذریعے ہمارے طرف واپس آ رہا ہے اور ہمارے اندر آ کر ہم پر قابض ہو رہا ہے۔ چکر شروع ہو رہا ہے۔ دیسی باشندہ اپنی تخلیق کر رہا ہے اور ہم نو آباکار اور یورپی، انتہا اور آزاد خیال، ہم سب ٹوٹ رہے ہیں۔ غیض وغضب اور خوف ہر سو پھیلا ہوا ہے۔ الجزائر میں کالوں کا شکار اس کی نمایاں صورت ہے۔ اب وحشی لوگ کس طرف ہیں؟ بربریت کہاں ہے؟ کوئی چیز کم نہیں ہوئی۔ ڈھول بھی اپنی جگہ موجود ہے۔ موٹر کے ہارن ''فرانسیسی الجزائر'' کی آواز نکالتے ہیں اور یورپی لوگ مسلمانوں کو زندہ جلاتے ہیں۔ فینن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا کہ نفسی طب کے ماہرین کی ایک مجلس دیسی باشندوں کے جرائم کی سمت میلان پر بہت پریشان تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ''یہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ یہ صحت مندی کی علامت نہیں ہے۔ الجزائریوں کا دماغی ڈھانچہ بس ماندہ ہے۔'' دوسرے لوگوں نے وسطی افریقہ میں یہ طے کیا۔ ''افریقی اپنے دماغ کے سامنے کے گوشوں کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔'' آج ان عالموں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو یورپ میں جاری رکھیں اور بالخصوص فرانسیسیوں کے درمیان۔ اس لئے کہ پچھلے چند برسوں میں ہم بھی ''دماغی کاہلی'' کے شکار ہو چکے ہوں گے کہ ہمارے محبان وطن بھی اپنے ہم وطنوں کے قتل کا تھوڑا بہت کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اور اگر وہ انہیں گھر پر نہیں پاتے تو ان کے مکانات اور نوکروں کو اڑا دیتے ہیں۔ یہ محض شروعات ہیں۔ خانہ جنگی کی پیشین گوئی موسم خزاں یا اگلے موسم بہار تک کی گئی ہے تاہم ہمارے دماغی گوشے صحیح سالم معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ چونکہ ہم دیسی باشندوں کو کچل نہیں سکتے اس لئے تشدد اپنی راہ واپس آ رہا ہے، اور ہماری فطرت کی گہرائیوں میں مجتمع ہو کر اب اپنا انخلا چاہتا؟ الجزائری عوام کا اتحاد فرانسیسی عوام میں نفاق پیدا کر رہا ہے۔ ''سابق مادر وطن'' کے سارے علاقوں میں قبیلے جنگی رقص کر رہے ہیں خوف وہراس نے افریقہ کی سرزمین چھوڑ دی ہے اور اب یہاں آباد ہو رہا ہے۔ کچھ غضبناک بڑے نمایاں طور پر یہ چاہتے ہیں۔ کہ ان کی دیسیوں کے ہاتھوں شکست کی ندامت کا قرض ہم اپنے خون سے ادا کریں۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ اور بھی ہیں اور یہ دوسرے لوگ برابر کے مجرم ہیں، (اس لئے کہ بزرٹا میں ستمبر کے قتل عام کے بعد، ان میں سے کتنے تھے جو سڑکوں پر یہ نعرہ لگاتے ہوئے نکلے تھے۔ ''بس اب بہت ہو چکا؟'') گو ان کا جرم بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے، اور وہ ہیں ہمارے آزاد

خیال اور اعتدال پسند بائیں بازو کے سرگرم کار افراد۔

خوف ان کے درمیان بھی پھیل رہا ہے اور غصہ بھی۔ یقینی طور پر ان کی بھی پھونک نکل چکی ہے۔ اب وہ اپنے غیض کو دیومالاؤں اور پیچیدہ رسوم میں چھپا رہے ہیں۔ یوم حساب سے بچنے اور فیصلے کی کمی کے باعث انہوں نے ہمارے سروں پر ایک عظیم جادوگر بٹھا رکھا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ ہمیں ہر قیمت پر اندھیرے میں رکھے۔ اب کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ تشدد جسے کچھ لوگ تسلیم کرتے ہیں اور کچھ رد کرتے ہیں اب خلا میں گردش کر رہا ہے۔ ایک دن وہ مٹیز میں پھوٹتا ہے تو دوسرے دن بور دوتیں۔ وہ ہر جگہ ہے، یہاں بھی اور وہاں بھی... جیسے ''سلیپر کی تلاش'' کے کھیل ہیں۔ اب یہ ہماری باری ہے کہ ہم قدم بہ قدم اس پر چلیں جو ہمیں دیسی باشندوں کی سطح پر پہنچائے گی۔ لیکن مکمل طور ''دیسی'' بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری سرزمین پر سابق نوآبادیاتی عوام قابض ہو جائیں اور ہم فاقے کرنے لگیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ ہم پر تو رسوا اور بدنام استعماریت قابض ہو رہی ہے۔ یہی وہ بوڑھا، مغرور حاکم ہے۔ جو ہم پر سوار ہوگا۔ وہ آ رہا ہے، اپنے جنتر پڑھتا ہوا۔

اور جب فینن کا آخری باب پڑھ لیں گے تو آپ کو یہ یقین ہو جائے گا کہ آپ کے لئے انتہائی مصائب میں گرفتار دیسی باشندہ ہونا ایک سابق نوآبادکار ہونے سے کہیں بہتر ہے۔ کسی پولیس افسر کے لئے یہ بات اچھی نہیں ہے کہ وہ دن میں دس گھنٹے اذیت رسانی پر مجبور ہو۔ اس حساب تو اذیت رسانوں کے اعصاب ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، بشرطیکہ انہیں ان کے اپنے بھلے کے لئے زائد کام کرنے سے روک نہ دیا جائے۔ اگر یہ ضروری ہو کہ قانون کے ضابطے قوم اور فوج کی اخلاقیات کا تحفظ کریں۔ تو پھر یہ صحیح نہیں ہے کہ قوم اور فوج قانون کو خراب کریں۔ نہ ہی یہ بات صحیح ہے کہ ایک ایسا ملک جس کی جمہوری روایات ہوں، اپنے ہزاروں اور لاکھوں بچوں کو انقلابی فوجی افسروں کی نگرانی میں دے دے۔ میرے عزیز ہم وطنو! یہ صحیح نہیں ہے، تم تو ان جرائم کو اچھی طرح جانتے ہو۔ جو ہمارے نام پر کئے گئے ہیں۔ یہ مطلق صحیح بات نہیں کہ تم ان جرائم کے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہو، نہ ہی اپنی ذات سے اور محض خوف سے کہ کہیں تمہیں اپنی ذات کا محاسبہ نہ کرنا پڑے۔ چلو میں یہ مانے لیتا ہوں کہ شروع شروع میں تمہیں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بعدازاں تم اس شبہ میں مبتلا ہوئے کہ کیا ایسی باتیں بھی سچ ہو سکتی ہیں۔ لیکن اب تو تم سب کچھ جانتے ہو۔ مگر اس کے باوجود اپنی زبان بند رکھتے ہو، آٹھ برس کی

چپ، کتنی ذلت کا مقام ہے اور اب تو تمہاری چپ سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ آج تو آذیت رسانی کا چند دھیا دینے والا سورج بلندیوں پر ہے۔ اس نے سارے ملک کو روشن کر دیا ہے۔ اس کی اس بے رحم روشنی میں ایک ہنسی بھی ایسی نہیں جو جھوٹی نہ معلوم ہوتی ہو، ایک بھی چہرہ ایسا نہیں جس پر خوف اور غصہ کو چھپانے والی نقاب نہ پڑی ہو، اور ایک عمل بھی ایسا نہیں ہے۔ جو ہماری کراہت اور ساز باز کو آشکار نہ کرتا ہو۔ آج اگر وہ فرانسیسی آپس میں ملتے ہیں تو ان کے درمیان ایک مردہ آدمی ضرور ہوتا ہے، ایک مردہ آدمی۔ کیا میں نے یہی کہا ہے؟ پہلے فرانس ایک ملک کا نام تھا۔ ہمیں احتیاط کرنی چاہئے کہ 1961 میں یہ کسی اعصابی بیماری کا نام نہ ہو جائے۔

کیا ہم شفا پا سکتے ہیں؟ ہاں۔ اس لئے کہ تشدد اکلیلیس کے برچھے کی طرح، ان زخموں کو بھر بھی سکتا ہے جو اس نے لگائے ہیں۔ آج ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ ہم ذلیل ہو رہے ہیں اور خوف میں مبتلا ہیں۔ اب ہم اس جگہ سے نیچے نہیں گر سکتے۔ لیکن استعماری رئیسوں کے لئے اتنا کافی نہیں ہے۔ وہ الجزائر میں تاخیر کرنے کے عمل کو پورا نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ فرانسیسیوں کو استعمار کے شکنجے میں نہ کس لیں۔ ہم ہر روز محاذ جنگ کی جانب قدم دھر رہے ہیں اور آپ یقین کریں کہ ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔ قاتلوں کو اس کی ضرورت ہے وہ ہمیں گھیریں گے۔ اور پھر آنکھ بند کر کے داہنے بائیں ضرب لگائیں گے۔

اس طرح جادوگروں اور جادوٹونے کا عہد ختم ہو جائے گا۔ آپ کو جنگ کرنی ہوگی۔ یا پھر آپ جنگی قیدیوں کی طرح تباہ ہوں گے۔ اس جدلیت کا یہی نتیجہ ہے، آپ اس جنگ کو برا سمجھتے ہیں، پھر بھی یہ ہمت نہیں کرتے کہ الجزائری جانبازوں کی طرفداری کا اعلان کر دیں۔ خوفزدہ نہ ہوں۔ آپ نوآبادکاروں اور کرائے کے سپاہیوں پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کو کود پڑنے پر مجبور کر دیں گے۔ شاید اس وقت جب آپ جنگ پر مجبور ہوں گے تو بالآخر اس نئے تشدد کو بروئے کار لائیں گے۔ جو آپ کے دل میں اپنے پرانے متواتر جرائم کے باعث پیدا ہوا ہے۔ لیکن خیز: نہ تو دوسری داستان ہے۔ جسے انسانوں کی تاریخ کا نام دے لیجئے۔ مجھے اس کا یقین کہ اب وہ وقت آ رہا ہے۔ جب ہم ان لوگوں کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے جو تاریخ بناتے ہیں۔

کچھ تشدد کے بارے میں

آپ اسے قومی آزادی پکاریں، قومی نشاۃ ثانیہ کا نام دیں، عوام الناس کو ایک قومیت کے سانچے میں ڈھالنا کہیں، دولت مشترکہ کے نام سے منسوب کریں، خواہ کوئی عنوان قائم کریں اور کسی کلیہ کو کام میں لائیں، استعمار کی شکست ہمیشہ ایک متشددانہ عمل ہوتا ہے۔ ہم خواہ کسی سطح پر بھی اس کا مطالعہ کریں...افراد کے باہمی تعلقات کی سطح پر، تفریحی کلبوں کے نئے ناموں کی سطح پر، کاک ٹیل پارٹیوں میں مجتمع انسانوں کی سطح پر پولیس اور قومی یا نجی بینکوں کے ڈائریکٹروں کی سطح پر....استعمار کی شکست واضح طور پر انسانوں کی ایک ''نوع'' کی جگہ دوسری ''نوع'' کی آمد ہے۔ کسی عبوری دور کے بجائے یہ ایک مکمل بھرپور اور قطعی تبدیلی کی صورت حال ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم ایک نئی قومیت کے وجود اور ایک نئی ریاست کی تشکیل پر، ایک سے سفارتی تعلقات اور اس کے اقتصادی اور سیاسی رجحانات پر زیادہ توجہ دیں لیکن ہم نے ایسی صورتحال کا انتخاب کیا ہے جسے ہر قسم کے استعمار کے خاتمہ کے بعد ایک ''صاف تختی'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس صورت حال کی خاص اہمیت اس بات میں ہے کہ اس میں اول دن سے استعمار زدگان کی ضرورت کو کم سے کم دخل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استعمار کی شکست کی تکمیل ہی اس وقت ممکن ہے جب کہ پورا معاشرتی ڈھانچہ نیچے سے اوپر تک تبدیل کر دیا جائے۔ اس تبدیلی کی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ یہ ضرورتاً، حالات کے تقاضوں کے تحت، بالا رادہ عمل میں لائی جاتی ہے۔ استعمار زدہ مردوں اور عورتوں کے شعور اور ان کی زندگی میں اس تبدیلی کے تقاضے پوری شدت اور تندی کے ساتھ اپنی خام صورت میں ہمہ وقت موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اس تبدیلی کے امکانات اس دوسری ''نوع'' کے مردوں اور عورتوں کے شعور میں بھی جنہیں ہم نوآبادکار کہتے ہیں ایک دہشت ناک مستقبل کے تصور کی صورت میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔

استعمار کی شکست، جس کا مدعا دنیا کے نظام کو بدلنا ہے۔ فی الحقیقت بذاتہی ایک مکمل بدنظمی لائحہ عمل ہوتا ہے۔ لیکن یہ کا جادوٹونے، فطری حادثات یا دوستانہ گفت وشنید سے ممکن نہیں ہے۔ استعمار کی شکست جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایک تاریخی عمل ہے۔ یعنی یہ کہ ہم اسے اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے، اس وقت تک یہ قابل فہم نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم ان حقیقی عوامل کو نہ جان لیں جو اسے ایک تاریخ مواد اور شکل عطا کرتے ہیں۔ استعمار کی شکست ایسی دو قوتوں کے یکجا ہونے سے عمل میں آتی ہے جو اپنی ماہیت کے اعتبار

سے متضاد ہوں۔ یہ صورت حال ان حقائق ان کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، جو کسی نوآبادی میں پیدا ہوتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ ان دو قوتوں کا پہلا ٹکراؤ ہی تشدد اور ان کی باہمی موجودگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی نوآبادکار کا مقامی باشندوں کا استحصال۔ اور یہ استحصال صف در صف بندوقوں اور توپوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ نوآبادکاروں اور مقامی باشندوں میں قدیم شناسائی ہوتی ہے۔ جب نوآبادکار یہ کہتا ہے کہ وہ ''انہیں'' خوب جانتا ہے تو وہ فی الحقیقت سچ کہتا ہے۔ اس لئے کہ نوآبادکار ہی مقامی باشندوں کے وجود کا ضامن ہے اور وہ ہی ان کے وجود کو برقرار رکھتا ہے۔ نوآبادکار کے اپنے وجود یعنی اس کی املاک کا انحصار استعماری نظام پر ہوتا ہے۔

استعمار کی شکست کبھی خاموشی سے عمل میں نہیں آتی اس لئے کہ یہ افراد کو متاثر کرتی ہے اور ان میں بنیادی تبدیلیاں لاتی ہے۔ یہ ان تماشائیوں کو جو اپنی لامعنویت کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں بامعنی اداکاروں میں تبدیل کر دیتی ہے اور وہ تاریخ عالی شان روشنی کی چمک دمک میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس سے انسانی وجود کا وہ فطری آہنگ پیدا ہوتا ہے جسے نئے لوگ بروئے کار لاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک نئی زبان اور ایک نئی انسانیت وجود میں آتی ہے۔ استعمار کی شکست نئے انسانوں کی حقیقی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن یہ تخلیق کسی مافوق الفطرت قوت کے زیر اثر اپنا جائز وجود نہیں رکھتی۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ ''شے'' جو استعمار کا شکار ہوتی ہے۔ اسی عمل کے دوران میں جس میں وہ آزادی حاصل کرتی ہے آدمیت کا جامہ بھی پہن لیتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ استعمار کی شکست کے عمل میں پوری استعماراتی صورت حال ہدف بنتی ہے۔ اس بات کو مختصراً ان مشہور الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ''آخر ہو جائے گا۔ اور اول آخر''...شکست استعمار اس جملہ کی عملی صورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ اگر ہم اس کا بیان کریں تو معلوم ہو گا کہ شکست استعمار کی ہر صورت کامیاب ہوتی ہے۔

شکست استعمار کی ننگی حقیقت ہمارے سامنے بدن چیرتی گولیوں اور خون آلود چھریوں کو پیش کرتی ہے جو اسی صورت حال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ اگر آخر کو اول کو اول ہونا ہے تو یہ دونوں حریفوں کے درمیان خوں آشام اور فیصلہ کن کش مکش کے بعد ہی ممکن ہے۔ اس مثبت ارادے کی تکمیل کہ سب سے آخر کو اول کر دیا جائے اور انہیں ان زینوں پر چڑھایا جائے (بعض لوگوں کے بقول بہت تیزی سے) جو منظّم

معاشرے کی سمت لے جاتے ہیں، محض اس وقت ممکن ہے جب کہ ہم ہر شے کا رخ بدلنے کی ہر ممکن کوشش کریں جس میں تشدد بھی شامل ہے۔

آپ کسی معاشرے کو خواہ وہ کتنا ہی غیر ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، کسی لائحہ عمل کے ذریعے بالکل پلٹ نہیں سکتے جب تک کہ ابتدا ہی سے یعنی اس لائحہ عمل کے مرتبہ کرتے ہیں وقت ہی، یہ فیصلہ نہ کرلیں کہ آپ اس عمل کے دوران پیدا ہونے والی ہر رکاوٹ پر حاوی ہوں گے۔ مقامی باشندہ جو اس لائحہ عمل کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کرتا ہے اور اس کے لئے محرک قوت بنتا ہے وہ ہمیشہ تشدد کے لئے تیار رہتا ہے۔ اسے پیدا ہوتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تنگ دنیا کو جس میں قدم قدم پر بندشیں ہیں، محض بھرپور تشدد کے ذریعے ہی ہدف بنایا جا سکتا ہے۔

نوآبادیات کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جو خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ غالباً یہ غیر ضروری ہے کہ مقامی باشندوں کی رہائش گاہوں اور یورپی باشندوں کی رہائش گاہوں، مقامی باشندوں کے مدرسوں اور یورپی باشندوں کے مدرسوں کے وجود کو یاد کیا جائے۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے نسلی امتیاز کے مسئلے کو بھی یاد کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم امتیازات کے اس نظام کا بغور مطالعہ کریں تو کم از کم اس میں مضمر قوتوں کو نمایاں طور پر دیکھ سکیں گے۔

نوآبادیاتی دنیا، اس کے نظام اور اس کی جغرافیائی تشکیل کا یہ مطالعہ ہمیں ان بنیادوں کو سمجھنے میں مدد دے گا جن پر استعمار کی شکست کے بعد نئے معاشرے کی تنظیم نو ہوگی۔

نوآبادیاتی دنیا دو علاقوں میں بٹی ہوئی دنیا ہے۔ ان کی حد بندی، ان کی سرحدیں فوجی چھاؤنیوں اور پولیس چوکیوں کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں۔ نوآبادیات میں پولیس کے سپاہی اور فوجی سرکاری طور پر متعین سفیر ہوتے ہیں جو دونوں علاقوں کے درمیان رابطہ قائم رکھتے ہیں اور جو نوآبادکاروں اور ان کی متشددانہ حکومت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معاشرے کا نظام تعلیم خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، اخلاقی ردعمل کا وہ نظام جو باپ سے بیٹے کو وراثت میں ملتا ہے، مزدوروں کی وہ مثالی ایمانداری جس کے عوض میں انہیں پچاس برس پوری وفاداری سے خدمت کرنے کے بعد تمغہ انعام دیا جاتا ہے اور وہ جذبات جو خوشگوار تعلقات اور اچھے کردار سے جنم لیتے ہیں،...غرضیکہ مروجہ نظام کے احترام کا یہ تمام جمالیاتی اظہار، استحصال زدگان کے چاروں طرف اطاعت اور گھٹن کی ایک ایسی فضا قائم کر دیتا ہے۔ جس میں

پولیس کا کام بڑی حد تک ہلکا ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ممالک میں حاکم ومحکوم طبقہ کے درمیان معلّمان اخلاق، مشیران قوم اور ''ذہنی الجھنیں پیدا کرنے والوں'' کی کثیر تعداد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس نوآبادیاتی ممالک میں پولیس اور فوج کے آدمی اپنی بروقت موجودگی اور بسا اوقات اپنے براہ راست عمل کے ذریعے مقامی باشندوں سے رابطہ استوار کرتے ہیں۔ اور بندوق کے کندوں اور آتش گیر مادوں کی مدد سے انہیں پرسکون رہنے کا مشورہ دیتے ہیں ظاہر ہے کہ یہاں حکومت کے نمائندے خالصتاً جبر کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ درمیانی واسطہ قائم کرنے والے ظلم وتشدد کو کم نہیں کرتے نہ ہی وہ اپنی بالادستی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ صاف ضمیر کے ساتھ قیام امن کے لئے اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور عملی طور پر اس کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ تاہم وہ مقامی باشندوں کے گھروں میں اور ان کے ذہنوں میں تشدد کے پیغامبر بن کر آتے ہیں۔

وہ علاقہ جہاں مقامی باشندے رہتے ہیں، نوآبادکاروں کے علاقہ رہائش سے ملحق نہیں ہوتا۔ یہ دونوں علاقے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں مگر یہ ضد کسی بڑی اکائی کو پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ یہ دونوں علاقے ارسطاطیلیسی منطق کے تحت ایک دوسرے کو خارج کرنے کے اصول پر قائم رہتے ہیں۔ ان میں کوئی قدر مشترک دریافت کرنا ممکن نہیں کہ ان دو اصطلاحوں میں ایک فاضل ہے۔ نوآبادکار کا شہر پتھر اور فولاد سے بنا ہوا مضبوط شہر ہوتا ہے۔ یہ جگ مگ کرتی روشنیوں کا شہر ہوتا ہے۔ سڑکیں پختہ ہوتی ہیں، جگہ جگہ کوڑے کی ٹوکریاں کوڑے کرکٹ کو اس طرح نگل لیتی ہیں کہ نہ تو انہیں کوئی دیکھتا ہے، نہ جانتا ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں کچھ سوچتا ہے۔ نوآبادکار کے پاؤں کبھی دکھائی نہیں دیتے۔ ماسوا سمندر میں نہاتے وقت۔ لیکن آپ ان کے قریب بھی تو نہیں ہوتے کہ پاؤں دیکھ سکیں۔ اس کے پیروں کی حفاظت مضبوط جوتے کرتے ہیں۔ حالانکہ اس شہر کی سڑکیں صاف وشفاف اور ہموار ہوتی ہیں جن پر نہ کوئی پتھر ہوتا ہے اور نہ وہ شکستہ ہوتی ہیں۔ نوآبادکار کا شہر شکم سیر اور آسودہ حال ہوتا ہے۔ اس کے شکم میں ہمیشہ اچھی چیزیں بھری ہوتی ہیں۔ نوآبادکار کا شہر سفید فام لوگوں کا، بیرونی افراد کا شہر ہوتا ہے۔

مقامی باشندوں کا شہر، یا کم از کم مقامی شہر، حبشیوں کا گاؤں، مدنیہ، مقامی لوگوں کا مخصوص علاقہ، ایک بدنام مقام ہوتا ہے، جس میں بدقماش لوگ رہائش رکھتے ہیں۔ وہ وہاں پیدا ہوتے ہیں، کیسے اور کہاں، یہ بات بے محل ہے، اور وہیں مر جاتے ہیں، کیسے اور کہاں، یہ پوچھنے کی گنجائش نہیں۔ یہ ایک ایسی

دنیا ہوتی ہے جس میں طول وعرض نہیں ہوتے۔ لوگ ایک کے اوپر ایک رہتے ہیں اوران کی جھونپڑیاں تلے اوپر بنتی ہیں۔ مقامی شہر بھوکا شہر ہوتا ہے جہاں روٹی، گوشت کوئلہ اور روشنی نایاب ہوتی ہے۔ مقامی شہر ایک پست گاؤں ہوتا ہے۔ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا شہر، کیچڑ میں لت پت شہر۔ یہ حبشیوں اور گندے عربوں کا شہر ہوتا ہے۔ مقامی باشندہ جس نگاہ سے نوآبادکاروں کے شہر کو دیکھتا ہے وہ حرص اور حسد کی نگاہ ہوتی ہے۔ اس نگاہ میں اس کی ملکیت کے خواب ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی ملکیت کے خواب۔ یعنی نوآبادکاروں کی میز پر کھانا کھانے کے خواب، نوآبادکار، کے بستر پر سونے کے خواب اور اگر ممکن ہو تو اس کی بیوی کے ساتھ۔ مقامی باشندہ بہت حاسد ہوتا ہے اور نوآبادکار اس حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ جب دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں تو آبادکار مدافعتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے تلخی کے ساتھ اس خواہش کو جانچ لیتا ہے ''یہ لوگ ہماری جگہ لینا چاہتے ہیں۔'' اور یہ حقیقت ہے اس لئے کہ کوئی مقامی باشندہ ایسا نہیں ہے جو دن میں کم از کم ایک بار نوآبادکار کا مقام حاصل کرنے کا خواب نہ دیکھتا ہو۔

یہ دنیا جو خانوں میں تقسیم ہے، یہ دنیا جو دو حصوں میں بٹی ہوتی ہے، اس میں دو مختلف مخلوق بستی ہیں۔ نوآبادیاتی صورت حال کی اصل جدت وہ اقتصادی حقیقت ہے، جس میں اتنی شدید معاشی ناہمواری اور طرز زندگی کا اتنا بڑا فرق ہوتا ہے کہ انسانی صورت حال کی اس قدر پردہ پوشی کسی اور طریقے سے کبھی نہیں ہوتی۔ اگر آپ ذرا قریب سے نوآبادیاتی صورت حال کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو چیز دنیا کو اس طرح تقسیم کرتی ہے اس کی ابتدا اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ آیا آپ کسی ایک نسل سے متعلق ہیں یا نہیں، کسی ایک نوع سے تعلق رکھتے ہیں یا نہیں۔ نوآبادیات میں اقتصادیات کا زیریں نظام بھی ایک بالائی نظام ہوتا ہے۔ سبب ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ آپ دولت مند ہیں اس لئے کہ آپ سفید فام ہیں، آپ سفید فام ہیں، اس لئے کہ آپ دولت مند ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب ہم نوآبادیاتی صورت حال کو مارکسی تجزیہ کے مطابق دیکھتے ہیں تو ہمیں اس تجزیہ کو زیادہ پھیلانا پڑتا ہے.... سرمایہ دارانہ نظام سے پہلے کی معاشرت اور اس کی ماہیت کا جو خوبصورت تجزیہ مارکس نے کیا ہے اس پر اس صورت حال میں ہمیں دوبارہ غور وخوض کرنا پڑتا ہے۔ کسان اپنی ماہیت کے اعتبار سے جاگیردار سے مختلف ہوتا ہے لیکن اس قانونی فرق کو فی الواقعی قانونی بنانے کے لئے نیابت الٰہی کا حوالہ ضروری ہے مگر نوآبادیوں میں تو یہ ہوا ہے کہ بیرونی لوگوں نے دوسرے ممالک سے آکر مشینوں اور بندوقوں کے بل پر اپنی حکومت ٹھونسی ہے۔ اپنی

کامیاب نقل مکانی سے قطع نظر اور اپنی ملکیت قائم کرنے کے باوجود، نوآبادکار ہمیشہ بیرونی رہتا ہے جو چیز حاکم طبقہ کو دوسروں سے ممیّز کرتی ہے وہ ملوں اور املاک کی ملکیت یا بینک میں ان کا سرمایہ نہیں ہوتا۔ حاکم نسل بنیادی طور پر ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو کہیں اور سے آتے ہیں، وہ جو مقامی باشندوں کے مثل نہیں ہوتے، وہ جو محض ''دوسرے'' ہوتے ہیں۔

وہ تشدد جو نوآبادیاتی دنیا کی تنظیم کو برقرار رکھتا ہے، وہ جو مقامی معاشرتی سانچوں کی تباہی کے آہنگ کو مسلسل قائم رکھتا ہے اور جس نے بلا تامل ان کے اقتصادی حوالوں کے نظام کو درہم و برہم کیا ہے، ان کے لباس کو ختم اور ان کی زندگی کے خارجی اظہار کے پیکروں کو توڑا ہے، اسی تشدد کا دعویٰ مقامی باشندے کریں گے اور اس وقت اسے اپنے ہاتھوں میں لیں گے جب وہ مجسم تاریخ بن کر ممنوعہ علاقہ پر ہلہ بولیں گے۔ اب نوآبادیاتی دنیا کو تباہ کرنا عمل کی ایک ایسی ذہنی تصویر ہے جو بہت واضح ہے، جسے سمجھنا بہت آسان ہے اور جسے ہر وہ شخص اپنے ذہن میں کھینچ سکتا ہے جو مقامی آبادی کا فرد ہے۔ نوآبادیاتی دنیا کی تباہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب سرحدیں ختم ہو جائیں گی تو دونوں علاقوں کے درمیان رابطہ قائم رہے گا۔ نوآبادیاتی دنیا کی بربادی کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک علاقے کو ختم کر دیا جائے اسے زمیں کی گہرائیوں میں دفن کر دیا جائے یا پھر اسے ملک بدر کر دیا جائے۔

نوآبادیاتی دنیا کو مقامی باشندوں کا چیلنج مختلف نقطہ ہائے نظر کا عقلی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ یہ آفاقی صداقتوں کے اظہار کے بجائے ایک نئے تصور کا بے ڈھنگا اقرار ہوتا ہے۔ جسے ایک مطلق صداقت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی دنیا مانویت (3) کے اصول پر قائم ہوتی ہے نوآبادکار کے لئے محض یہ کافی کہ وہ فوج اور پولیس کی مدد سے مقامی باشندوں کے سرحدوں کی حد بندی کر دے۔ غالباً استعماراتی استحصال کی مطلق العنانیت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہی نوآبادکار مقامی باشندے کو بدی کے ست کے طور پر پیش کرتا ہے۔ محض یہ نہیں کہ مقامی معاشرت کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس میں اقدار کی کمی ہے۔ نوآبادکار کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ یہ جتائے کہ اقدار نوآبادیاتی دنیا سے غائب ہو گئی ہیں یا یہ کہ یہاں ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ مقامی باشندوں کے متعلق یہ اعلان ہوتا ہے کہ وہ اخلاقیات سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ اقدار کے عدم وجود کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ خود اسی ذات میں ان کی نفی ہیں۔ ہمیں یہ بات مان لینی چاہئے کہ وہ اقدار کے دشمن ہوتے ہیں، اور اسی مفہوم میں کلیتاً بد ہوتے ہیں۔

مقامی باشندہ بہت تباہ کن عنصر ہوتا ہے اور گردو پیش کی ہر شے کو برباد کر دیتا ہے۔ وہ اشیا کی اصل ہیئت کو بگاڑ دیتا ہے جس سے اس واسطہ پڑے۔ وہ نہایت مضر طاقتوں کا منبع اور اندھی قوتوں کا شکار اور ان کا لاشعوری آلہ کار رہتا ہے۔ اسی باعث موسیو میئر نے فرانسیسی قومی اسمبلی میں نہایت سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی کہ الجزائری عوام کو فرانسیسی جمہوریہ کا حصہ بنا کر اسے آلودہ نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام اقدار جن کا تعلق نوآبادیاتی اقوام کے ساتھ ہوتا ہے اس طرح زہر آلود اور مہلک ہو جاتی ہیں کہ پھر ان کا کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔ نوآبادیاتی اقوام کے رسوم، ورواج، ان کی روایات اور سب سے زیادہ ان کی داستانیں ان کے روحانی بنجر پن اور آئینی زوال کی علامتیں ہوتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں ان جراثیم کو مارنے کے لئے جو بیماریوں کو پھیلاتے ہیں، فوری طور پر ڈی ڈی ٹی کا استعمال کرنا چاہیئے، بالکل اسی طور پر سے جس طرح عیسائی مذہب ان کی بدعتوں اور جبلی عناصر کے خلاف جہاد کرتا ہے جو انسان کے باطن میں ہوتے ہیں اور ان برائیوں کے خلاف جنگ کرتا ہے جن کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ زرد بخار کا انسداد اور انجیل مقدس کی تبلیغ ایک ہی لائحہ عمل کا حصہ ہیں۔ لیکن تبلیغی جماعتوں کے فاتحانہ اعلانات یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ کس حد تک بیرانی اثرات مقامی باشندوں کی جڑوں میں سرایت کر چکے ہیں۔ میں عیسائی مذہب کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں اور اس بات پر کسی کو متعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ نوآبادیوں کا کلیسا، سفید فام لوگوں کا کلیسا، بیرونی لوگوں کا کلیسا ہوتا ہے۔ یہ کلیسا مقامی آبادی کو خدائے برتر کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ سفید فام لوگوں، آقاؤں اور ظالموں کی راہ چلنے پر اکساتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس راہ میں بلائے جانے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن خدا کے منتخب بندے خال خال ہیں۔

بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ مانویت اپنے منطقی نتائج تک پہنچ جاتی ہے اور مقامی باشندوں کو انسانیت سے خارج کر دیتی ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ انہیں جانور بنا دیتی ہے۔ فی الحقیقت وہ اصطلاحیں جو نوآبادکار استعمال کرتا ہے وہ حیوانیات کی اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ زرد آدمی کی حشراتی حرکت، مقامی باشندوں کے مکانات کے تعفن، آبادی میں اضافہ کرتے ہوئے جھنڈ، عفونت وگندگی رینگتے ہوئے بچے، حرکات واشارات وغیرہ کی بات کرتا ہے۔ جب نوآبادکار مقامی باشندوں کا بھرپور اور مبسوط تذکرہ کرنا چاہتا ہے، تو وہ حیوانی اصطلاحات کے حوالے دیتا ہے۔ یورپی بہ

مشکل ہی ان کا پورا نقشہ کھینچتا ہے مگر مقامی باشندے یہ جانتے ہوئے کہ نوآبادکار کے ذہن میں کیا ہے فوراً یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہ زندہ اعداد وشمار کے ڈھیر، یہ جنونی عوام الناس، یہ چہرے جن میں انسانیت کا شائبہ تک نہیں یہ پھولے ہوئے جسم جن کی مثال دنیا میں کہیں نہیں، یہ انبوہ جن کا نہ شروع ہے نہ اخیر، یہ بچے جن کا کوئی وارث نہیں، یہ دھوپ میں پھیلے ہوئے ناکارہ وجود، یہ زندگی کا نباتاتی آہنگ،..... یہ سب نوآبادیاتی زبان کی چند اصطلاحیں ہیں۔ جنرل ڈیگال ''زرد فاموں کے اژدہام'' کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں، اور فرنیکوا مار پاک کے بقول یہ سیاہ، بھورے، اور زرد عوام ہیں جن کے تانے بانے جلد ہی بکھر جائیں گے۔ مقامی باشندے یہ سب کچھ جانتے ہیں اور جہاں کہیں دوسرے لوگوں کے بیانات میں انہیں حیوانی تلمیحات ملتی ہیں وہ دل ہی دل میں ہنستے ہیں۔ اس لئے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ حیوان نہیں ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہے جس میں انہیں اپنی انسانیت کا ادراک ہوتا ہے اور اپنے ہتھیاروں کو تیز کرنا شروع کر دیتے ہیں جن سے کہ انہیں فتح حاصل کرنی ہے۔

جیسے ہی کہ مقامی باشندے اپنے لنگر اٹھاتے ہیں اور نوآبادکار کے لئے تشویش کا باعث بنتے ہیں، انہیں ان نیک دل لوگوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو تہذیبی اجتماعات میں مغربی اقدار کی دولت اور خصوصیات کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ لیکن جتنی بار مغربی اقدار کا حوالہ دیا جاتا ہے اتنی ہی بار مقامی باشندوں کا رویہ اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے اور ان کی رگیں اور تن جاتی ہیں۔ شکست استعمار کے زمانے میں مقامی باشندوں کو ان کی عقل وفراست کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ انہیں ٹھوس اقدار کی پیش کش کی جاتی ہے ان سے بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ استعمار کو ختم کرنے کے معنی مراجعت نہیں ہیں، لہٰذا انہیں ان صفات واقدار پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ جنہیں مستقل طور پر کھا جا چکا ہے، اور جو ٹھوس اور بہت زیادہ قابل تکریم ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب مقامی باشندے مغربی تہذیب کے بارے میں کوئی تقریر سنتے ہیں تو ہو چھریاں نکال لیتے ہیں.... یا کم از کم وہ یہ جانچ پرکھ لیتے ہیں کہ یہ اقدار ان کی پہنچ میں ہیں۔ جس تشدد کے ساتھ سفید فام لوگوں کی برتری کو ثابت کیا جاتا ہے۔ اور مقامی باشندوں کے طرز حیات اور طرز فکر پر مغربی اقدار کی فتح کے ساتھ جو مظالم وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ جب کبھی مغربی اقدار کا ذکر ان کے سامنے ہوتا ہے تو مقامی باشندے اور اقدار کا مذاق اڑاتے ہیں نوآبادیاتی صورت حال میں یہ ہوتا ہے کہ نوآبادکار مقامی باشندوں کی شکست وریخت سے محض اس وقت ہاتھ اٹھاتا ہے جب وہ پورے شد

ومد اور عقل وشعور سے سفید فام اقوام کی اقدار کی برتری کو تسلیم کرا لیتا ہے۔ شکست استعمار کے وقت نوآبادیاتی عوام انہیں اقدار کا تمسخر اڑاتے ہیں اور انہیں ذلیل وخوار سمجھ کر اگل دیتے ہیں۔

بالعموم اس صورت حال پر پردے پڑے ہوتے ہیں اس لئے کہ شکست استعمار کے دوران میں بعض نوآبادیاتی دانشور نوآبادکار ملک کے سرمایہ داروں سے گفت وشنید کرتے رہتے ہیں۔ اس دور میں تمام مقامی آبادی کو ایک قسم کا جم غفیر سمجھا جاتا ہے۔ وہ چند مقامی شخصیتیں جن سے نوآبادکار سرمایہ دار رابطہ قائم کرتا ہے، مقامی آبادی پر اتنا اثر ورسوخ نہیں رکھتیں کہ اس نئی صورت حال کے بارے میں موشگافی کر سکیں۔ اس کے برعکس آزادی کی جدوجہد کے دوران میں نوآبادکار سرمایہ دار بڑے شدومد سے دانش وروں کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے اور انہیں دانشوروں کے ساتھ اقدار کے بارے میں بحث مباحثہ شروع ہوتا ہے۔ جب نوآبادکار سرمایہ دار دیکھ لیتا ہے کہ اب وہ نوآبادی پر اپنا اقدار قائم نہیں رکھ سکتا تو وہ عقب سے حملہ کرنے کی سوچتا ہے اور تہذیب، اقدار اور مشینی ترقی وغیرہ کی بات شروع ہوتی ہے۔ ہمیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہئے کہ مقامی باشندوں کی ایک بڑی اکثریت ان مسائل سے بالکل غافل ہوتی ہے۔ نوآبادیاتی ملک کے لئے سب سے اہم قدر، جو سب سے ٹھوس قدر بھی ہے، بنیادی طور پر اس کی سر زمین ہوتی ہے، وہ سرزمین جو اسے خوراک مہیا کرتی ہے۔ اور اس کے وقار ضامن ہوتی ہے۔ لیکن اس وقار کا انسانی وقار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ مقامی باشندوں نے اس وقار کی بابت سنا ہی نہیں ہوتا۔ جو کچھ انہوں نے اپنے ملک میں دیکھا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں نہایت آزادی سے گرفتار کیا جا سکتا ہے، پیٹا جا سکتا ہے اور بھوکا مارا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں معلّمان اخلاق اور عالمان دین میں سے کوئی شخص ان کی جگہ مار کھانے یا ان کے دسترخوان پر کھانا کھانے نہیں آتا۔ جہاں تک مقامی باشندوں کا تعلق ہے ان کی اخلاقیات بہت ٹھوس ہوتی ہے، یعنی یہ کہ نوآبادکار کی سرکشی کا سر کچل دیا جائے اور اس کے مغرورانہ تشدد کا خاتمہ کر دیا جائے... مختصراً یہ کہ اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، یہ مشہور اصول کہ تمام انسان برابر ہیں، نوآبادیات میں محض اس وقت رونما ہوگا جب کہ مقامی باشندے یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ وہ نوآبادکار کے برابر ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک قدم اور بڑھاتے ہیں اور اب وہ نوآبادکار سے زیادہ ہونے کے لئے اس سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نوآبادکار کو نکال باہر کرنے اور اس کی جگہ لینے کے لئے پہلے ہی سے تیار رہتے ہیں، ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ ایک پوری مادی واخلاق دنیا ٹوٹ رہی

ہے۔ وہ دانشور جو اپنے تئیں آفاقی صداقتوں کے سلسلے میں نوآبادکار کا تقلید کرتا ہے۔ اس بات کے لئے جدوجہد کرے گا کہ نوآبادکار اور مقامی باشندے ایک نئی دنیا میں ساتھ ساتھ پرسکون زندگی بسر کریں۔ لیکن چونکہ دانش ور نوآبادیاتی نظام اور اس کے تصورات میں رچ بس جاتا ہے لہٰذا وہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی نوآبادکار کو نوآبادی میں رہنے یا مقامی باشندوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں اپنا کوئی مفاد نظر نہیں آئے گا۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ حکومت الجزائر اور حکومت فرانس کے درمیان کسی قسم کی گفت وشنید شروع ہونے سے پہلے ہی اس یورپی اقلیت نے جو خود کو آزاد خیال کہتی ہے، اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا تھا۔ وہ دوگونی شہریت سے کم کسی شے پر راضی ہونے کو تیار نہ تھے۔ خود کو نہایت مجرد طور پر الگ کرتے ہوئے ان آزاد خیالوں نے نوآبادکاروں پر یہ ٹھونسنا چاہا کہ انجانی سمت میں قدم بڑھائیں ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ نوآبادکار یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کسی قسم کا زبانی جمع خرچ حقیقت کے مترادف نہیں ہوسکتا۔

پس مقامی باشندے یہ جان لیتا ہے کہ زندگی، سانس اور دھڑکتے ہوئے دل کے اعتبار سے اس میں اور نوآبادکار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ نوآبادکار کی کھال مقامی باشندے کی کھال سے زیادہ دقیع نہیں ہے۔ اور یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس کی یہی معلومات دنیا کو جائز طور پر لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ مقامی باشندوں کی ساری نئی اور انقلابی قوت ارادی یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ بات سچ ہے کہ میری زندگی اتنی ہی قیمتی ہے جتنی کہ نوآبادکار کی زندگی، تو پھر نوآبادکار کی نگاہ نہ مجھے کملا سکتی ہے، نہ ساکت کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کی آواز سے میں پتھر بن سکتا ہوں۔ میں اس کے سامنے خلجان میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس کو پرکاہ کی وقعت نہیں دیتا۔ محض یہ نہیں کہ اس کی موجودگی میرے لئے اذیت بخش نہیں ہوگی بلکہ یہ بھی کہ اب میں اس کے لئے ایسی ایسی گھاتیں تیار کر رہا ہوں کہ جلد ہی اسے بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

ہم نے یہ کہا ہے کہ نوآبادیاتی صورت حال کی خصوصیت وہ تضاد ہے جس میں تمام آبادی مبتلا ہو جاتی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کی شکست، اپنے اس انقلابی فیصلہ سے کہ تنوع اور تضاد کو ختم کر دیا جائے اور لوگوں کو قومی بنیادوں پر یا کبھی کبھی نسلی بنیادوں پر متحد کیا جائے، ساری آبادی کو ایک اکائی میں ڈھال دیتی ہے۔ ہم سنگالی حب الوطنوں کے وہ خوفناک الفاظ جانتے ہیں جو انہوں نے اپنے صدر سنگھور کے طریق

کار کے متعلق کہے تھے ''ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ بڑی بڑی جگہوں پر افریقی نافذ کئے جائیں اور اب سنگھور یورپیوں کو افریقی بنا رہا ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقامی باشندہ یہ بات وضاحت سے اور فوری طور پر جان سکتا ہے کہ آیا استعماریت کا خاتمہ ہوا ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اس کا کم سے کم مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کو اول ہونا چاہئے۔

لیکن مقامی دانشور اس مطالبہ میں کچھ اور رنگ آمیز کرتا ہے اور فی الحقیقت اس کے بھی مناسب اسباب ہیں۔ اعلیٰ افسر، مکنیکی کام جاننے والے اور ماہرین... ان سب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اب یہ ہوتا ہے کہ عام باشندہ ان غلط قسم کی ترقیوں کو سازشیں سمجھتا ہے اور اکثر یہ اعلان کرتا ہوا سنا جاتا ہے!
''پھر تو ہمارا آزاد ہونا بیکار ہے۔''

ایسے نوآبادیاتی ممالک میں جہاں آزادی کے لئے حقیقی جدوجہد ہوئی ہے، جہاں لوگوں کا خون بہا ہے اور جہاں کافی مدت کی جنگ کے باعث دانشوروں نے پیچھے ہٹ کر مورچے سنبھالے ہیں۔ جہاں ان کا رابطہ عوام کے ساتھ ہوا ہے، وہاں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ نوآبادکار سرمایہ داروں کے قائم کردہ دانشوروں کے ذہنوں میں یہ بات ٹھونس دیتا ہے۔ کہ بنیادی خصوصیات ہمیشہ قائم و دائم رہتی ہیں خواہ انسان سے کتنی ہی عظیم غلط کاریاں کیوں نہ سرزد ہوں اور ان بنیادی خصوصیات سے مراد فی الحقیقت مغرب کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ دیسی دانشور ان تصورات کی صحت پر ایمان لے آتا ہے اور اس کے ذہن کے زیریں حصے میں آپ ہمیشہ اس ہوشیار پہرہ دار کو دیکھ سکتے ہیں جو یونانی ولاطینی منبر کی مدافعت کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ مگر آزادی کی جدوجہد میں یہ مقام آتا ہے کہ جیسے ہی دیسی دانشور اپنے عوام سے رابطہ قائم کرتا ہے، یہ منصوعی پہرہ خاک میں مل جاتا ہے۔ بحرروم کی وہ تمام اقدار.... انسان کی انفرادی فتح کی قدر، واضح بینی اور حسن کی قدر، سب کی سب مردہ اور بے رنگ فضولیات ہو جاتی ہیں۔ تمام تقریریں مردہ الفاظ کا مجموعہ بن جاتی ہیں، وہ تمام اقدار جو روحانی ترفع کا ذریعہ معلوم ہوتی ہیں۔ تمام تقریریں مردہ الفاظ کا مجموعہ بنا جاتی ہیں، وہ تمام اقدار جو روحانی ترفع کا ذریعہ معلوم ہوتی تھیں۔ اب بے معنی معلوم ہوتی ہیں محض اس لئے کہ وہ اس ٹھوس کشمکش سے بالکل غیر متعلق ہیں جس سے عوام دوچار ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے انفرادیت پسندی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دیسی دانشوروں نے اپنے آقاؤں سے یہ سیکھا تھا کہ فرد کو اپنا مکمل اظہار کرنا چاہئے۔ نوآبادکار سرمایہ داروں نے دیسی دانشوروں کے سر میں ایک ایسی

انفرادیت پسند معاشرت کا تصور ٹھونس دیا تھا جس میں ہر شخص اپنی داخلیت میں خود کو بند کر لیتا ہے اور محض اس کے انفرادی تصورات اس کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اب وہ دیسی دانشور جنہیں آزادی کی جدوجہد کے دوران میں عوام کی طرف واپس پلٹنے کا موقع ملتا ہے، اس تصور کے جھوٹ کو دریافت کر لیتے ہیں۔ اس جدوجہد میں تنظیموں کی مختلف شکلیں ہی اسے ایک نئی زبان سے آشنا کرتی ہیں۔ بھائی، بہن اور دوست... یہ وہ اصطلاحیں ہیں جنہیں نوآبادکار سرمایہ دار غیر قانونی سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر میں میرا بھائی میری دولت ہے اور میرا دوست میری زندگی گذارنے کی اسکیم کا حصہ ہے۔ دیسی دانشور ایک قدم کی خود شکنی کی جدوجہد میں حصہ لیتا ہے تا کہ اپنی ذات کے سارے بتوں کو توڑ دے، مثلاً انانیت کو، اس طعن وتشنیع کو جو غرور کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس بچکانی حماقت کو جس کے تحت آدمی ہمیشہ اپنی بات بالا رکھنی چاہتا ہے۔ ایسا نوآبادیاتی دانشور جو نوآبادیاتی تہذیب کی گرد میں اٹا ہوتا ہے، اسی طریق کار کی مدد سے گاؤں کے اجتماعات کی معنویت، عوام کی کمیٹیوں کا اتحاد اور مقامی مجالس اور گروہوں کی غیر معمولی تخلیقی نوعیت کا پتہ چلا لیتا ہے۔ اب سے ایک فرد کا مفاد سب کا مفاد ہوگا۔ اس لئے کہ اس ٹھوس حقیقت میں صورت حال یہ ہے کہ فوجی ہر شخص کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہر شخص تباہ کر دیا جائے گا۔ یا پھر ہر شخص بچ جائے گا۔ یہ اصول کہ ''اپنی ذات کی پروا کرو'' دراصل لامذہب شخص کی نجات کا طریقہ ہے اور اس صورت حال میں ممنوع ہے۔

لیکن بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام کی شکست ان علاقوں میں ہو جاتی ہے جنہیں آزادی کی جدوجہد اچھی طرح نہیں جھنجوڑتی، یہاں وہی ہر فن مولا، تیز اور عیار دانشور نظر آتے ہیں۔ ہمیں ان کے یہاں تصورات کی وہی صورتیں اور وہی انداز نظر آتے ہیں جو وہ نوآبادکار سرمایہ سے ربط ضبط کے دوران حاصل کرتے ہیں۔ کل کی استعماریت اور آج کی قومی حکومت کے یہ بگڑے ہوئے بچے موجود قومی ذرائع کی لوٹ کھسوٹ میں دل کھول کر حصہ لیتے ہیں۔ یہ لوگ بلا کسی رحم کے، اسکیموں اور قانونی ڈکیتی کے ذریعے، درآمد برآمد کے کاروبار کے ذریعے محدود ذمہ داریوں کی کمپنیوں کے ذریعے، اسٹاک ایکس چینج کی سٹہ بازی کے ذریعے اور ناجائز ترقیوں کے ذریعے، اپنے مفادات کو پورا کرتے ہیں۔ اور پوری قوم کی تکالیف کا ان باتوں کے لئے وسیلہ بناتے ہیں۔ یہ اس بات پر مصر ہوتے ہیں کہ تجارت کو قومی ہونا چاہئے یعنی منڈیوں اور نفع خیز لین دین کو دیسی باشندوں کے لئے ہی مخصوص ہونا چاہئے جہاں تک

نظریات کا تعلق ہے وہ اس شدید ضرورت کا اعلان کرتے ہیں کہ قوم کی لوٹ کھسوٹ کو قومی ملکیت بنایا جائے۔ان کی لوٹ اور غارت گری کی کامیابی عوام کے غصہ اور تشدد کو تیزی سے بیدار کرتی ہے۔اس لئے کہ یہی عوام جو بیک وقت افلاس زدہ اور آزاد ہوتے ہیں۔افریقی اور بین الاقوامی صورت حال میں جلد ہی ایک معاشرتی شعور حاصل کر لیتے ہیں اور یہ بات ان چھوٹی ذہنیت کے انفرادیت پسندوں کو بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے۔

استعمار پسندوں کی تہذیب کو خود جذب کرنے اور اس کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے دیسی دانشوروں کو اپنے بعض افکار رہن رکھنے پڑتے ہیں۔اس رہن میں نو آبادکار سرمایہ دار کے تصورات کو اپنانا بھی شامل ہے۔دیسی دانشوروں کی اس عدم صلاحیت سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ دوطرفہ بحث جاری نہیں رکھ سکتے۔وہ اس لئے کہ کسی تصور یا معروضی کے سامنے وہ اپنی ذات کو ختم نہیں کر سکتے۔اس کے برعکس جب وہ ایک بار عوام کے درمیان جنگ شروع کرتے ہیں تو انہیں بہت زیادہ تعجب اور حیرانی ہوتی ہے وہ لغوی معنوں میں عوام کے اعتماد اور ایمانداری کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔وہ خطرہ جو انہیں مسلسل پریشان رکھتا ہے یہ ہے کہ کہیں وہ غیر مشروط طور پر عوام کے ترجمان نہ بن جائیں۔وہ عوام کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی تائید میں سر ہلاتے ہیں، اور پھر اسے سوچا سمجھا فیصلہ سمجھتے ہیں۔جہاں تک فلاحین کا' بے روزگار انسانوں کا، فاقہ کرنے والے دیسیوں کا تعلق ہے، وہ صداقت کا دعویٰ نہیں کرتے۔وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ صداقت کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ خود اپنی ذات میں صداقت ہیں۔

معروضی طور پر دیکھئے تو اس دور میں دانش ور ایک عام موقع پرست نظر آتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے مفادات کے لئے ساز باز ختم نہیں کرتا۔عوام میں اس کے خیر مقدر یا ٹھکرائے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔عوام تو محض یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ سارے ذرائع آمدنی کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے۔عوام میں ان دانشوروں کی شمولیت ان کی جدوجہد کے فروغ کو تفاصیل کے ایک عجیب وغریب فکری نظام سے وابستہ کر دے گی۔اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ عوام تجزیہ کے خلاف ہوتے ہیں، بلکہ اس کے برخلاف وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے ہر چیز کی وضاحت کی جائے۔وہ دلائل کو سن کر خوش ہوتے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کس سمت جا رہے ہیں۔لیکن عوام سے رابطہ قائم ہوتے ہی دیسی دانشور تفاصیل پر بہت

زیادہ زور دینے لگتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ ساری جدوجہد کا اصل مقصد تو استعمار کی شکست ہے۔ اس جنگ کے بے شمار مختلف پہلوؤں میں گم ہو کر وہ چھوٹے موٹے مقامی کاموں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ جنہیں وہ بڑے جوش وخروش سے مگر ہمیشہ ضرورت سے زیادہ متانت کے ساتھ سرانجام دیتا ہے۔ وہ ہمہ وقت ساری کی ساری تحریک کو پیش نظر رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔ وہ اس عوامی انقلاب کے دوران میں جو ایک قسم کی نہایت خوفناک پیسنے والے اور پتھر توڑنے والی مشین ہوتا ہے، ایک خاص نظم وضبط، ایک خاص طریق کار، اور ایک خاص تقسیم کار کا تصور پیش کرتا ہے۔ چونکہ وہ محض ایک خاص محاذ پر اپنی جنگ جاری رکھتا ہے اس لئے وہ ساری تحریک کی وحدت پر نظر نہیں رکھتا... پس اگر کوئی مقامی شکست ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے شکوک میں مبتلا ہو اور پھر بالکل ہی ہمت ہار جائے اس کے برعکس عوام شروع ہی سے روٹی اور زمین کی واضح بنیادوں سے اپنی جدوجہد شروع کرتے ہیں۔ ان کا سوال یہ ہوتا ہے کہ ہم کھانے کے لئے روٹی اور رہنے کے لئے زمین کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر جس پر عوام مصر ہوتے ہیں۔ بظاہر سمٹا ہوا اور محدود معلوم ہوتا ہے، مگر بالآخر یہی سب سے زیادہ قابل قدر اور سب سے بہتر طریق کار ثابت ہوتا ہے۔

یہاں صداقت کے مسئلہ پر بھی غور وفکر لازم ہے۔ ہر عہد میں عوام کے لئے صداقت قومی تقاضوں کی میراث رہی ہے۔ کوئی مطلق حقیقت یا روحانی پاکیزگی کی کوئی بحث اس صورت حال کے منافی نہیں ہو سکتی۔ دیسی باشندے استعماراتی صورتحال کے زندہ جھوٹ کا جواب اتنے ہی بڑے جھوٹ سے دیتی ہے۔ اپنے ہم قوموں کے ساتھ ان کا رویہ بالکل واضح ہوتا ہے البتہ نوآبادکاروں سے وہ کھنچے کھنچے اور پراسرار رہتے ہیں۔ ان کے لئے صداقت وہ ہے جو استعماراتی نظام کی شکست کو تیز تر کر دے۔ صداقت وہ ہے جو مقامی باشندوں کی حفاظت کرے اور بیرونی لوگوں کو تباہ کرے۔ اس نوآبادیاتی صورت حال میں مبنی بر صداقت رویے کوئی وجود نہیں رکھتے؟ اور نیکی محض وہ ہے جو "ان" کے لئے بدی ہو۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نوآبادیاتی معاشرت کی بنیادی مانویت شکست استعمار کے دوران میں اپنی اصل صورت میں قائم رہتی ہے، یعنی یہ کہ نوآبادکار مخالف اور دشمن کی حیثیت میں ہمیشہ برقرار رہتا ہے، جسے شکست دینا مقصود ہوتا ہے۔ ظالم حکمران اپنے دائرہ کار میں ہی اس عمل کی ابتدا کرتے ہیں۔ یہ عمل حکمرانی، استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا عمل ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ سہمی سہمی اور لٹی ہوئی مخلوق ہوتی

ہے۔ جو دیسی باشندوں پر مشتمل ہوتی ہے اور جو اس عمل کے لئے حتی الامکان تحریک فراہم کرتی ہے۔ یہ عمل نوآبادیاتی بینکوں سے لے کر مادرِ وطن کے محلات اور بندرگاہوں کی گودیوں تک بلا روک ٹوک جاری رہتا ہے۔ اس پرسکون علاقے میں سمندر کی سطح ہمیشہ ہموار رہتی ہے، کھجور کے درخت ٹھنڈی ہوا میں آہستہ آہستہ ہلتے ہیں، لہریں کنکروں کو آغوش میں لیتی ہیں اور خام مواد مسلسل برآمد ہوتا رہتا ہے اور یہی نوآباد کار کے وجود کا ثبوت ہے۔ اس دوران میں دیسی باشندہ بوجھ کے تلے دہرا ہوتا جاتا ہے۔ زندہ سے زیادہ مردہ صورت میں اس کا وجود ایک نہ بدلنے والے خواب مسلسل میں مبتلا رہتا ہے۔ نوآباد کار تاریخ بناتا ہے۔ اس کی زندگی ایک عہد.... ایک آڈیسی ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسی مطلق قوت ہے جو ہر شے کی ابتدا ہے۔ ''ہم نے یہ سرزمین تخلیق کی۔'' وہ ایک لافانی سبب ہے۔ ''اگر ہم چلے جائیں تو سب کچھ ختم ہو جائے اور یہ ملک عہد متوسط میں چلا جائے۔'' اس کے برخلاف ایک بے حس مخلوق، بیماری سے تباہ حال اجداد کی رسوم و روایات کی اسیر، وہ غیر نامیاتی پس منظر بناتی ہے، جس میں نوآبادیاتی تجارت کی اختراعی قوت اپنا کام کرتی ہے۔

نوآباد کار تاریخ بناتا ہے اور اس بات کا شعور رکھتا ہے۔ اور چونکہ وہ مسلسل اپنے وطن کی تاریخ کو حوالہ دیتا ہے۔ اس لئے واضح طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بذاتہی مادرِ وطن کی تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔ پس جو تاریخ وہ لکھتا ہے وہ تاریخ اس ملک کی نہیں ہوتی جسے وہ لوٹتا ہے بلکہ وہ تاریخ اس کی اپنی قوم کی تاریخ ہوتی ہے اور اس شے کے حوالے سے ہوتی ہے جسے وہ قوم نچوڑتی ہے، جسے برباد کرتی ہے اور جسے بھوکا مارتی ہے۔

وہ بے حسی جس میں دیسی باشندے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ محض اس صورت میں چیلنج ہو سکتی ہے جب کہ وہ نوآبادیاتی تاریخ کو، لوٹ مار کی تاریخ کو، استعمار کی تاریخ کو ختم کرنے کا فیصلہ کریں۔

ایک ایسی دنیا جو درجات میں تقسیم ہے۔ ایک بے حس، مانویت کی دنیا ایک مجسموں کی دنیا... اس جنرل کا مجسمہ جس نے ملک فتح کیا، اس انجینئر کا مجسمہ جس نے پل بنائے، ایک ایسی دنیا جسے خود پر بہت اعتماد ہے، کہ وہ اپنے پتھروں سے اس پیٹھ کو کچل دیتی ہے جو پہلے سے ہی کوڑوں کا شکار ہوتی ہے.... یہی نوآبادیاتی دنیا کا نقشہ ہے۔ مقامی باشندوں کو مختلف طریقوں سے گھیرا جاتا ہے۔ نسلی امتیاز نوآبادیاتی دنیا کو درجات میں تقسیم کرنے کا محض ایک طریقہ ہے۔ وہ پہلا سبق جو دیسی باشندہ سیکھتا ہے یہ ہے کہ وہ ایک

خاص حد میں رہے، اور اپنے حدود سے تجاوز نہ کرے۔ یہی سبب ہے کہ دیسی باشندہ ہمیشہ جسمانی جرات کا خواب دیکھتا ہوں اس کے خواب عمل اور جارحیت کے مظہر ہوتے ہیں۔ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں قہقہے لگا رہا ہوں کہ میں ایک ہی جست میں دریا کو عبور کر گیا ہوں یا یہ کہ بے شمار موٹریں میرا پیچھا کر رہی ہیں جو مجھے پکڑ نہیں سکتیں نوآبادیاتی نظام کے دوران میں دیسی باشندہ نو بجے رات سے لے کر چھ بجے صبح تک کے درمیانی عرصے میں آزادی حاصل کرنے سے کبھی نہیں چوکتا۔

نوآبادیاتی باشندہ اس جارحیت کا جو اس کی ہڈیوں میں جمع ہوتی ہے، سب سے پہلے خود اپنے ہم وطنوں کے خلاف مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب نیگرو ایک دوسرے کو پیٹتے ہیں۔ پولیس اور مجسٹریٹ جب شمالی افریقہ میں جرائم کی حیرت انگیز لہروں کا سامنا کرتے ہیں تو ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ کس رخ مڑیں ہم اس بات پر بعد میں غور کریں گے کہ اس صورت حال کو کسی طور سے جانچیں۔ (4) جب دیسی باشندہ نوآبادیاتی نظام سے دو چار ہوتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مستقل طور پر اعصابی ہیجان کا شکار ہے۔ نوآبادکار کی دنیا، دشمن دنیا ہوتی ہے جو دیسی باشندے کو نچوڑ لیتی ہے تاہم یہ وہ دنیا ہوتی ہے جسے دیسی باشندہ بہ نگاہ حسد دیکھتا ہے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ دیسی باشندہ نوآبادکار کی جگہ لینے کا خواب مسلسل دیکھتا رہتا ہے۔۔۔خود نوآبادکار بننے کا نہیں بلکہ نوآبادکار کا قائم مقام بننے کا خواب۔ یہ مخاصمت اور دشمنی کی دنیا، بوجھل اور جارح دنیا، جو نوآبادیاتی عوام کو تمام امکانی درشتگی کے ساتھ اپنے لئے محفوظ رکھتی ہے، محض اس جہنم کی نمائندگی نہیں کرتی جہاں سے جلد از جلد بھاگنا ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے بلکہ یہ ایک ایسی جنت کی نمائندہ بھی ہوتی ہے جو بہت ہی قریب خوفناک کتوں کی حفاظت میں ہوتی ہے۔

مقامی باشندہ ہمیشہ بہت ہوشیار رہتا ہے۔ گو وہ بہ مشکل نوآبادیاتی دنیا کی علامتوں کو سمجھ سکتا ہے مگر وہ ہمیشہ اس تذبذب میں ہوتا ہے کہ کہیں اس نے سرحدوں کو عبور تو نہیں کیا۔ اس دنیا سے دو چار ہونے میں جس پر آبادکار حکومت کرتا ہے، دیسی باشندے ہمیشہ مجرم تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن دیسی باشندے کا جرم وہ جرم ہوتا ہے، جسے وہ خود تسلیم نہیں کرتا۔ وہ محض ایک قسم کی لعنت ہوتی ہے، ایک احساس جو ڈیموکلیس کی تلوار کی طرح ہمہ وقت اس کے سر پر لٹکتا رہتا ہے، اس لئے کہ اپنی روح کی گہرائیوں میں وہ کسی قسم کا الزام قبول نہیں کرتا۔ اس پر قابو پا لیا جاتا ہے مگر وہ سدھایا نہیں جا سکتا۔ اس کے ساتھ ادنیٰ لوگوں کا سا برتاؤ کیا

جاتا ہے مگر اسے اپنی کمتری کا یقین نہیں ہوتا۔ وہ بڑے صبر سے انتظار کرتا ہے کہ نوآبادکار ذرا غافل ہو تو وہ اس پر جھپٹ پڑے۔ وہ بڑے صبر سے اعصاب ہمیشہ تنے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خوفزدہ ہے یا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ فی الحقیقت وہ ایک لمحے کی اطلاع پر خود کو شکار کے کردار سے شکاری کے کردار میں تبدیل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ دیسی باشندہ وہ مظلوم انسان ہوتا ہے جس کا مستقل خواب یہ ہوتا ہے کہ وہ ظالم بن جائے۔ معاشرتی نظم وضبط کی تمام علامتیں... پولیس، فوجی بیرکوں میں بگل کی آواز، فوجی پریڈ اور لہراتے جھنڈے... سب بیک وقت گھٹن پیدا کرنے والے اور محرک دونوں ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ علامتیں یہ پیغام نہیں دیتیں کہ ''اپنے مقام سے ہلنے کی کوشش مت کرو'' بلکہ یہ آواز دیتی ہیں کہ ''حملہ کرنے کے لئے تیار رہو۔'' اور حقیقت یہ ہے کہ اگر دیسی باشندے میں غفلت اور بے پروائی کا رجحان پیدا ہو بھی جائے تو نوآبادکار کا غرور اور نوآبادیاتی نظام کی طاقت آزمانے کی کوشش دیسی باشندے کو ہر لحظہ یہ یاد دلاتی ہے کہ آخر عظیم مقابلے کو غیر معینہ مدت کے لئے ٹالا نہیں جا سکتا۔ نوآبادکار کی جگہ حاصل کرنے کی داخلی تحریک ہمہ وقت رگ پٹھوں کو تقویت بھی پہنچاتی رہتی ہے۔ اور یہ بات ہم جانتے ہیں کہ بعض جذباتی کیفیات میں کسی رکاوٹ کی موجودگی حرکت کی طرف میلان بڑھا دیتی ہے۔

نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندوں کا تعلق تعداد اور کمیت کا تعلق ہوتا ہے نوآبادکار تعداد کے وزن کے خلاف وحشی قوت کو استعمال کرتا ہے۔ نوآبادکار نمائش کا قائل ہوتا ہے۔ اپنی حفاظت کی ہمہ وقت تشویش کے باعث وہ دیسی باشندوں کو بہ بانگ دہل یہ جتاتا رہتا ہے کہ وہ اس سرزمین کا تنہا مالک ہے۔ نوآبادکار دیسی باشندے کے دل سے غیض وغضب کو تو زندہ رکھتا ہے۔ مگر اس جذبے کے اخراج کے ذرائع ختم کر دیتا ہے۔ دیسی باشندہ نوآبادیاتی زنجیروں کے جال میں کس لیا جاتا ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ نوآبادکار محض روحانی جمود پیدا کر سکتا ہے۔ دیسی باشندوں کا اعصابی تناؤ مسلسل خونی وارداتوں میں... قبیلہ داری جنگوں، خاندانی لڑائیوں اور انفرادی جھگڑوں میں تسکین پاتا ہے۔

جہاں تک منفرد انسانوں کا تعلق ہے نوآبادیاتی باشندوں میں عام فہم کی مکمل نفی ظاہر ہوتی ہے۔ نوآبادکار یا پولیس کے سپاہی کو تو دیسی باشندوں کے پیٹنے، ذلیل کرنے اور اپنے سامنے پیٹ کے بل رینگوانے کے سارے دن آزادی ہوتی ہے۔ مگر آپ یہ دیکھیں گے کہ ایک باشندہ دوسرے باشندے کے معمولی مخالفانہ تیور یا غصیلی نگاہ فوراً چھرا نکال لیتا ہے۔ وہ یوں کہ اس کے لئے آخری چارہ کار یہی ہے کہ

وہ اپنے بھائی کے مقابلے پر آ کر اپنی شخصیت کا تحفظ کرے۔ ان پرانی دشمنیوں کو جو ذہن میں دبی پڑی رہتی ہیں۔ قبائلی جنگیں اور زیادہ استقلال بخشتی ہیں۔ ان خاندانی جنگوں میں پوری قوت سے شامل ہو کر دیسی باشندہ خود کو یہ جتاتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام کا وجود نہیں ہے، کہ حالات ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے اور یہ کہ تاریخ کا بہاؤ مسلسل جاری ہے۔ ان قبیلہ داری تنظیموں کی سطح پر ہمیں اصل مسائل کو درگذر کرنے کا میلان واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اپنے بھائیوں کے خون میں نہانے کی سعی میں وہ اپنی راہ کی اصل رکاوٹ کو بھول جاتے ہیں اور اس انتخاب کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیتے ہیں جو انہیں بالآخر کرنا پڑتا ہے اور جس کے باعث نوآبادیاتی نظام کے خلاف جنگ کا آغاز کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ پس اجتماعی خودکشی کی یہ ٹھوس شکل ان صورتوں میں سے ایک ہے جس کے ذریعے دیسی باشندے کا اعصابی ہیجان تسکین پاتا ہے۔ عمل کے یہ نمونے خطرے کے سامنے جبلت مرگ کا اظہار اور خودکشی کی جانب ایسے میلانات ہیں جو نوآبادکار پر (جس کا وجود اور حاکمیت دیسی باشندے کے لئے ایسے اعمال اور زیادہ جائز قرار دیتا ہے) جس کا وجود اور حاکمیت دیسی باشندے کے لئے ایسے اعمال اور زیادہ جائز قرار دیتا ہے) یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لوگ عقل سلیم رکھنے والے انسان نہیں ہیں۔ اس طور سے دیسی باشندہ نوآبادکار کو نظرانداز کر دیتا ہے، قوت تقدیر میں یقین ظالم حکمران کے سر کوئی الزام نہیں آنے دیتا۔ بدقسمتی اور غربت کا سبب خدا کی ذات کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے کہ وہی کاتب تقدیر ہے۔ اس طرح فرد اس شکست و ریخت کو تسلیم کر لیتا ہے جو خدا کی جانب سے مقدم ہوتی ہے، نوآبادکار اور قسمت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اور ایک قسم کے داخلی نظم و ضبط کے ذریعے پتھریلا سکون حاصل کر لیتا ہے۔

پس اسی طور زندگی گذرتی رہتی ہے اور نوآبادیاتی باشندہ ان خوفناک کہانیوں کی طرف رجوع کرتے ہوئے جو غیر ترقی یافتہ قوموں میں بکثرت موجود ہوتی ہیں اپنی طبعی رکاوٹوں کو جن میں اس کی جارحیت بھی شامل ہوتی ہے اور زیادہ مستحکم کرتا جاتا ہے۔ جب کبھی وہ کوئی غلط اقدام کرتا ہے تو بدروحیں فوراً مداخلت کرتی ہیں۔ چیتوں اور سانپوں کی شکل اختیار کئے ہوئے آدمی، چھ ٹانگوں والے کتے، اور زدمبی.... گویا چھوٹے موٹے جانوروں اور دیوزادوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو دیسی باشندوں کے چاروں طرف ممانعتوں، باڑھوں اور رکاوٹوں کا ایک نظام تخلیق کر دیتا ہے جو نوآبادیاتی نظام سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ یہ طلسماتی بالائی ڈھانچہ جو نوآبادیاتی باشندوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ نفسانی قوت کی تحریک

میں بعض واضح فرائض سرانجام دیتا ہے غیر ترقی یافتہ معاشروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ نفسانی قوت گروہ یا خاندان کا مسئلہ ہوتی ہے۔علم الانسان کے ماہرین نے بعض معاشروں کے خصائص میں یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ اس کے تعلقات اپنی بیوی کے علاوہ کسی غیر عورت سے ہیں تو اسے کوئی شخص یہ خواب دیکھے کہ اس کے تعلقات اپنی بیوی کے علاوہ کسی غیر عورت سے ہیں تو اسے برادری کے سامنے اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور جنس یا محنت کی صورت میں اس کا جرمانہ عورت کے شوہر یا اس کے خاندان کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں ہم یہ کہتے ہیں کہ اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم معاشروں میں لاشعور کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

چونکہ داستانوں اور طلسمات کا ماحول ہمیں خوفزدہ کرتا ہے اس لئے وہ ہمیں ایسی حقیقت سے آشنا کرتا ہے جس میں تشکیک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ہمیں خوفزدہ کر کے وہ ہمیں اپنی روایت اور اپنے علاقے یا قبیلہ کی تاریخ سے ہم آہنگ کر دیتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ اتفاق کی قوت اور ایک خاص حیثیت بھی بخشتا ہے گویا یہ ایک قسم کا شناختی پروانہ ہوتا ہے۔غیر ترقی یافتہ ممالک میں پراسرار قوتوں کی دنیا پوری برادری کی دنیا ہوتی ہے جس میں مکمل طور پر طلسمات کے قوانین نافذ ہوتے ہیں۔خود کو اس پراسرار جال میں پھنسا کر جس سے نکلا نہیں جا سکتا اور جہاں ہر عمل نہایت واضح اور یقینی طور پر دہرایا جاتا ہے، ہمیں وہ دنیا ملتی ہے جو مستقل رہنے والی ہے اور اس طرح اس دنیا کی لافانیت ثابت ہوتی ہے جو ہم سب کی ہے۔ آپ یقین کریں زدمی نوآبادکاروں سے زیادہ خوفناک ہوتے ہیں اور اس لئے مسئلہ یہ نہیں ہوتا کہ نوآبادیاتی دنیا اور اس کے خاردار تاروں کے الجھاؤ سے بخیر و خوبی گذار کیا جائے بلکہ یہ کہ پیشاب کرنے، تھوکنے یا باہر جانے سے پہلے تین بار سوچا جائے۔

مافوق الفطرت اور طلسماتی قوتیں خود کو اس طرح ظاہر کرتی ہیں گویا وہ بنیادی طور پر ذاتی قوتیں ہوں۔ان کے برعکس نوآبادکار کی قوت بے انتہا سکڑی سمٹی معلوم ہوتی ہے جس پر بیرونی ماخذ کی چھاپ ہوتی ہے۔لہٰذا ہمیں ان قوتوں کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی، اس لئے کہ اصل چیز وہ خوفناک دشمن ہیں۔جنہیں داستانیں پیدا کرتی ہیں۔ہم یہ دیکھتے ہیں کہ توہمات کی سطح پر واہموں سے مستقل سابقہ سارے مسائل طے کر دیتا ہے۔

یہ ہمیشہ ہوا ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں ایسے لوگ جو پہلے توہمات کے اسیر اور ناقابل بیان خوف

وہراس کے شکار ہونے کے باوجود خواب آلود مصائب میں گرفتار رہ کر خوشی محسوس کرتے ہیں، بالاخر اپنے مقام سے ہل جاتے ہیں۔ نئے سر سے سے اپنی تنظیم کر کے خون اور آنسوؤں کے سیلاب میں فوری اور حقیقی عمل کو جنم دیتے ہیں۔ مجاہدین کو خوراک بہم پہنچانا، چوکی پہرے کا انتظام کرنا۔ ان خاندانوں کی مدد کرنا جو عام ضروریات زندگی سے بھی محروم ہوں، یا ان شوہروں کی جگہ پر کرنا جو قید ہو جائیں یا مارے جائیں، یہ ہیں وہ ٹھوس کام جنہیں جدوجہد آزادی کے دوران سرانجام دینے کے لئے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے۔

نوآبادیاتی دنیا میں دیسی باشندوں کی جذباتی حس اس کی کھال کی بالائی سطح پر ایک رستے ہوئے پھوڑے کی طرح ہوتی ہے جس میں شورے کے عمل سے زیادہ اضطراب پیدا ہو۔ ان کا نفسیاتی نظام جلد ہی سکڑ جاتا ہے، اور منتشر ہو کر جسمانی طاقت کے مظاہرے میں تسکین حاصل کرتا ہے۔ اسی باعث بہت سے ذی فہم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دیسی باشندہ ہیجانی فطرت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ حساس جذباتیت ان قوتوں کی نگہداشت کے تحت جو اس کی شخصیت کی بنیادوں سے ہمہ وقت تعلق قائم رکھتی ہیں، اس کے داخلی بحران کے پیچھے کارفرما متحرک مجنونانہ کیفیات کے اظہار کے ذریعہ اپنی تسکین حاصل کرتی ہے۔

ایک اور سطح پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دیسی باشندے کی جذباتی حس اس رقص میں جو کم وبیش وجد آفریں ہوتا ہے، خود کو ختم کر دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نوآبادیاتی دنیا کے مطالعہ میں رقص اور جنونی کیفیات کے مظاہر کو سمجھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دیسی باشندے کی تسکین اس مجنونانہ اعصابی مظاہرے سے ہوتی ہے جس کے ذریعے اس کی زبردست جارحانہ قوتیں اور اس کی طبیعت کا شدید تشدد ایک نئی راہ اختیار کرتا ہے، اپنی شکل بدل لیتا ہے اور سرح کے ذریعے خارج ہو جاتا ہے۔ رقص کا دائرہ وہ جائز دائرہ ہوتا ہے جس میں وہ محفوظ بھی اور ہر قسم کی آزادی بھی محسوس کرتا ہے۔ کسی مخصوص دن اور مخصوص وقت پر تمام مرد وعورت ایک خاص جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور وہاں پورے قبیلہ کی پر احترام نگاہوں کے سامنے وہ ایک قسم کے بہ ظاہر بے ہنگم چپ سوانگ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ فی الحقیقت ان کا یہ رقص نہایت منظم ہوتا ہے جس میں مختلف طریقوں مثلاً سروں کی جنبش، کمر کے جھکاؤ، اور جسم کے پیچھے کی سمت جھٹکے کی علامتوں کو کھلی کتاب کی طرح سمجھا جا سکتا ہے، کہ اس میں پوری قوم کا آسیب جھاڑنے، آزاد ہونے اور خود کو سمجھنے کی بے پناہ کوشش وکاوش ہوتی ہے۔ دائرے کے اندر کوئی حدود نہیں ہوتے۔ وہ پہاڑ جس پر وہ کوشش سے چڑھتے ہیں تاکہ چاند سے قریب ہو جائیں، دریا کا وہ کنارہ جہاں سے وہ دریا میں اتر کر ناچ

اور اشنان، صفائی و پاکیزگی کا تعلق ظاہر کرتے ہیں... یہ مقامات نہایت متحرم ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی حدود نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ فی الحقیقت ان کے یکجا آنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ پوری قوم کی نفسانی قوت رکی ہوئی جارحانہ قوت، کو ہ آتش فشان کے لاوے کی طرح خارج کر دیں۔ علامتی قتل، واہماتی گھوڑ سواریاں اور تخیلاتی جدال وقتال... ان سب کا اخراج ضروری ہے بدقوتوں کے بند توڑ دیئے جاتے ہیں اور وہ پگھلے ہوئے لاوے کی طرح بہہ نکلتی ہیں۔

اس سے ایک قدم اور آگے مکمل زدگی کی منزل آ جاتی ہے۔ فی الحقیقت یہ آسیب زدگی اور جھاڑ پھونک کا منظم مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس میں کونخوار بھوتوں، جنون، زدمی اور دوڈ وقبائل کے مشہور دیوتا لگبا کا آسیب شامل ہے۔ شخصیت کی یہ بے نظمی، یہ شکست وریخت، یہ سب کچھ نوآبادیاتی نظام کے جسم میں ایک بنیادی کام سرانجام دیتا ہے۔ روانہ ہوتے وقت مرد اور عورتیں بے اطمینانی کی حالت میں، اعصابی ہیجان کے تحت اپنے پیر پٹکتے جاتے ہیں۔ واپسی کے بعد پورا گاؤں پھر سے سکون ہو جاتا ہے اور ایک بار پھر بے حس وحرکت نظر آتا ہے۔

آزادی کی جدوجہد کے دوران میں اس قسم کے اعمال افعال سے نمایاں طور پر چھٹکارا پا لیا جاتا ہے۔ دیسی باشندے کی پیٹھ دیوار سے لگی ہوتی ہے اور چھری اس کے گلے پر ہوتی ہے (یا پھر زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کے آلات تناسل پر بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے ہیں) ایسی صورت میں وہ اپنے واہموں سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔ صدیوں کے واہموں اور عجیب وغریب توہمات میں لت پت رہنے کے بعد، بالآخر دیسی باشندہ اپنے ہاتھوں میں بندوق تھام کران قوتوں کے سامنے ڈٹ جاتا ہے جو اس کی زندگی سے کھیلتی رہتی ہیں... یعنی نوآبادیاتی نظام کی قوتیں... نوآبادی کا نوجوان جو گولیوں کے سائے میں پل کر جوان ہوتا ہے اپنے اجداد کے زدمیوں، دوسروالے گھوڑوں، مرے ہوئے لوگوں کی روحوں، اور ان جنوں کا جو جمائی لیتے وقت آدمی کے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں، مذاق اڑاتا ہے اور ان سے نفرت کے اظہار میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ دیسی باشندہ حقیقت کا ادراک حاصل کر لینے کے بعد اسے اپنے رسم ورواج میں، متشددانہ عمل میں، اور آزادی حاصل کرنے کی تدبیروں میں متشکل کرتا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ دیسی باشندوں کا یہ تشدد گو نوآبادیاتی نظام کے دوران میں بظاہر اوپری سطح پر نظر آتا ہے، تاہم لاحاصل ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس تشدد کا اخراج رقص اور روحوں کے آسیب

کے ذریعے ہوتے ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ خاندانی لڑائیوں کے ذریعے اسے کس طرح ختم کیا جاتا ہے۔ اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ اس تشدد کو جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے کس طرح گرفت میں لیا جائے۔ پہلے تو یہ قصہ کہانیوں سے تسکین پاتا تھا اور من حیث الجماعت خودکشی میں اپنا جوہر دکھاتا تھا۔ مگر اب نئی صورت حال میں ایک بالکل نئے طرز عمل کا امکان نظر آتا ہے۔

فی زمانہ نوآبادیات کی آزادی کے سلسلے میں تاریخی سطح پر بھی اور سیاسی تدبر کے اعتبار سے بھی بنیادی اہمیت کا ایک نظریاتی مسئلہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ کس مرحلہ پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صورت حال قومی آزادی کی تحریک شروع کرنے کے لئے مناسب ہے؟ چونکہ وہ مختلف صورتیں جن کے ذریعے نوآبادیاتی نظام کی شکست عمل میں آئی ہے مختلف پہلوؤں سے ظاہر ہوئی ہیں لہٰذا اس حالت میں عقل حتمی طور پر یہ فیصلہ کرنے میں ہچکچاتی ہے کہ کون سی صورت فی الواقعی شکست استعمار کی ہے اور کونسی محض فریب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کے لئے جو جنگ کی صورت حال میں گھرا ہوا ہے اپنے طریق کار کا فیصلہ کرنا نہایت اہم بات ہے کہ وہ کس طرح تحریک کی تنظیم کرے اور اسے آگے بڑھائے۔ اگر اس قسم کی ہم آہنگی موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کی محض اندھی خواہش ہے جس کے ساتھ خوفناک قسم کے رجعتی خطرات لگے رہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوتیں ہیں جو نوآبادیاتی نظام کی موجودگی میں نوآبادیاتی عوام کی تشدد کے اظہار کے لئے نئے مقاصد اور نئے ذرائع پیدا کرتی ہیں؟ سب سے پہلے سیاسی جماعتیں اور تاجروں اور دانشوروں کے خاص طبقے یہ کام کرتے ہیں؟ اکثر سیاسی جماعتوں کے نظام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ مجرد اصولوں کا اعلان تو کرتی ہیں مگر ٹھوس احکامات دینے سے احتراز کرتی ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے دوران میں ان قومی سیاسی جماعتوں کا سارا کارنامہ حق رائے دہندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ فلسفہ سیاست پر بے شمار رسالوں کا اجرا ہوتا ہے جس کے موضوعات عوام کا حق خودارادیت، انسانی عظمت کے حصول اور بھوک سے آزادی حاصل کرنے کا انسانی حق، وغیرہ ہوتے ہیں اور ان میں ایک آدمی ایک ووٹ کے حصول کی مسلسل تکرار کی جاتی ہے۔ قومی سیاسی جماعتیں ہتھیاروں کے ذریعے طاقت آزمائی کی ضرورت پر کبھی زور نہیں دیتیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مروج نظام کو انقلابی طور سے ختم کرنا ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ امن پسند اور قانون نواز ہوتی ہیں اور فی الحقیقت ایک نظام کی پیرو رہنما چاہتی ہیں۔ نئے نظام کے ...مگر

نوآبادکار سرمایہ دار کے سامنے وہ اپنے مطالبات واضح طور پر پیش کرتی ہیں، ان کا بنیادی مطالبہ یہ ہوتا ہے ''ہمیں زیادہ حقوق دو۔'' جہاں تک تشدد کا تعلق ہے اس سوال پر یہ خاص لوگ غیر واضح ہوتے ہیں۔ گو وہ اپنے الفاظ میں تشدد اختیار کرتے ہیں۔ مگر رجحانات میں صرف اصلاح پسند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب قومی سیاسی رہنما کوئی بات کہتے ہیں تو ان کی باتوں سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت خود ہی کچھ نہیں سوچتے۔

قومی سیاسی جماعتوں کی اس خصوصیت کی توضیح ان کے رہنماؤں کی ساخت اور پیروؤں کی نوعیت، دونوں ہی اعتبار سے کرنی چاہئے۔ قومی سیاسی جمات کی اراکین شہری ہوتے ہیں۔ ان جماعتوں کا کارندے، ابتدائی جماعتوں کے استاد، کاریگر، اور چھوٹے موٹے تاجر ہوتے ہیں جو نوآبادیاتی نظام سے فوائد حاصل کرتے ہیں، گو ان کے نفع کا ایک حصہ کٹ جاتا ہے... تاہم ان کے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں۔ ان جماعتوں کے پیرو اپنے مفادات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں... مثال کے طور پر زیادہ تنخواہیں۔ ان جماعتوں اور نوآبادیاتی نظام کے درمیان گفت و شنید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ حالات کو بہتر بنانے کے متعلق بات چیت جاری رہتی ہے مثلاً مکمل نمائندگی، پریس کی آزادی اور جماعت بندی کی آزادی۔ اس طرح اصلاحات کے متعلق مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔ پس اس بات پر متعجب نہ ہونا چاہئے کہ دیسی باشندے ایک کثیر تعداد میں ان سیاسی جماعتوں کے جوشیلے رکن ہوتے ہیں جو مادر وطن کے کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ یہ دیسی باشندے ایک مجرد نعرے کے تحت جدوجہد کرتے ہیں۔ ''حکومت مزدوروں کی ہونی چاہئے'' اور وہ اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کے اپنے ملک میں بنیادی اہمیت قومی نعروں کی ہونی چاہئے۔ دیسی دانشور اپنے داخلی تشدد کو اس خواہش کا نیم عریاں لباس پہناتا ہے کہ وہ کسی طور نوآبادیاتی نظام میں ضم ہو جائے۔ گویا وہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے۔

پس اس طرح ایک قسم کا طبقہ حقوق یافتہ غلاموں کا یا ان غلاموں کا پیدا ہو جاتا ہے جو انفرادی طور پر آزاد ہوں۔ اس صورت میں دانشور محض یہ چاہتا ہے کہ اسے ایسے آزاد انسانوں کو تعداد بڑھانے کا حق حاصل ہو اور ان آزاد شہریوں کا ایک حقیقی طبقہ منظم کرنے کا موقع ملے۔ اس کے برخلاف عوام الناس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ خاموش تماشائیوں کی حیثیت سے افراد کو اپنی کامیابیوں کے مواقع بڑھاتے ہوئے دیکھتے رہیں۔ ان کا مطالبہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ نوآبادکار کی حیثیت حاصل کریں۔ وہ تو اس کی جگہ

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دیسی باشندوں کی ایک کثیر تعداد ان کی زمینیں چاہتی ہے۔ ان کے لئے یہ مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہ نوآبادکار کے ساتھ مقابلہ کریں۔ وہ خود اس کا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

قومی جماعتیں اپنے پروپیگنڈوں میں نہایت منظّم طور پر کسانوں کو تقریباً نظر انداز کر دیتی ہیں۔ حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ نوآبادیاتی ممالک میں محض کسان ہی انقلابی ہوتے ہیں اس لئے کہ ان کے پاس کھونے کو کچھ نہیں ہوتا بلکہ تمام تر فائدے کی توقع ہوتی ہے طبقاتی نظام سے باہر، استحصال زدگان میں سب سے پہلے فاقہ کش کسان ہی یہ بات دریافت کرتا ہے کہ محض تشدد ہی فائدہ مند ہے اس کے لئے سمجھوتہ کرنے یا معاملات طے کرنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ استعمار اور شکست استعمار اس کے لئے محض یہ مفہوم رکھتے ہیں کہ کس سے اسے زیادہ قوت ملتی ہے۔ استحصال زدہ انسان یہ دیکھ لیتا ہے۔ کہ اس کی آزادی کی جدوجہد میں اس کی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال ہونا چاہئے اور سب سے پہلے قوت کا۔ جب 1956 میں موسیو گائی مولے نے الجزائر کے نوآبادکاروں کا سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور قومی آزادی کے محاذ کی جانب سے جاری کردہ مشہور اشتہار میں یہ کہا گیا کہ نوآبادیاتی نظام اپنی گرفت محض اس وقت ڈھیلی کرتا ہے جب اس کی شہ رگ پر چھری رکھ دی جائے تو کسی الجزائری نے اس شرط کو تشدد دانہ نہ گردانا۔ یوں کہ اس اشتہار میں صرف وہ کچھ کہا گیا تھا جو ہر الجزائری دل سے مانتا تھا۔ نوآبادیاتی نظام سوچنے والی مشین نہیں ہوتا نہ ہی وہ ایسا جسم ہوتا ہے جس میں دلائل کو صلاحیتیں بھی ہوں۔ یہ نہایت وحشیانہ قسم کا تشدد ہوتا ہے اور محض اس وقت گھٹنے ٹیکتا ہے جب اس کا مقابلہ زیادہ بڑے تشدد سے ہو۔

اس فیصلہ کن لمحے میں نوآبادی کا وہ سرمایہ دار طبقہ جواب تک خاموش تماشائی بنا رہتا ہے آگے بڑھتا ہے۔ وہ ایک نیا تصور پیش کرتا ہے جسے صحیح زبان میں نوآبادیاتی صورت حال کی تخلیق کہنا چاہئے اور وہ ہے عدم تشدد کا تصور۔ اپنی سب سے زیادہ سادہ شکل میں عدم تشدد کا یہ اصول نوآبادی کے دانش وروں اور تاجروں کو یہ سمجھاتا ہے کہ ان کا مفاد سرمایہ داروں کے مفاد کے مماثل ہے اور اس لئے عوام کی بہتری کے لئے یہ بات لازمی اور فوری اہمیت کی ہے کہ کسی سمجھوتے پر پہنچا جائے پیشتر اس کے کہ کوئی قابل افسوس کام ہو یا کوئی ایسا قدم اٹھے جس کی تلافی ناممکن ہو، پیشتر اس کے کہ خون بہے، عدم تشدد مخمل و بانات سے سجی ہوئی میز کے گرد بیٹھ کر نوآبادیاتی مسائل کو طے کرنے کی کوشش کا نام ہے، لیکن اگر عوام الناس اس بات کا انتظام کئے بغیر کہ مخمل و بانات س سجی ہوئی میز کے گرد کرسیاں رکھی جائیں، اپنے ضمیر کی

آوازسن کر، دست درازی شروع کر دیں اور عمارات کو نذر آتش کرنے لگیں تو تمام دانشور اور قومی متوسط طبقے کی جماعتیں نوآبادکاروں کی سمت یہ کہتی ہوئی بھاگتی نظر آئیں گی ''دیکھئے یہ بہت سنگین صورت حال ہے! خدا جانے یہ کیسے ختم ہوگی، ہمیں کوئی نہ کوئی حل دریافت کرنا چاہئے... کسی نہ کسی قسم کا سمجھوتہ۔''

سمجھوتے کا یہ تصور شکست استعمار کے مرحلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ یہ کوئی سیدھا سادا سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ اس سمجھوتے میں نوآبادیاتی نظام اور نیا قومی متوسط طبقہ دونوں شامل ہوتے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے طرف دار یہ سمجھ لیتے ہیں کہ عوام ہر چیز کو تباہ کر سکتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے پل، تباہ شدہ کھیت، جبر و تشدد اور سخت جنگ اقتصادی نظام کو درہم و برہم کر دیتی ہیں۔ سمجھوتہ قومی متوسط طبقہ کے لئے بھی نیک شگون ہوتا ہے اس لئے کہ اسے اس ابھرتے ہوئے طوفان کے امکانی نتائج کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اور وہ بجا طور پر اس بات سے خوف زدہ ہوتا ہے کہ کہیں ان عظیم طوفانی جھکڑوں میں وہ جڑوں سے نہ اکھڑ جائے۔ لہٰذا وہ نوآبادکار سے ہمیشہ یہی رٹ لگائے جاتا ہے کہ ''ہم اب بھی اس خون خرابے کو بند کر سکتے ہیں۔ عوام کو اب بھی ہم پر اعتماد ہے اور اگر آپ ہر چیز کو تہہ و بالا ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے تو فوری عمل کیجئے۔'' اس کے الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کا ماؤ ماؤ سے، دہشت پسند عناصر سے، اور خون خرابہ کرنے والوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زیاہ سے زیادہ یہ کرتے ہے کہ دہشت پسندوں اور نوآبادکاروں کے درمیان غیر مقبوضہ علاقہ میں خود کو کھڑا کر کے مصالحت کے لئے اپنی خدمات بہ رضا و رغبت پیش کرتا ہے۔ گویا یہ کہ اگر نوآبادکار ماؤ سے معاملات طے نہیں کر سکتا تو وہ خود بات چیت شروع کرنے کے لئے تیار ہے بس اس طرح قومی جدوجہد کا وہ عقبی حصہ، لوگوں کی وہ جماعت جو نوآبادکاروں سے اپنا رشتہ پوری طرح نہیں توڑتی، ایک قلابازی کے ساتھ بات چیت اور سمجھوتے کے معاملے میں پیش پیش نظر آتی ہے۔ اس کا واضح سبب یہ ہے کہ اس نے نوآبادکار حکمرانوں سے اپنا رابطہ کبھی ختم ہی نہیں کیا تھا۔

اس کے پیشتر کہ گفت وشنید شروع ہوان قومی جماعتوں کی اکثریت ''ظلم وتشدد'' کی وضاحت اور اس کے بارے میں عذر پیش کرنے میں لگ جاتی ہے۔ یہ لوگ یہ مطلق نہیں کہتے کہ عوام کو طاقت استعمال کرنی ہی پڑتی ہے اور بعض اوقات تو وہ نجی طور پر ان متشددانہ افعال کی خدمت بھی کرتے ہیں جنہیں نوآبادکاروں کے ملک کی رائے عامہ اور اخبارات بالا علان قابل نفرت قرار دیتے ہیں۔ اس انتہا سے زیادہ

قدامت پسند حکمت عملی کا جائز عذر ہر شے کو معروضی نقطہ نظر سے دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن قومی جماعتوں کے سربراہوں اور دیسی دانشوروں کا یہ روایتی رجحان فی الحقیقت ذرا بھی معروضی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ اس بات سے بالکل متفق نہیں ہوتے کہ عوام کا یہ بے اختیار تشدد ان کے مفادات کے تحفظ کا بہترین ذریعہ ہے۔ علاوہ ازیں کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو متشددانہ کارروائیوں کا بالکل غیر مؤثر گردانتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہوتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ طاقت کے ذریعے نوآبادیاتی ظلم وتشدد کا خاتمہ کرنے کی کوشش لاحاصل ہے، یہ ایک قسم کی خودکشی کے مترادف ہے، اس لئے کہ ان کے ذہنوں کے اندرونی گوشوں میں نوآبادکا ٹینک اور اس کے ہوائی جہاز ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ جب ان سے کہسے کہ ''اب عمل کا وقت ہے'' تو وہ خود پر بم برستے، توپخانے کو ہر چہار طرف سے یورش کرتے، توپوں کی گولہ باری اور پولیس کے اقدامات دیکھنے لگتے ہیں....اور خاموشی سے بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ جنگ شروع کرنے سے پہلے شکست خوردہ ہوتے ہیں۔ متشددانہ طریق کار کے ذریعہ فتح حاصل کرنے کی کوشش میں ان کی نااہلیت کو واضح طور پر بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور اپنی سیاسی چالوں میں اپنی اسی ایمان کو روا رکھتے ہیں۔ وہ اسی بچپن میں مبتلا رہتے ہیں جس کے خلاف اینگلس نے موسیوڈھرنگ سے بحث میں جو خود بچنے کا مینار تھے، اپنے مشہور دلائل دیئے!

''بالکل اسی طرح جس طرح رابنسن (کروسو) نے تلوار حاصل کی۔ ہم یہ بھی فرض کرسکتے ہیں کہ فرائڈ بھی کسی صبح کو اپنے ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لے کر نمودار ہوسکتا ہے اور پھر اسی دن سے تشدد کا سارا رشتہ بدل جائے گا۔ پھر فرائڈے حکم دے گا اور کروسو کام کرے گا...اس طرح پستول تلوار پر فتحیاب ہو جاتا ہے اور مفروضوں پر ایمان لانے والا نہایت سادہ لوح شخص بھی بلا کسی شبہ کے اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ تشدد محض قوت ارادی کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اپنا مقصد حاصل کرنیکے لئے اسے بعض ٹھوس بنیادی شرائط کو موجودگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور سے تشدد کے اوزاروں پر سبقت لے جائیں گے۔ مزید برآں ایسے اوزاروں کو پیدا کرنے کی صلاحیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ زیادہ ترقی یافتہ اوزار پیدا کرنے والا، روزمرہ کی زبان میں ہتھیار بنانے والا، قدیم طرز کے ہتھیار بنانے والے پر فتحیاب ہوگا۔ مختصراً یہ کہ تشدد کی فتحیابی کا انحصار ہتھیار بنانے پر ہے اور اس بات کا انحصار عام پیداوار پر ہے۔ پس....معاشی قوت پر، حکومت کی اقتصادی حالت پر، اور بالاخر ان معاشی ذرائع پر جنہیں تشدد استعمال کرسکتا ہے۔''(5)

فی الحقیقت اصلاح پسند رہنماؤں کے پاس یہ کہنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ''تم آخر آباد کاروں سے کس طرح برتے پر جنگ کرنے چلے ہو؟ کیا اپنے چاقوؤں سے جنگ کرو گے؟ یا اپنی معمولی بندوقوں سے لڑو گے؟۔''

یہ سچ ہے کہ جب تشدد اپنا عمل شروع کرتا ہے تو یہ ہتھیار اہم ہو جاتے ہیں کیونکہ بالاخر سب کچھ نہیں انہیں ہتھیاروں کی تقسیم پر منحصر ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ نوآبادیاتی ممالک اپنی کی آزادیاں اس موضوع پر نئی روشنی ڈالتی ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ہسپانوی جنگوں کے دوران میں، جو یقیناً صحیح معنوں میں نوآبادیاتی جنگ تھی، 1810 کے موسم بہار کے حملے میں، چار لاکھ فوج کی کثرت کے باوجود، نپولین کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ تاہم فرانسیسی فوجوں نے اپنے جنگی ہتھیاروں، سپاہیوں کی شجاعت اور فوجی سربراہوں کی جنگی استعداد کے باعث سارے یورپ کو لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ نپولین کی عظیم فوجی قوت کے مقابلے میں، ہسپانیوں نے غیر متزلزل جذبہ قومی سے سرشار ہو کر گوریلا طریق جنگ کو ایک بار پھر اپنایا جسے پچیس برس پہلے امریکی فوجی سپاہیوں نے انگریزی فوج کے مقابلہ میں استعمال کیا تھا۔ لیکن دیسیوں کی گوریلا جنگ کے کوئی معنی استعماری تشدد کے مقابلے میں نہیں ہوں گے۔ جب تک کہ یہ بین الاقوامی صورت حال میں اجارے داریوں اور تجارتی مفادات قائم کرنے کی جدوجہد میں ایک نیا عنصر بن کر نہ ابھرے۔

نوآبادکاری کے اولین دور میں محض ایک فوجی دستہ ہی بڑے بڑے ملکوں پر قبضہ کر سکتا تھا.... کانگو، نائجیریا، ائیوری کوسٹ وغیرہ۔ لیکن آج نوآبادیاتی ممالک کی قومی جدوجہد ایک نئی بین الاقوامی صورت حال میں نمایاں ہوتی ہے۔ شروع شروع میں سرمایہ دارانہ نظام نوآبادیات کو خام مال کا منبع سمجھتا تھا جنہیں اشیائے تجارت میں تبدیل کر کے یورپی منڈیوں میں فروخت کیا جا سکتا تھا۔ سرمایہ کاری کے ایک رخ کی تکمیل کے بعد، سرمایہ دارانہ نظام نے آج تجارتی نفع اندوزی کے تصور میں ترمیم کر لی ہے۔ اب خود نوآبادیات منڈی بن چکی ہیں۔ نوآبادیاتی آبادی اب خریدار بن کر سامان تجارت خریدنے کو تیار ہے۔ پس نتیجہ کے طور پر اگر فوجوں کو مستقلاً بڑھاتے رہنا ضروری ہے اور اگر خرید و فروخت میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے یعنی یہ کہ اگر پختہ مال کی برآمد نہیں ہوتی تو یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ فوجی قوت سے مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔ غلامی کی بنیادوں پر اندھا اقتدار نوآبادکار ملک کے سرمایہ دار کے لئے معاشی طور پر سازگار

نہیں ہے اس سرمایہ دار طبقہ کا اجارے دار ایسی حکومت کی تائید نہیں کرتا جس کی حکمت عملی محض تلوار کے زور پر حکومت کرنا ہو۔ نوآبادکار ممالک کے مل مالک اور سرمایہ دار اپنی حکومت سے جس بات کی توقع رکھتے ہیں وہ یہ نہیں ہے کہ وہ نوآبادیاتی لوگوں کو تباہ کرے بلکہ یہ ہے کہ وہ اقتصادی قوانین کی مدد سے ان کے ''جائز مفادات'' کی حفاظت کرے۔

اس طور سے سرمایہ داری اوران قوتوں کے درمیان، جن سے نوآبادیات میں تشدد جنم لیتا ہے، ایک قسم کے تجریدی سازش کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ مزید برآں آج دیسی باشندہ ظلم کے مقابلے میں تنہا نہیں ہے اس لئے کہ اسے ترقی پسند ممالک اور عوام کی سیاسی اور سفارتی مدد بھی حاصل ہے۔ لیکن سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ مقابلہ جاری ہے یعنی وہ بے رحمی کی جنگ جو مختلف سرمایہ دار گروہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک برلن کانفرنس منعقد ہوئی اور اس نے افریقہ کے ٹکڑے کر دیئے اور اسے تین یا چار استعماری قوتوں کے جھنڈوں کے تحت تقسیم کر دیا۔ آج کی صورت حال میں یہ بات اہم نہیں ہے کہ افریقہ کا کوئی مخصوص علاقہ فرانس یا بلجیم کی حکومت میں شامل ہے بلکہ یہ کہ انہیں کے اقتصادی استحصال کے مختلف حلقے ابھی تک قائم ہیں اور تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آج متشددانہ جنگیں کسی باغی سلطان کے خلاف نہیں لڑی جاتیں۔ آج ہر چیز میں زیادہ نفاست پسندی آ گئی ہے اور خون خرابے سے گریز کیا جاتا ہے۔ آج اگر کاسترو کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو امن وشائستگی کے ساتھ ہوگا۔ آج وہ گنی کو تباہ کرنے کی ہر کوشش کرتے ہیں اور مصدق کو ختم کر دیتے ہیں۔ پس قومی جماعتوں کے سربراہ جو تشدد سے خوفزدہ ہو کر یہ سوچتے ہیں کہ استعماری قوت ''ہم سب کو تباہ کر دے گی''، غلطی پر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فوج ٹین کے سپاہیوں کا کھیل دکھاتی رہے گی جو نوآبادی کی فتح کے وقت سے ہو رہا ہے لیکن سرمایہ کی طاقت جلد ہی انہیں حقیقت سے آشنا کر دے گی۔

یہی سبب ہے کہ معقولیت پسند قومی سیاسی جماعتوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے مطالبات نہایت واضح انداز میں پیش کریں اور اپنے نوآبادکار حریفوں کے ساتھ بہت سکون انداز میں بلا جذباتی ہو کے مسائل کا ایسا حل تلاش کریں جو دونوں کے مفادات کے مطابق ہو۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ قومی اصلاحی ذہنیت جو بسا اوقات نقلی قسم کی ٹریڈ یونین دکھائی دیتی ہے جب کبھی بروئے کار آتی ہے تو ہمیشہ نہایت پر امن صورت اختیار کرتی ہے، مثلاً شہر کی چند ملوں میں کام بند کر دینا، یا رہنماؤں کی خوشنودی کے لئے عوامی مظاہرے کرنا یا پھر بسوں یا درآمدی مال کا بائیکاٹ کرنا۔ اس قسم کی تحریکیں بیک وقت دونوں کام کرتی ہیں،

استعماری قوتوں پر دباؤں بھی ڈالتی ہیں اور ساتھ ہی لوگوں کی توانائی کے اخراج کا موقع بھی بہم پہنچاتی ہیں۔ بیہوشی کے ذریعہ علاج کا یہ عمل، نیند کے ذریعے عوام کے علاج کا یہ طریقہ، بعض اوقات کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ پس مخمل سے سجی ہوئی میز کی کانفرنس کا نتیجہ وہ سیاسی انتخابیت ہوتی ہو جو گاباں ریپبلک کے صدر موسیو مابا سے (ایک سرکاری دورے پر پیرس میں آمد پر) تمام تر سنجیدگی سے یہ کہلواتی ہے: ''گاباں آزاد ہو چکا ہے مگر گاباں اور فرانس کے درمیان کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہو رہا ہے۔'' فی الحقیقت تبدیلی محض اتنی ہوئی ہے کہ اب موسیو ماباگاں ریپبلک کے صدر ہیں اور فرانسیسی ریپبلک کے صدر انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔

مقامی باشندوں کو پرسکون رکھنے کے عمل میں نوآبادیاتی سرمایہ داروں کی امداد مذہب کی جانب سے بھی ہوتی ہے۔ ان تمام ولیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے اپنا دوسرا گال پیش کیا ہے، اپنے خلاف ہر جرم کو معاف کر دیا ہے اور جو ظلم سہنے اور دھتکارے جانے کے باوجود ثابت قدم رہتے ہیں، اور انہیں نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف نوآبادیاتی دانشور، نوآزاد غلام تحریک کی سربراہی میں بالآخر ایک اور کشمکش کو جنم دیتے ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں کی غلامی کو آقاؤں کو شرمندہ کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں یا پھر ان ظالموں کے اقتصادی حریفوں کے لئے ایک عجیب قسم کی انسان دوستی پر مبنی نظریاتی حکمتِ عملی کی تشکیل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دو متذکرہ غلاموں کو صحیح معنی میں متاثر نہیں کرتے ہیں۔ وہ انہیں ٹھوس طریقے پر کبھی متحرک نہیں کرتے۔ اس کے برعکس فیصلہ کن لمحے پر (گوان کے اپنے نقطہ نظر سے یہ تذبذب کا لمحہ ہوتا ہے) وہ عوامی تحریک کے خطرے کا علم بلند کرتے ہیں اور ان کے نزدیک یہی وہ فیصلہ کن ہتھیار ہوتا ہے جو کسی طلسماتی قوت سے ''استعماری حکومت کا خاتمہ'' کر دے گا۔ ظاہر ہے سیاسی جماعتوں میں اور ان کے سربراہوں میں بعض ایسے انقلابی بھی ہوتے ہیں جو قومی آزادی کے اس تماشے سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ لیکن جلد ہی یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے سوالات، ان کی قوت عمل اور ان کا غم وغصہ جماعت کی کارکردگی میں رخنہ اندازی کرنے لگتا ہے۔ اور پھر ایسے عناصر بتدریج جماعت میں تنہا ہوتے جاتے ہیں اور اس طرح نہایت آسانی سے نکال باہر کئے جاتے ہیں۔ اس لمحے پر، جیسے کہ متضاد قوتوں میں کوئی سمجھوتہ ہوا ن لوگوں پر نوآبادیاتی پولیس چھاپہ مارتی ہے۔ شہروں میں خود کو محفوظ نہ سمجھتے ہوئے، سابقہ جماعت کے پرجوش اراکین کے کترانے اور سربراہوں کے ٹھکرانے کے سبب، یہ ناپسندیدہ

شعلہ بجاں لوگ دیہاتوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اس موقع پر یہ لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوتے یں کہ کسان بلا تاخیر ان سے وہ سوال کرتے ہیں جس کے جواب کے لئے وہ پہلے سے تیار نہیں ہوتے۔ ''ہم اپنا کام کب شرع کریں؟''

شہر سے آنے والے انقلابیوں اور کسانوں کے میل ملاپ کا ذکر بعد میں ہوگا۔ اس وقت ہمیں سیاسی جماعتوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ ان کے عمل میں ماہیت کا اندازہ ہو سکے جو بہر حال ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ اپنی تقریروں میں سیاسی لیڈر قوم کو ایک نام دیتے ہیں، اور اسی طور سے دیسی باشندوں کے مطالبات کی تشکیل ہوتی ہے۔

تاہم ان کے پاس نہ تو کوئی واضح موضوع ہوتا ہے اور نہ کوئی سیاسی لائحہ عمل۔ محض ایک مبہم سا خاکہ یا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی نوعیت قومی ہوتی ہے جسے ہم ''کم سے کم مطالبات'' کا نام دیتے ہیں۔ وہ سیاست دان جو تقریریں کرتے ہیں اور جو قومی اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں لوگوں کو خواب دکھاتے ہیں۔ یوں تو وہ حکومت کا تختہ الٹنے سے گریز کرتے ہیں مگر وہ قارئین اوسامعین کے شعور میں اس کے لئے زبردست جوش وخروش پیدا کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات قومی یا قبائلی زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ اس موقع پر بھی خوابوں کو تحریک ملتی ہے اور قوت متخیلہ نوآبادیاتی نظام کے حدود سے باہر پرواز کرنے لگتی ہے۔ بعض اوقات یہ سیاست دان ''ہم نیگرو، ہم عرب'' کی زبان بھی بولتے ہیں اور یہ اصطلاحیں جو بہت زیادہ متضاد ہوتی ہیں نوآبادیاتی عہد میں رفتہ رفتہ بڑا پاکیزہ مفہوم حاصل کر لیتی ہیں۔ یون قومی سربراہ فی الحقیقت آگ سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک افریقی رہنما کے بقول جس نے حال ہی میں سربراہ فی الحقیقت آگ سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک افریقی رہنما کے بقول جس نے حال ہی میں نوجوان دانشوروں کے ایک گروہ کو یہ مشورہ دیا کہ ''عوام سے گفتگو کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو اس لئے کہ وہ بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔'' یہ ان خوفناک کھیلوں میں سے ایک کھیل ہے جو تقدیر نوآبادیات میں کھیلتی رہتی ہے۔

جب کوئی سیاسی رہنما کوئی عام جلسہ بلاتا ہے تو یہ لگتا ہے گویا فضا خون آشام ہو... لیکن یہی رہنما سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ وہ طاقت کا ''مظاہرہ'' تو کرے مگر اس طرح کہ اسے استعمال کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ تاہم اس طور سے پیدا شدہ بے چینی، آنا جانا، تقریریں سننا، لوگوں کو یکجا

اوران کے چاروں سمت پولیس کو دیکھنا، فوجی مظاہرے، گرفتاریاں اور رہنماؤں کی جلاوطنی... یہ تمام ہنگامہ لوگوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اب عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس انتشاری دور میں سیاسی جماعتیں بائیں جانب امن وسکون کی اپیلوں میں اضافہ کرتی جاتی ہیں اور داہنی جانب ان کی نگاہیں افق پر جمی رہتی ہیں تا کہ استعمار کے ''آزاد خیال'' ارادوں کا پتہ مل سکے۔

اسی طور لوگ معاشرتی زندگی کے بعض واقعات کو اپنے انقلابی جوش وخروش کو زندہ اور خود کو بالکل تیار رکھنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ڈاکو جو ایک مدت سے پیچھے لگی ہوئی پولیس کا مقابلہ کرتا ہے یا وہ جو لڑتے ہوئے چار پانچ پولیس والوں کو مار کر مارا جاتا ہے یا وہ جو اس لئے خودکشی کر لیتا ہے کہ کہیں ساتھیوں کا نام نہ بتانا پڑے... اس قسم کے لوگ عوام کے لئے مشعل راہ بنتے ہیں اور عمل کا نمونہ پیش کر کے ہیرو بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں یہ بتانا کہ فلاں ہیرو چور، بدمعاش اور اوباش ہے، تضیع اوقات ہے۔ اگر ایسا شخص نوآبادیاتی منتظمین کی جانب سے اس لئے موجب سزا ہوتا ہے کہ اس کا جرم محض نوآبادکار اشخاص یا نوآبادکاروں کی ملکیت کے خلاف ہے تو جرم کی حد بندی کی یہ لکیر واضح اور معین ہوتی ہے۔ اس طور مماثلت خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہے۔

مواد کے اس طرح پکتے رہنے کی صورت حال میں نوآبادی کی فتح کے وقت کی مزاحمت کی تاریخ کے رول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ نوآبادیاتی باشندوں میں عظیم شخصیتیں ہمیشہ وہی سمجھی جاتی ہیں جنہوں نے حملہ آوروں کے خلاف قومی مزاحمت کی تحریک کی رہنمائی کی ہوتی ہے۔ بہانزن، سوندیاتا، سموری، عبد القادر.... ان سب کی یادیں انقلابی تحریک شروع ہونے سے پہلے کے زمانے میں عجیب وغریب شدت کے ساتھ دوبارہ زندہ ہو جاتی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ لوگ آگے بڑھنے کے لئے دوبارہ تیار ہونے لگے ہیں تا کہ اس جامد دور کا خاتمہ کریں جو استعماریت سے شروع ہوتا ہے اور یوں ایک نئی تاریخ بنائیں۔

ایک نئی قومیت کے ابھرنے اور استعماری نظام کی شکست کے دو اسباب ہوتے ہیں۔ یا تو عوام کی اپنے طور پر تشدد آمیز جدوجہد یا پھر گردوپیش کے نوآبادیاتی باشندوں کی حرکات جو اس نوآبادیاتی حکومت میں رخنہ ڈالتی ہے۔

نوآبادیاتی عوام تنہا نہیں ہوتے۔ استعمار خواہ کچھ بھی کرے، نوآبادیات کی سرحدیں نئے خیالات

اور بیرونی دنیا کے واقعات کی گونج کے لئے ہمیشہ کھلی ہوتی ہیں۔ وہ یہ جان لیتے ہیں کہ فضا میں تشدد موجود ہے، اور یہاں وہاں یہ ابھر بھی پڑتا ہے اور یہاں وہاں استعماراتی حکومتوں کو اڑا بھی دیتا ہے... یہ وہی تشدد ہوتا ہے جو دیسی باشندوں کے مقاصد کے لئے محض اطلاع کی سطح پر نہیں بلکہ عملی سطح پر اپنا رول ادا کرتا ہے۔ ڈین بیئن پھو کے مقام پر ویت نامیوں کی شاندار فتح، ایک لحاظ سے دیکھئے تو محض ویت نامیوں کی فتح نہیں رہ جاتی۔ جولائی 1954 کے بعد سے نوآبادیاتی عوام جو سوال خود سے کرتے ہیں وہ یہ ہے۔ ''دوسرا ڈین بیئن پھولانے کے لئے اب کیا کیا جائے؟ ہم اس کا انتظام کیسے کر سکتے ہیں۔'' نوآبادیاتی نظام کا ایک فرد بھی ڈین بیئن پھو کے امکان پر شک نہیں کرتا۔ ان کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ اپنی طاقت کو بہتر سے بہتر طور پر کس طرح استعمال کیا جائے۔ لوگوں کو کیسے منظّم کیا جائے اور انہیں میدان عمل میں کب لایا جائے۔ گردوپیش کا یہ تشدد محض نوآبادیاتی عوام ہی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ یہ استعمار پسندوں کے رجحانات میں بھی ترمیم کرتا ہے جو اب بہت سے ڈین بیئن پھو کے امکانات سے واقف ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ استعمار پسند حکومتوں میں سنسنی پھیل جاتی ہے۔ اب ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سبقت حاصل کریں، آزادی کی تحریک کو داہنے بازو کی طرف موڑ دیں اور عوام سے ہتھیار چھین لیں۔ بلا تاخیر نوآبادیاتی نظام کو ختم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ کانگو میں استعماری نظام ختم ہونا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ایک دوسرا الجزائر بن جائے۔ سارے افریقہ میں آئینی نظام کے لئے بل پاس کرو، فرانسیسی دولت مشترکہ قائم کرو، اس دولت مشترکہ کو نئے سرے سے منظّم کرو، مگر خدا کے واسطے استعماری نظام کو جلد ختم کرو.... اور شکست استعمار کا کام اس سرعت کے ساتھ ہونے لگتا ہے کہ ہوفو بوامگنی پر آزادی ٹھونس دی جاتی ہے۔ نوآبادیاتی عوام کے ڈین بیئن پھو کے جواب میں استعمار پسند گھیرا ڈالنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں جس کی بنیاد ریاستوں کی فرمانروائی کے حق کو تسلیم کرنے پر ہوتی ہے۔

لیکن فی الحال ہمیں تشدد کی طرف واپس آنا چاہئے۔ اس تشدد کی طرف جو کھال کے نیچے سے پھوٹنے کو تیار ہوتا ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اس تشدد کے پکنے کے عمل میں اسے تابع کرنے اور خارج کرنے کے لئے بہت سی کوششیں ہوتی ہیں۔ تاہم اس کے باوجود کہ نوآبادیاتی حکومت اس تشدد کو علاقائی اور قبائلی لڑائیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ تشدد بڑھتا رہتا ہے اور دیسی باشندہ اپنے دشمنوں کی شناخت کر لیتا ہے اور اپنے تمام تر مصائب کو جان لیتا ہے اور اپنی نفرت اور غصہ کی مشتعل قوت

اس نئے راستہ پر لگا دیتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ وہ تشدد کی فضا سے متشددانہ عمل کی سمت کیسے بڑھتا ہے۔ تشدد کا بند ڈھکنا کیسے کھل جاتا ہے؟ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنے ارتقا میں یہ عمل نوآبادکار کی خوش وخرم زندگی کو پرسکون نہیں رہنے دیتا۔نوآبادکار کو جو دیسی باشندوں کو ''خوب سمجھتا ہے'' ہوا میں اڑتے ہوئے چند تنکوں سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔''اچھے'' دیسی ناپید ہوجاتے ہیں۔ظالم کی آمد پر ہر سمت سکوت چھا جاتا ہے۔اکثر اوقات نگاہیں بدل جاتی ہیں اور برتاؤ اور فقرے نمایاں طور پر سخت ہوجاتے ہیں۔قومی سیاسی جماعتوں میں حرکت آجاتی ہے۔ان کے جلسوں کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے۔پولیس کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے اور فوج زیادہ بلالی جاتی ہے۔نوآبادکار، بالخصوص وہ زمیندار جو نوآبادی میں تنہا ہوجاتے ہیں، سب سے پہلے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔وہ مئوثر کارروائی کا تقاضہ کرنے لگتے ہیں، حکومت فی الواقعی بعض نمایاں اقدام کرتی ہے۔دو چار رہنما گرفتار ہوجاتے ہیں۔فوجی پیریدیں، عسکری کرتب، اور ہوائی جہازوں کے مظاہرے ہوتے ہیں۔لیکن یہ مظاہرے اور جنگی مشقیں، بارود کی بو جو ساری فضا میں بھر جاتی ہے۔یہ تمام چیزیں لوگوں کو پیچھے نہیں ہٹا سکتیں۔بندوقیں اور توپیں محض ان کے غصے میں اضافہ کرتی ہیں۔ساری فضا ڈرامائی ہوجاتی ہے اور ہر شخص یہ جتانا چاہتا ہے کہ وہ کسی بھی کام کے لئے تیار ہے۔اور یہی وہ حالات ہوتے ہیں جن میں بندوقیں خودبخود چلنے لگتی ہیں اور اس لئے کہ رگیں جھنجھناتی رہتی ہیں، خوف وہراس پھیلا ہوتا ہے اور ہر شخص بندوق کی لبلی کے سہارے خوش نظر آتا ہے۔کوئی نہایت معمول سانحہ گولہ باری کے لئے کافی ہوتا ہے۔مثلاً الجزائر میں سیتف مراتش میں سنٹرل کوار یز، اور مڈغاسکر میں مورامانگا۔

کچلنے اور دبانے کی تمام کارروائیاں بجائے اس کے قومی شعور کے فروغ کو روکیں اس کے لئے محرک ثابت ہوتی ہے، اس لئے کہ مقبرے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ظالم ومظلوم کے درمیان ہر بات کا فیصلہ محض قوت سے ہی ممکن ہے۔یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ سیاسی جماعتیں نہ تو بغاوت کی دعوت دیتی ہیں اور نہ اس کی تیاری کرتی ہیں۔تعزیراتی کارروائیوں اور ان تمام اعمال میں جو خوف کا نتیجہ ہوتے ہیں، رہنماؤں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔وہ تو محض واقعات کی زد میں آجاتے ہیں، اس لمحہ میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ استعمار قومی رہنماؤں کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کرلے۔لیکن آج نوآبادیاتی حکومتیں یہ بات اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ عوام کو ان کے رہنماؤں سے محروم کرنا کتنا خطرناک کام ہے۔اس لئے کہ

ایسے موقع پر عوام بے لگام ہو کر ''غدر'' مچانے اور ''وحشیانہ قتل عام'' میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ عوام ''خون کی پیاسی جبلتوں'' کی لگام ڈھیلی کر دیتے ہیں اور اس طرح استعمار کو ان اپنے رہنماؤں کی رہائی پر مجبور کرتے ہیں اور پھر ان رہنماؤں کے ذمے یہ سخت کام ہوتا ہے کہ وہ انہیں نظم وضبط کی راہ پر لائیں۔ نوآبادیات کے عوام جو یک بیک اپنے تشدد کو نوآبادیاتی نظام کی تباہی کے عظیم کام پر لگاتے ہیں۔ بہت جلد خود کو ایک بنجر اور جامد نعرے کے سپرد کر دیتے ہیں کہ مکبر یا زید کو رہا کرو۔''(2) یوں استعمار انہیں رہا کر دیتا ہے اور ان سے گفت وشنید شروع ہوتی ہے اب سڑکوں پر رقص کرنے کا وقت آ جاتا ہے۔

بعض حالات میں قومی سیاسی جماعت کی تنظیم قائم رہتی ہے مگر نوآبادیاتی نظام کے دباؤ اور عوام کے اچانک ردعمل کے باعث ان جماعتوں کے پرجوش کارکن جماعت کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ عوام کے تشدد کے مقابلے میں استعمار کی فوجیں مورچے سنبھالتی ہیں اور صورتحال بہت خراب ہو کر فیصلہ کن لمحے میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ سربراہ جو آزادہ ہوتے ہیں۔ ایک طرف رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اپنی نوکر شاہی اور متوازن مطالبوں کے ساتھ یک بیک بے معنی اور فضول نظر آنے لگتے ہیں۔ تاہم ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ یہ کہ یہ ''خاموش قوم'' کے نام پر بولتے ہیں۔ بالعموم استعمار انہیں خدا کی رحمت سمجھتے ہوئے گلے لگاتا ہے اور فوراً اس شرط پر آزادی دینے کو تیار ہو جاتا ہے کہ وہ امن وامان بحال کر دیں۔

پس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام سیاسی جماعتیں اس تشدد کی قوت سے آگاہ ہوتی ہیں۔ مگر ان کے سامنے یہ سوال ہمیشہ نہیں ہوتا کہ اس تشدد کا جواب زیادہ بڑے تشدد سے دیا جائے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ کس طور سے کشیدگی کو کم کیا جائے۔

اس تشدد کی اصل ماہیت کیا ہے؟ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ نوآبادیاتی عوام یہ بات وجدانی طور پر جان لیتے ہیں کہ انہیں آزادی محض تشدد کے ذریعے ہی حاصل ہونی چاہئے اور ہو سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ روحانی گڑبڑ کس قسم کی ہوتی ہے کہ یہ فاقہ زدہ اور کمزور لوگ، بلا کسی طریق کار کے، استعمار کی فوجی اور اقتصادی قوت کے مقابلے میں اس بات پر ایمان لے آتے ہیں کہ محض تشدد ہی انہیں آزادی دلا سکتا ہے؟ آخر وہ فتح کی امید ہی کس برتے پر کرتے ہیں؟۔

یہ اس طرح ہوتا ہے کہ تشدد (جو بہت ہی ذلیل شے ہے) کسی سیاسی جماعت کے نظام کا جز ہونے کی حیثیت سے اس جماعت کا نعرہ بن جاتا ہے۔ یوں رہنما عوام کو جنگ وجدل پر بھی ابھار سکتے ہیں۔

تاہم یہ مسئلہ غور طلب ہے۔ جب جنگجو جرمنی اپنی سرحدوں کے تنازع کو طاقت سے طے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا، مگر جب انگولا کے عوام ہتھیار سنبھالنے کا فیصلہ کرتے ہیں یا الجزائر کے عوام ان تمام ذرائع کو رد کر دیتے ہیں جو متشددانہ نہ ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ ہوا ہے یا فوری طور پر ہونے والا ہے۔ نو آبادیاتی اقوام، زمانہ حال کے غلام، بہت بے صبر ہوتے ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ ظاہرہ حماقت ہی انہیں نو آبادیاتی مظالم سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس طرح دنیا میں نئے رابطے پیدا ہوتے ہیں۔ غیر ترقی یافتہ ممالک اپنی زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں اور غیر معمولی بات یہ ہے کہ وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اسپٹنک کے زمانے میں فاقہ کی موت مرنا مضحکہ خیز بات ہے لیکن نو آبادیاتی عوام کے دلائل زیادہ ٹھوس حقیقتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آج ایسی نو آبادیاتی حکومت نہیں ہے جو کسی ایسے مقابلے کے لئے تیار ہو جس میں کامیابی نظر آتی ہے یعنی اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ایک بڑی مدت تک بہت بڑی فوج کو قائم رکھنا۔

جہاں تک استعماری ممالک کی داخلی صورت حال کا تعلق ہے وہ اپنے تضادات سے دو چار رہتے ہیں۔ مزدور طبقہ حقوق مانگتا ہے اور اس کے لئے انہیں پولیس کی طاقت استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں آج کی بین الاقوامی صورتحال میں ان ممالک کو اپنی حکومت کے دفاع کے لئے بھی اپنی فوجوں کی ضرورت ہوتی ہے اور سب سے آخر میں وہ داستانیں جو آزادی کو تحریکات کے بارے میں مشہور ہیں۔ جنہیں ماسکو سے منظم کیا جاتا ہے۔ استعمار کی پر تشویش منطق یہ ہوتی ہے کہ ''اگر یہی کچھ ہوتا رہا تو خطرہ یہ ہے کہ کمیونسٹ اس تمام گڑبڑ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان علاقوں میں گھس آئیں گے۔''

دیسی باشندوں کی آرزوؤں کے درمیان یہ حقیقت کہ وہ بالاعلان قوت استعمال کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ عصر حاضر کی صورت حال کی غیر معمولی نوعیت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہ وہ اس صورت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ تاہم فوری تجربے کی سطح پر، وہ دیسی باشندے جنہوں نے جدید دنیا کو اپنی سرزمین کے ہر کونے میں پھیلتے دیکھا ہے۔ اس بات کا شدید احساس رکھتے ہیں کہ ان کے پاس سب کچھ نہیں ہے۔ عوام ایک قسم کی (اگر یہ کہنا مناسب ہو) طفلانہ منطق سے خود کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ ان سے وہ تمام چیزیں چھین لی گئی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بعض پسماندہ ملکوں میں عوام بہت تیزی سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور بالاخر آزادی کے دو یا تین برس بعد اس حقیقت کا

ادراک کرتے ہیں کہ انہیں مایوسی کا شکار ہونا پڑا ہے، یہ کہ یہ سب لائق نہ تھا'' کہ اس کے لئے جنگ کی جائے اور یہ کہ فی الحقیقت کچھ تبدیل نہیں ہوا۔

1789 کے متوسط طبقے کے انقلاب کے بعد فرانس کے چھوٹے سے چھوٹے کاشت کار نے اس عظیم تغیر سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ لیکن یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ زیادہ تر صورتوں میں پسماندہ ممالک کی پچانوے 95 فیصد آبادی کے لئے آزادی کوئی تبدیلی نہیں لاتی۔ کوئی بھی ذی فہم شاہد پردے کے پیچھے بے اطمینانی کے وجود کا مشاہدہ کر سکتا ہے، بالکل اس طرح جیسے کسی جلے ہوئے مکان کی راکھ سے آگ بجھنے کے بعد بھی دھواں اٹھ رہا ہو اور اس بات کا ہر لحظہ امکان ہو کہ اس میں دوبارہ آگ بھڑک سکتی ہے۔

استعمار یہ شکایت کرتا ہے کہ دیسی باشندے جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ یہاں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ محض کچھ ہی عرصہ پہلے ان کی شکایت دیسی باشندوں کی سستی، ان کی کاہلی اور ان کی مقدر پرستی کے بارے میں ہوتی تھی۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں جو تشدد مخصوص طریقوں سے بروئے کار آیا وہ قومی جھنڈا لہرانے کی رسم کے بعد، سحر کارانہ انداز میں یک بیک ختم نہیں ہوتا۔ اس کے ختم ہونے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں اس لئے کہ قومی تعمیر نو کا کام اس ڈھانچے میں جاری رہتا ہے جس میں اشتمالیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے سے ''گردن توڑ'' مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ مقابلہ بالکل مقامی مطالبات کو بھی آفاقی وسعتیں بخش دیتا ہے۔ ہر جلسہ، دبانے کچلنے کا ہر عمل، بین الاقوامی اکھاڑے میں منعکس ہوتا ہے۔ شارپ ول کے قتل نے مہینوں رائے عامہ کو جھنجھوڑے رکھا۔ اخبارات کے کالموں اور نجی گفتگو میں شارپ ول ایک علامت کا درجہ رکھتا ہے۔ شارپ ول کی بدولت ہی دنیا کو سب سے پہلے جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے مسئلہ سے آگاہی ہوئی۔ علاوہ ازیں ہم اس بات پر یقین نہیں کر سکتے کہ پسماندہ علاقوں کے معمولی معاملات میں بڑی طاقتوں کی یک بیک دلچسپی محض شورش انگیزی کا نتیجہ ہے۔ تیسری دنیا میں ہر ''جاکوری'' سرکش کا ہر عمل دراصل سرد جنگ کا تصویر کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ سابسری میں دو آدمی پیٹے جائیں تو فوراً ایک دھڑا (بلاک) متحرک ہو جاتا ہے۔ ان دو آدمیوں کے بارے میں گفتگو ہونے لگتی ہے اور پٹائی کے اس واقعہ سے روڈیشیا کے خاص مسئلہ کو ابھارا جاتا ہے اور پھر اسے سارے افریقی اور سارے نوآبادیاتی مسئلے سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ اسی طور دوسرا دھڑا بھی اس کوشش

میں رہتا ہے کہ وہ اس تحریک کی قوت کے مطابق اپنے نظام کی کمزوریوں کو سمجھے۔ اس طرح نوآبادیاتی عوام یہ سمجھ لیتے ہیں کہ کوئی قبیلہ بھی مقامی واقعات سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اب وہ مقامی افق کے حدود میں مقید نہیں رہ جاتے اس لئے کہ انہیں یہ حقیقت معلوم ہوگئی ہے کہ اب وہ بین الاقوامی دباؤ کی فضا میں سانس لیتے ہیں۔

جب ہم ہر تین ماہ بعد یہ سنتے ہیں کہ چھٹا یا ساتواں بحری بیڑا کسی خاص ساحل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جب خروشچیف راکٹوں کے ساتھ کاسترو کی مدد کو پہنچنے کی دھمکی دیتا ہے، جب کینیڈی لاؤس کے مسئلہ پر شدید ضرورت کے تحت کوئی تصفیہ کرنا چاہتا ہے تو ایسے میں نوآبادیاتی باشندہ یا نوآزاد، شہری یہ تاثر لیتا ہے کہ خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے اسے تیز رفتار سواروں کے دستہ کے ساتھ لے جایا جارہا ہے۔ دراصل وہ اس دستہ میں پہلے ہی سے آگے بڑھتا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نوآزاد ملکوں کی حکومتوں کو لے لیجئے، حکمران طبقہ اپنے وقت کا دو تہائی حصہ اپنی جانب بڑھتے ہوئے ہاتھوں اور ان خطرات کو جن سے وہ دوچار ہوسکتا ہے، سمجھنے میں اور باقی ماندہ ایک تہائی وقت ملکی کاموں میں صرف کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ دوستوں کی تلاش بھی جاری رکھتا ہے۔ اس تضاد کی زد میں حزب اختلاف کی قومی جماعتیں بھی ہوتی ہیں جو پارلیمانی طریق کار کو رد کر دیتی ہیں۔ یہ جماعتیں بھی دوستوں کی تلاش کرتی ہیں تاکہ ان کی باغیانہ اور سنگدلانہ کارروائیوں کے لئے مدد مل سکے۔ نوآبادیاتی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کر لینے کے بعد تشدد کی فضا اب بھی قومی زندگی پر حاوی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں تیسری دنیا باقی ماندہ دنیا سے کٹی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس کے بالکل برعکس یہ گرداب کے بالکل بیچ میں ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ پس ماندہ ممالک کے رہنما ایک مدت اپنی تقریروں میں جارحانہ اور مشتعل لہجہ برقرار رکھتے ہیں جو عام حالات میں کب کا ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ شائستگی کی اس کمی کا سبب بھی جس کا شکوہ نئے حاکموں کے بارے میں عام طور پر کیا جاتا ہے اسی بات میں ہے۔ لیکن جو بات کم محسوس کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہی حکمران اپنے ساتھیوں اور بھائیوں کے ساتھ روابط میں نہایت اخلاق کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ یہ بداخلاقی بنیادی طور پر دوسروں سے ملنے جلنے میں برتی جاتی ہے یعنی سابق نوآبادکاروں کے ساتھ جو تحقیق وتفتیش کے لئے آتے ہیں۔ سابق ''دیسی'' بھی یہ تاثر لیتے ہیں کہ اطلاعات پہلے ہی سے حاصل کی جا چکی ہیں اخباروں کے مضامین میں جو تصویریں شائع ہوتی ہیں اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں۔ سمجھ بوجھ کر کہتے

ہیں اور یہ کہ ہم نے اس ملک کا دورہ بھی کیا ہے۔ یہ اطلاعات اس بات کا اعادہ کرتی ہیں کہ جب سے ہم نے اس ملک کو چھوڑا ہے وہاں ہر چیز غارت ہو رہی ہے۔ بالعموم اخباری نمائندے یہ شکایت کرتے ہیں کہ ان کا خیر مقدم نہیں کیا جاتا، انہیں مجبوراً ناگفتہ بہ حالات میں کام کرنا پڑتا ہے اور وہ ہمہ وقت لاتعلقی اور دشمنی کی فضا میں گھرے رہتے ہیں۔ یہ سب باتیں معمول کے مطابق ہیں قومی رہنما یہ جانتے ہیں کہ بین الاقوامی رائے عامہ محض مغربی پریس کے اثر سے بنتی ہے، اگر مغرب کا کوئی اخباری نمائندہ ان سے سوالات کرتا ہے تو یہ سوالات شاذ ہی ان کی بہبود کے لئے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر الجزائر کی جنگ میں بہت زیادہ آزاد خیالی فرانسیسی نمائندے بھی اس جدوجہد کے ذکر میں مبہم الفاظ استعمال کرنے سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ اور جب اس پر ان سے باز پرس کی گئی تو انہوں نے نہایت معصومیت سے جواب دیا کہ وہ معروضی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ معروضیت ہمیشہ دیسی باشندوں کے خلاف ہی جاتی ہے۔ اسی طور ہم اس نئے لہجے کو بھی سمجھ سکتے ہیں جو ستمبر 1960 اقوام متحدہ کو جنرل اسمبلی میں بین الاقوامی سیاست پر چھا گیا۔ یہاں نوآبادیاتی ممالک کے نمائندوں نے اشتعال انگیز اور جارحانہ لہجہ استعمال کیا اور ہر بات کو انتہا تک پہنچایا جب کہ نوآبادکاروں کے نمائندے خود کو متوازن سمجھتے رہے۔ افریقی نمائندوں کے اسی باغیانہ رویئے کا نتیجہ یہ ہوا کہ صورت حال انتہا کو پہنچ گئی، ویٹو اور بڑی طاقتوں کی گفت وشنید بے معنی ثابت ہوئی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تیسری دنیا کا اپنا چھوٹا سا کردار محفوظ ہو گیا۔

نوآزاد شدہ اقوام کی سیاسی حکمت عملی پہلو داری، نزاکت اور مسمریزم کے اشاروں کا معاملہ نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ قوم کے ترجمان بیک وقت قومی یکجہتی کے تحفظ، عوام کو خوش حالی کی راہ پر گامزن کرنے اور تمام لوگوں کے لئے روٹی اور آزادی مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ پس ان کی سیاسی حکمت عملی ہمیشہ متحرک ہوتی ہے۔ ایک ایسی حکمت عملی رواں دواں رہتی ہے جو غیر متحرک اور جامد نوآبادیاتی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اور جب مسٹر خرد شچیف اقوام متحدہ میں اپنے جوتے ہلاتے ہیں یا جوتوں سے میز بجاتے ہیں تو ایک بھی سابق دیسی یا پس ماندہ ملک کا نمائندہ ایسا نہیں ہے جو ہنسے۔ اس لئے کہ مسٹر خروشچیف نوآبادیاتی ممالک کو جوان کی طرف دیکھ رہی ہیں یہ جتانا چاہتے ہیں کہ یہ روسی دہقان جس کے پاس دور مار راکٹ بھی ہیں ان بیچارے سرمایہ داروں کے ساتھ وہی سلوک کر رہا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اسی طور اقوام متحدہ کے اجلاس میں فوجی وردی میں ملبوس کاسترو پس ماندہ ممالک کی تذلیل نہیں کرتا۔

کاستر واس شعور کا مظاہرہ کرتا ہے کہ تا حال ظلم وتشدد کی حاکمیت کا وجود باقی ہے۔ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ وہ اقوام متحدہ میں توپ سمیت کیوں نہ آیا۔ لیکن اگر وہ آتا تو کیا کوئی شخص اس بات کا برا مانتا۔ کسانوں کی ساری بغاوتیں، سارا تشدد، وہ تمام لوگ جو تلواروں اور کلہاڑیوں سے لیس ہوتے ہیں، انہیں اپنی قومیت کا سراغ اس مسلسل جدوجہد میں ملتا ہے جو سرمایہ دارانہ اوراشتراکی دونوں نظاموں کے خلاف ہوتی ہے۔

1945 میں سیتف کے پینتالیس (45) ہزار انسانوں کے قتل پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ 1947 میں مڈغاسکر کی نوے (90) ہزار اموات اخبارات میں محض ایک مختصر پیراگراف کی جگہ حاصل کر سکیں۔ 1952 میں کینیا کے دو لاکھ جبر وتشدد کے شکار انسانوں کے ساتھ کم وبیش لاتعلقی کا سلوک ہوا۔ یہ سب اس لئے ممکن ہوا کہ بین الاقوامی تضادات اتنے واضح نہ تھے۔ گوکوریائی اور ہند چینی جنگوں نے ایک نئے دور کو جنم دیا مگر اس مقابلے کے فیصلہ کن لمحات کی تشکیل میں سب سے بڑا ہاتھ بوڈاپسٹ اور سوئز کے واقعات کا تھا۔

سوشلسٹ ممالک کی غیر مشروط امداد کے بل پر نوآبادیاتی عوام اپنے گنے چنے ہتھیاروں کو لے کر استعمال کے ناقابل تسخیر قلعہ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ گو پہلے یہ قلعہ چاقوؤں اور گھونسوں سے فتح نہ ہوسکتا تھا لیکن اگر ہم سرد جنگ کی صورت حال کا جائزہ لیں۔ تو اب ایسا نہیں ہے۔

اس تازہ صورت حال میں امریکی بین الاقوامی سرمایہ داری کی سرپرستی کا کردار بڑی سنجیدگی کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔ اول اول وہ یورپی ممالک کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ دوستانہ طور پر نوآبادیاتی نظام کو ختم کر دیں۔ بعدازاں وہ ''افریقہ افریقیوں کے لئے'' کے اصول کو نہ صرف تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی تائید بھی کرتے ہیں۔ آج امریکہ یہ اعلان کرنے سے بالکل نہیں ہچکچاتا کہ وہ ہر قوم کے حق خود ارادیت کا محافظ ہے۔ مسٹر مینن ولیمز کا آخری سفر امریکی شعور کی مثال ہے کہ تیسری دنیا کی قربانی نہیں دینی چاہئے۔ اس کے بعد سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر مجرد طور پر ظالم حکمرانوں کی فوجی مشین کے مقابلے میں دیکھا جائے تو دیسی باشندوں کا تشدد بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہم اس تشدد کو بین الاقوامی صورت حال کے محرکات کے پیش نظر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمرانوں کے لئے نہایت خوفناک خطرہ بن جاتا ہے جاکوری اور ماؤ ماؤ کے لگاتار فسادات نوآبادی کی معاشی زندگی کو غیر متوازن تو کر دیتے ہیں مگر وہ استعمار کے لئے خطرہ نہیں بنتے۔ سامراج کی نظر میں سب سے زیادہ اہم بات یہ صورت حال

ہے کہ اشتراکیت کے تصورات عوام میں پھیلیں اور انہیں آلودہ کریں۔ سرد جنگ کی صورت میں تو یہ اب بھی سب بڑا خطرہ ہے۔ لیکن اصل جنگ میں نوآبادی کی کیا حالت ہوگی؟ جب کہ اسے وحشی گوریلوں نے پہلے ہی چھلنی کر رکھا ہے۔

اس طور سرمایہ داری نظام کو یہ پتہ چل گیا ہے کہ قومی جنگوں کے شروع ہونے کی صورت میں فوجی کاروائی میں ہر طرح نقصان ہی نقصان ہے۔ علاوہ ازیں پر امن بقائے باہمی کے دائرے میں تمام نوآبادیات کا خاتمہ لازمی ہے اور بالآخر سرمایہ داری کو غیر جانبداری کے اصول کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ اب جس چیز سے ہر قیمت پر بچنا ہے وہ مدبرانہ طور پر پیدا کردہ غیر تحفظ ہے، یعنی دشمن کے تصورات کا عوام میں در آنا جس کا نتیجہ لاکھوں انسانوں کی دلی نفرت ہوتا ہے۔ نوآبادیاتی عوام ان لازمات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جو آج بین الاقوامی سیاسی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایسے لوگ جو تشدد پر لعنت بھیجتے ہیں وہ بھی اپنے فیصلے کرتے ہیں اور اس آفاقی تشدد کے حوالے سے عمل شروع ہیں۔ دونوں بلاکوں کے درمیان پر امن بقائے باہمی نوآبادیاتی ممالک میں تشدد کے لئے تحریک اور تقویت کا موجب ہوتا ہے۔ کل شائد تمام نوآبادیات کی مکمل آزادی کے بعد ہم یہ دیکھ سکیں کہ وہ اب اس تشدد سے پاک ہیں۔ شاید اب اقلیتوں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو۔ اب بھی بہتیرے اقلیتی گروہ اپنے مسائل کے حل کے لئے متشددانہ طریق کار استعمال کرنے کی تلقین کرنے سے نہیں ہچکچاتے اور یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ (جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے) کہ نتیجہ کے طور پر امریکہ کے نیگرو متشدد بن نے اپنی ملیشیا تیار کر کے خود کو ہتھیاروں سے لیس کر لیا ہے۔ یہ بات بھی محض اتفاقیہ نہیں ہے کہ نام نہاد آزاد دنیا میں روس کی یہودی اقلیتوں کے تحفظ کے لئے کمیٹیاں بن گئی ہیں، نہ ہی یہ محض ایک حادثہ ہے کہ جنرل ڈیگال نے اپنی ایک تقریر میں ان لاکھوں مسلمانوں کی حالت زار پر آنسو بہائے جو کمیونسٹ آمریت کے مظالم کا شکار ہیں۔ سرمایہ داری اور سامراجیت دونوں کا ایمان ہے کہ نسلی امتیازات کے خلاف جدوجہد اور قومی آزادی کی تحریکات دور افتادہ تنظیموں کے تحت بیرونی اثرات سے فروغ پاتی ہیں۔ اس لئے وہ نہایت مجرب حربہ استعمال کرتے ہیں مثلاً آزاد یورپ ریڈیو اسٹیشن یا محکوم اقلیتوں کی محافظتی کمیٹی کی آواز وغیرہ..... وہ استعماریت کی مخالفت اس طرح کرتے ہیں جیسے الجزائر میں فرانسیسی کرنلوں نے ایس اے ایس (7) کے نفسیاتی ادارے کے خلاف تخریبی جنگ لڑ کر کی وہ ''عوام کو عوام کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔'' اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس

نتائج کیا ہوتے ہیں۔

دھمکیوں اور تشدد کا یہ ماحول، دونوں جانب سے راکٹوں کی نمائش نو آبادیاتی عوام کو نہ خوفزدہ کرتے ہیں اور نہ منحرف کرتے ہیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کی حالیہ تاریخ نے انہیں حالات کے سمجھنے اور گرفت میں لینے کے لئے تیار کر دیا ہے۔ نو آبادیاتی ممالک کے تشدد اور اس پر امن تشدد کے درمیان جس میں ساری دنیا گھری ہوئی ہے، ایک قسم کا رازدارانہ معاہدہ اور ایک طرح کی ہم آہنگی ہے۔ نو آبادتی عوام کے لئے یہ فضا بڑی سازگار ہے اس لئے کہ کم از کم ایک بار وہ جدید زمانے کی روش کے مطابق آ گئے ہیں۔ بعض اوقات لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ دیسی باشندہ اپنی بیوی کے لئے کپڑے لانے کے بجائے ٹرانسسٹر ریڈیو خریدتا ہے اس بات پر متعجب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیسی باشندوں کو اس بات کا یقین کامل ہے کہ اس گھڑی ان کی قسمت داؤں پر لگی ہوئی ہے۔ وہ روز قیامت کے سے ماحول میں رہتے ہیں لہٰذا وہ یہ سوچتے ہیں کہ کوئی چیز ایسی نہیں ہونی چاہئے جس سے وہ باخبر نہ ہوں۔ یہی سبب ہے کہ وہ پھوما اور پھومی لمبا اور شومے، آہجو اور موی، کنیاٹا اور ان لوگوں کو جو اس کی جگہ لینے کے لئے پے در پے آگے بڑھائے جاتے ہیں، بخوبی جانتے ہیں۔ وہ ان تمام لوگوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان قوتوں کو بھی بے نقاب کر سکتے ہیں۔ جو ان کے پیچھے کام کرتی ہیں۔ آج دیسی باشندے اور پس ماندہ ممالک کے عوام اس اصطلاح کے آفاقی مفہوم میں ''سیاسی حیوان'' ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آزادی کے باعث نو آبادیاتی عوام کو اخلاقی برتری حاصل ہو گئی ہے اور ان کا وقار بڑھ گیا ہے۔ لیکن ابھی انہیں معاشرہ کی تفصیلی تشکیل یا اقدار کے تعین و فروغ کا وقت نہیں ملا ہے۔ حرارت اور روشنی کے وہ مرکز جہاں انسان اپنے تجربوں کو وسیع تر سطحوں اور پہلوؤں سے زیادہ سے زیادہ فروغ دے سکیں، ابھی تک وجود میں نہیں آئے۔ ایک بے یقینی کی فضا میں لوگ بڑی آسانی سے خود کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ ہر بات کا فیصلہ کسی اور جگہ بیک وقت سبھی کے لئے ہوگا۔ جہاں تک سیاسی رہنماؤں کا تعلق ہے، جب وہ ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں تو پہلے تو ہچکچاتے ہیں اور پھر غیر جانبداری اختیار کر لیتے ہیں۔

غیر جانبداری کے موضوع پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ اسے داغدار بیوپار کا نام دیتے ہیں جس میں دونوں طرف سے جو کچھ ملے اسے سمیٹا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گو غیر جانبداری کی صورت

حال جو سرد جنگ کی پیداوار ہوتی ہے، پس ماندہ ممالک کو دونوں طرف سے اقتصادی امداد حاصل کرنے دیتی ہے مگر وہ دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی پس ماندہ ممالک کی اس حد تک مدد نہیں کرنے دیتی جس حد تک وہ ضروری ہے۔ وہ فی الواقعی لاتعداد رقم جو فوجی تحقیقات پر صرف کی جاتی ہے، وہ انجنیئر جو ایٹمی جنگ کے ماہرین میں تبدیل کر دیئے جاتے ہیں، محض پندرہ برس کی مدت میں پس ماندہ ممالک کے معیار زندگی کو ساٹھ فیصد بڑھا سکتے ہیں۔ پس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پس ماندہ ممالک کا مفاد سرد جنگ کے فروغ یا شدت میں نہیں ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کوئی ان ممالک سے مشورہ طلب نہیں کرتا۔ اس لئے حسب موقع وہ اس سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن کیا وہ واقعی اس سے باہر رہ سکتے ہیں؟ اس وقت فرانس اپنے ایٹمی بموں کی آزمائش افریقہ میں کر رہا ہے۔ بجز اس کے کہ قرار دادیں پاس ہوئیں، جلسے منعقد ہوئے اور سفارتی تعلقات منقطع کئے گئے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ افریقی عوام نے اس مخصوص علاقے میں فرانس کے رویئے پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔

تیسری دنیا کے شہریوں میں غیر جانبداری ایک ایسی ذہنی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، جو روزمرہ کی زندگی میں بے باکی اور ایک اباَئی احساس تفاخر میں ظاہر ہوتی ہے جو تعجب خیز حد تک سرکشی کے مشابہ ہوتا ہے۔ کسی قسم کی مصالحت سے اعلانیہ انکار اور وہ مضبوط قوت ارادی جو کسی ایک جگہ بندھ جانے کی مخالف ہوتی ہے، ان غیور اور غربت زدہ نوجوانوں کے کردار کی یاد دلاتی ہے جو اپنی بات منوانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہ تمام باتیں مغربی مبصرین کو ششدر کر دیتی ہیں اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ ہونے کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں اور جو کچھ یہ واقعی ہوتے ہیں اس میں بہت نمایاں فرق ہوتا ہے۔ یہ ممالک جن میں نہ ٹرامیں ہیں، نہ فوجیں اور نہ دولت، ان میں دن دھاڑے دکھاوے کی شجاعت کی جو مظاہرے ہوتے ہیں، ان کے لئے کوئی جواز نہیں ہے۔ بلاشک یہ لوگ فریب کار ہیں۔ تیسری دنیا بسا اوقات یہ تاثر دیتی ہے کہ اسے سنسنی خیزی میں لطف حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ اسے بحرانی صورت حال کی ہفتہ وار خوراک ملتی رہنی چاہئے۔ ان ننگے بھوکے ملکوں کے سربراہوں پر جو زور زور سے باتیں کرتے ہیں بہت غصہ آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کا منہ بند کر دیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس وہ بہت مقبول ہوتے ہیں۔ ان کی ضیافتیں ہوتی ہیں۔ انہیں دعوتوں پر مدعو کیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت اس بات پر جھگڑا رہتا ہے کہ وہ کس کی طرف ہوں اور یہی غیر جانبداری ہے۔ یہ لوگ اٹھانوے فیصدی جاہل ہوتے ہیں مگر وہ ادب کی

کثیر تعداد کا موضوع بنتے ہیں۔ یہ بہت زیادہ سفر کرتے ہیں۔ پس ماندہ مما لک کا حاکم طبقہ اور طلباء ہوائی سفر کے اداروں کے لئے سونے کی کانیں ہوتے ہیں۔ افریقی اور ایشیائی افسران ایک ہی ماہ کے اندر اندر ماسکو میں سوشلسٹ منصوبہ بندی اور لندن یا کولمبیا یونیورسٹی میں آزاد معیشت کے فوائد کے بارے میں تربیت حاصل کر سکتے ہیں۔ افریقی ٹریڈ یونین کے رہنما اپنے میدان میں تیزی سے آگے بڑھتے ہیں۔ ابھی وہ انتظامیہ کے شعبہ میں کسی عہدے پر فائز ہی ہوتے ہیں کہ خود مختار ادارے بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ ابھی انہوں نے کسی صنعتی ملک کے ماحول میں ٹریڈ یونین کا پچاس سالہ عملی تجربہ تو حاصل نہیں کیا لیکن وہ یہ بات جانتے ہیں کہ غیر سیاسی ٹریڈ یونین بے معنی چیز ہوتی ہے۔ انہیں نہ تو سرمایہ دارانہ نظام سے نبرد آزما ہونا پڑا ہے اور نہ ہی انہوں نے طبقاتی کش مکش کے شعور کو فروغ دیا ہے۔ لیکن شاید یہ ضروری بھی نہیں۔ شاید۔ ابھی ہم یہ دیکھیں گے کہ بہر حال یہی قوت ارادی جو بسا اوقات سطحی بین الاقوامیت کی بگڑی ہوئی صورت اختیار کر لیتی ہے، پس ماندہ مما لک کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔

آیئے اب ہم نوآبادکار اور مقامی باشندوں کے درمیان ان کے آپس کے مقابلے کے متعلق غور کریں۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ یہ مقابلہ عام مسلح جدوجہد کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس سلسلے میں تاریخی مثالوں کی کوئی کمی نہیں، مثلاً ہند چین، انڈونیشیا، اور شمالی افریقہ۔ لیکن ہمیں جس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ یہ جدوجہد گنی اور سمالی لینڈ کسی جگہ بھی شروع ہو سکتی تھی، علاوہ ازیں آج تو یہ جدوجہد ہر اس مقام پر شروع ہو سکتی ہے جہاں نوآبادیاتی نظام اپنے قیام کے لئے کوشاں ہو۔ مثال کے طور پر انگولا۔ مسلح جدوجہد کا وجود یہ ظاہر کرتا ہے کہ عوام نے محض متشددانہ طریق کار پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے وہ جس کے بارے میں ''انہوں'' نے ہمیشہ یہ جتایا کہ اگر کوئی زبان وہ سمجھتا ہے تو وہ طاقت کی زبان ہے۔ اب وہ خود طاقت کی زبان استعمال کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ فی الحقیقت ہمیشہ کی طرح اب بھی خود نوآباد کرنے ہی اس وہ راہ دکھائی ہے جس پر چل کر وہ آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ دیسی باشندہ جو دلیل استعمال کرتا ہے دراصل وہ اسے نوآبادکار ہی مہیا کرتا ہے مگر اب تبدیل شدہ حالات کی ستم ظریفی کے باعث دیسی باشندہ یہ اعلان کرتا ہے کہ نوآبادکار طاقت کے علاوہ اور کسی بات کو نہیں سمجھتا۔ نوآبادیاتی حکومت محض طاقت کے بل پر ہی اپنا جواز رکھتی ہے اور اس پہلو کو چھپانے کی وہ کوشش بھی نہیں کرتی تمام مجسمے خواہ وہ فائدھرب کے ہوں یا لیاوتی کے یا سارجنٹ بلانڈن کے، نوآبادیاتی سرزمین پر گرے ہوئے فاتحین کی

حیثیت سے، ایک ہی بات کا مسلسل اعلان کر رہے ہیں ''ہم یہاں سنگینوں کے بل پر موجود ہیں....'' (8) یہ فقرہ بہ آسانی مکمل ہو جاتا ہے۔ بغاوت کے دوران میں ہر نوآبادکار معمولی حساب کے سوال کی بنیاد پر اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔ یہ دلائل دوسرے نوآبادکاروں کو حیران نہیں کرتے لیکن اہم بات تو یہ ہے کہ ان سے دیسی باشندہ بھی حیران نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو اس اصول پر زور کہ ''یا تو وہ ہیں یا ہم'' کسی تضاد کو پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ نوآبادیاتی نظام جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ دراصل ایک ''مانوی'' دنیا کا نظام ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جو مختلف درجات میں بٹی ہوئی ہے۔ اور جب مخصوص طریق کار کے مطابق نوآبادکار جابر اقلیت کے ہر فرد سے تیس یا سو یا دو سو مقامی باشندوں کو قتل کرنے کے لئے کہتا ہے تو اسے علم ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی احتجاج نہیں کرتا اور مسئلہ محض یہ رہ جاتا ہے کہ آیا یہ کام یک دم کیا جائے یا آہستہ آہستہ....(9)

دلائل کا یہ سلسلہ جو بڑے حسابی طور پر نوآبادیاتی باشندوں کا نیست و نابود ہونا فرض کر لیتا ہے، دیسی باشندوں کے دلوں میں محض اخلاقی نفرت نہیں بھرتا۔ اسے ہمیشہ سے یہ معلوم ہے کہ نوآبادکار سے اس کا مقابلہ ایک نہ ایک دن اکھاڑے میں ضرور ہوگا۔ دیسی باشندہ رونے دھونے میں بالکل وقت ضائع نہیں کرتا اور نہ ہی وہ کبھی نوآبادیاتی نظام سے انصاف کی توقع رکھتا ہے۔ اگر نوآبادکار کی منطق، مقامی باشندے کو نہیں دہلاتی تو بات دراصل یہ ہے کہ مقامی باشندے نے بھی اپنی آزادی کے مسئلے کو عملاً انہیں خطوط پر سوچا ہے۔ ''ہمیں خود کو دو دو سو یا پانچ پانچ سو کے گروہوں میں بانٹ لینا چاہئے تاکہ پھر ہر گروہ ایک نوآبادکار سے نبٹے۔'' یہی وہ انداز فکر ہے جس سے ہر کردار جدوجہد کا آغاز کرتا ہے۔

مقامی باشندے کے لئے، تشدد محض ایک مطلق دستور العمل کی نمائندگی کرتا ہے جنگ جو شخص بھی محض ایک کارکن ہوتا ہے۔ وہ سوالات جو تنظیم کسی جنگ جو کارکن سے پوچھتی ہے۔ اسی قسم کے زاویہ نگاہ کی نشان دہی کرتے ہیں، مثلاً آپ نے کہاں کام کیا ہے؟ کس کے ساتھ کام کیا ہے؟ کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟'' وغیرہ۔ گروہ کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کوئی ایسا کام کرے جو انمٹ ہو۔ مثال کے طور الجزائر میں جہاں کم و بیش ان تمام لوگوں کو جنہوں نے عوام کو قومی جدوجہد میں شرکت کی دعوت دی یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا فرانسیسی پولیس ان کا سراغ لگاتی پھرتی۔ یوں جو صورتحال جتنی زیادہ حوصلہ شکن تھی اسی تناسب سے پر از امید بھی تھی۔ آپ اس نئے رنگروٹ پر یقیناً بھروسہ کر سکتے ہیں، جو نوآبادیاتی نظام میں

واپس جا ہی نہیں سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کینیا میں بھی ماؤ ماؤ تحریک اسی انداز پر چلتی تھی جو گروہ کے ہر ممبر سے یہ تقاضہ کرتی تھی کہ وہ شکار پر ضرب لگائے۔ اس طرح ہر شخص ذاتی طور پر اس شکار کی موت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ یوں کام کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ نوآبادکار کی موت کے لئے کام کیا جائے۔ تشدد برپا کرنے کے لئے یہ احساس ذمہ داری گروہ کے بھٹکے ہوئے اور غیر قانونی دونوں قسم کے افراد کو یہ موقع مہیا کرتا ہے کہ وہ اپنے اپنے مقام پر واپس آجائیں اور اس طرح ایک بار پھر منظم ہو جائیں۔ یوں تشدد شاہی معافی نامے کے مترادف ٹھہرتا ہے۔ نوآبادیاتی باشندہ تشدد میں اور تشدد کے ذریعے آزادی حاصل کرتا ہے۔ یہ اصول کار عامل کو بصیرت عطا کرتا ہے اس لئے کہ یہ اسے مقصد اور ذریعہ دونوں سے آگاہ کرتا ہے۔ سیزرے کی شاعری تشدد کے اس مخصوص پہلو میں ایک پیمبرانہ اہمیت دیکھتی ہے۔ اس کے المیہ کے چند نہایت فیصلہ کن صفحات کی یاد تازہ کیجئے جن میں باغی (فی الواقعی) اپنے رویئے کی وضاحت کرتا ہے۔

باغی = (سختی سے) میرا نام.... ایک جرم، میرا عیسائی نام۔ انکساری.... میری حیثیت۔ بغاوت، میری عمر.... پتھر کا زمانہ۔

ماں = میری نسل۔ نسل انسانی... میرا مذہب... اخوت

باغی = میری نسل... پستیوں میں گرنے والوں کی نسل.... میرا مذہب.....

لیکن تم مجھے اپنے عدم تشدد کے نام پر اس کی راہ نہیں دکھا سکتیں.... میں خود اپنی بغاوت اور اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں اور اپنی پریشان دماغی سے......

(پرسکون انداز میں) وہ نومبر کا دن مجھے یاد ہے، بہ مشکل چھ ماہ گذرے ہیں..... کہ میرا آقا میرے کیبن میں آیا۔ 7۔ اپریل کے چاند کی طرح دھویں میں لپٹا ہوا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے مضبوط بازو پھیلے ہوئے تھے... بہت اچھا مالک تھا وہ.... اور وہ اپنی موٹی موٹی انگلیوں سے اپنا چاہ زنخداں والا چھوٹا سا چہرا مسل رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور اس کے منہ سے شیریں الفاظ تیزی سے نہ نکلتے تھے ''یہ لڑکا بہت اچھا آدمی بنے گا۔'' اس نے میری سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اس نے، میرے آقا نے اور بہت سی اچھی اچھی باتیں بھی کیں.... کہ تمہیں بہت کم عمری میں کام شروع کرنا پڑا۔ نیک عیسائی بننے کے لئے اچھے غلام بننے کے لئے ایک محنتی اور وفادار لڑکا بننے کے لئے اور اپنے جہاز کے کمانڈر کے تحت زنجیروں میں جکڑے ہوئے غلاموں کے کپتان بننے کے لئے جس کی نگاہیں تیز اور بازو مضبوط ہوں۔

بیس برس کے مدت کوئی زیادہ مدت تو نہیں ہے۔اس شخص نے میرے بچے کے جھولے کو محض یہ جانا کہ وہ غلاموں کے کپتان کے بچے کا جھولا ہے۔

اور ہم اپنے خنجر لئے رینگنے لگے۔

ماں=افسوس اس کے لئے تمہیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

باغی=میں نے مار ڈالا، میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا۔

ہاں یہ ایک سودمند موت تھی....ایک بھرپور موت....رات

کا وقت تھا۔ہم گنوں کے کھیت میں رینگتے رہے۔ہمارے خنجر

ستاروں کو گیت سناتے رہے مگر ہم نے ستاروں کی پرواہ نہ کی۔گنے کے پیڑوں کے سبز پتوں نے اپنی دھار سے ہمارے چہرے زخمی کر دیئے۔

ماں=اور میں نے یہ سوچا تھا کہ میرا بیٹا میری آنکھیں بند کرے گا۔

باغی=لیکن میں تو اپنے بیٹے کی آنکھیں نئے سورج کے سامنے کھولنا چاہتا ہوں۔

ماں=اے میرے بیٹے، بدی اور بدقسمتی کی موت کے بیٹے۔

باغی=زندہ اور پرشوکت موت کی ماں

ماں=اس لئے کہ اس نے بہت زیادہ نفرت کی۔

باغی=اس لئے کہ اس نے بہت زیادہ محبت کی۔

ماں=خدارا مجھے چھوڑ دو، میں تمہاری زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں، میں تمہارے زخموں سے زخم خوردہ ہوں۔

باغی= مگر دنیا مجھے نہیں چھوڑتی....دنیا کی کوئی غریب مخلوق ایسی نہیں جسے مارا گیا ہو اور میں قتل نہ ہوا ہوں، جسے عذاب میں ڈالا گیا ہو اور میں نے اذیت محسوس نہ کی ہو۔

ماں=اے جنت کے خدا، اسے نجات دے۔

باغی=اے میرے دل، تو مجھے میری یادوں سے نجات نہ دے گا۔وہ نومبر کی ایک شام تھی....

اور یکا یک آوازوں نے خامشی کو منور کر دیا:

ہم نے حملہ کر دیا تھا، ہم غلاموں نے، ہم قدموں تلے کی غلاظتوں نے، ہم پرسکوں کھروں والے

جانوروں نے، ہم پاگلوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

گولیاں دندنا رہی تھیں..... ہم ضرب لگا رہے تھے۔ خون اور پسینے نے ہمیں تازہ دم کر دیا تھا۔ ہم اس مقام پر حملہ کر رہے تھے جہاں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ آوازیں کرخت تر ہوتی گئیں اور مشرق سے ایک شور غوغا بلند ہوا۔ خدمت گذاروں کے گھر جل رہے تھے اور ان کی شعائیں بڑی نرمی سے ہمارے چہروں پر پڑ رہی تھیں۔

پھر حملہ آقا کے گھر پر ہوا۔

ادھر سے وہ کھڑکیوں سے گولیاں چلا رہے تھے۔

ہم دروازے توڑ کر داخل ہوئے۔

آقا کا کمرہ بالکل کھلا تھا۔

آقا کا کمرہ تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور آقا وہاں موجود تھا، بہت ہی پر سکون اور ہمارے آدمی ساکن و جامد رہ گئے... سامنے آقا کو دیکھ کر.... میں اندر داخل ہوا۔ تم ہو' اس نے بڑے سکون سے کہا۔

ہاں یہ میں تھا، میں ہی، اور میں نے اسے بتایا کہ میں نیک غلام، وفادار غلام، غلاموں کا غلام ہوں اور یک بیک اس کی آنکھیں بارش کے موسم میں خوفزدہ کاکروچوں کے مانند ہوگئیں.... میں نے ضرب لگائی اور خون اچھلا، اور یہی وہ چشمہ ہے جو مجھے آج یاد ہے۔

(10)

ظاہر ہے کہ ایسی فضا میں معمول کی زندگی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اب آپ پہلے کی طرح نہ تو کاشت کار ہو سکتے ہیں نہ دلال اور نہ شرابی۔ نوآبادیاتی حکومت کا تشدد اور مقامی باشندے کا جوابی تشدد دونوں توازن میں برابر ہوتے ہیں۔ اور ایک غیر معمولی متبادل ہم آہنگی کے ساتھ ایک دوسرے کا جواب دیتے ہیں۔ تشدد کی یہ حکمرانی اتنی ہی زیادہ خوفناک ہوگی۔ جتنے کہ نوآبادکار ملک کے مفادات ہوں گے، اور نوآبادیاتی عوام میں تشدد کا فروغ اسی تناسب سے ہوگا جس تناسب سے خطرہ محسوس کرتی ہوئی نوآبادیاتی حکومت تشدد کا استعمال کرے گی۔ بغاوت کے دور کے پہلے مرحلے میں تو نوآبادکار ممالک کی حکومتیں بھی نوآبادکاروں کی غلام ہوتی ہیں اور یہ نوآبادکار اپنی حکومت اور مقامی باشندہ دونوں کو ایک ہی ساتھ مرغوب کرتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف ایک ہی قسم کے طریق کار استعمال کرتے ہیں۔ ایویان کے میئر کا

قتل محرکات اور طریق کار کے اعتبار سے علی بومندیل کے قتل کا مشابہہ ہے۔ نوآبادکار کے لئے مسئلہ الجزائری الجزائر یا فرانسیسی الجزائر کا نہیں بلکہ آزاد الجزائر اور نوآبادیاتی الجزائر میں انتخاب کا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض بیجا باتیں ہیں یا خفیہ سازش کی کوشش۔ نوآبادکار کی منطق تو سخت گیر ہوتی ہے۔ مگر مقامی باشندوں کے رویوں میں جو جوابی منطق نظر آتی ہے وہ اور زیادہ حیران کن معلوم ہوتی ہے بشرطیکہ ہمیں نوآبادکار کے خیالات کے تانے بانے کا پہلے ہی بخوبی علم نہ ہو۔ اسی وقت سے جب کہ مقامی باشندے جوابی تشدد سے کام لینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پولیس کی انتقامی کارروائی خود بخود قوم پرستوں کی انتقامی کارروائی کو جنم دیتی ہے۔ تاہم اس سے برابر کے نتائج پیدا نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ ہوائی جہازوں کے ذریعے برستی ہوئی گولیاں اور بحری جہازوں کے ذریعے بم باریاں دہشت اور تنوع کے اعتبار سے، قوم پرستوں کے دیئے ہوئے جواب کے مقابلے میں بہت برتر ہوتی ہیں۔

یہ مستقل اور مسلسل دہشت استعمارزدوں کی نسل کے سب سے زیادہ لاتعلق افراد کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حقیقت سے روشناس کر دیتی ہے انہیں وہیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ انسانی مساوات پر کی گئی تقریروں کے انبار بھی اس معمولی صداقت کو نہیں جھٹلا سکتے کہ واسکا مودی میں قتل یا زخمی ہونے والے سات فرانسیسی پوری مہذب دنیا کے ضمیر میں نفرت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں مگر گور گور اور جیرہ کی بستیوں کی تباہی اور تمام آبادی کا قتل عام.... کہ واسکا مودی کی کمین گاہ اس کی جوابی کارروائی تھی.... کسی بھی اہمیت کا حامل نہ ہو سکا۔ دہشت، جوابی دہشت، تشدد، جوابی تشدد، یہی وہ کچھ ہے جس کا بیان عالم مبصر نفرت کے اس دائرے کا ذکر کرتے ہوئے، جو الجزائر میں اس وقت نہایت مستحکم اور واضح ہے، بڑی تلخی سے کرتے ہیں۔

ہر مسلح جدوجہد میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں تقریباً ہمیشہ یہ موقع اس وقت آتا ہے جب کہ ایسا شدید اور ہمہ گیر جبر ہو کہ نوآبادیاتی عوام کا ہر طبقہ اس کی نذر ہو جائے۔ الجزائر میں یہ لمحہ 1955 میں فلپ ول کے 12 ہزار افراد کی تباہی پر آیا۔ اور پھر 1956 میں جب لاکوستے نے شہری اور دیہی رضا کار فوج قائم کی۔ (11)

تب یہ نوآبادکاروں سمیت ہر کس و ناکس پر واضح ہو گیا کہ ”اب حالات ویسے نہیں جیسے پہلے تھے“ تاہم نوآبادیاتی عوام محض حساب کتاب نہیں کرتے۔ وہ اپنی صفوں میں ان بڑے بڑے رخنوں پر نظر رکھتے

ہیں جولازمی برائی کے طور پر ان میں پڑ جاتے ہیں۔ چونکہ وہ تشدد سے جواب دینے کا تہیہ کر چکتے ہیں اس لئے وہ نتائج برداشت کرنے کے لئے بھی تیار رہتے ہیں۔ وہ جواب میں محض اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دوسروں کے بارے میں بھی کوئی حساب نہ رکھا جائے۔ اس کہاوت کا کہ ''سارے دیسی باشندے ایک ہی طرح کے ہیں۔'' یہ جواب دیتے ہیں کہ ''سب نوآبادکار ایک ہی جیسے ہیں'' (12)

جب مقامی باشندے کو اذیت دی جاتی ہے، جب اس کی بیوی کو قتل یا اس کی عصمت دری کی جاتی ہے تو وہ اس بات کی کسی سے شکایت نہیں کرتا۔ جابر حکومت اگر چاہے تو ہر روز تحقیقات اور معلوماتی کمیشن مقرر کرتی رہے۔ مگر مقامی باشندے کی نظر میں ایسے کمیشنوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الجزائر میں جرائم کے سات برس جلد ہی پورے ہو جائیں گے۔ مگر تا حال ایک بھی فرانسیسی ایسا نہیں ہے، جسے کسی فرانسیسی عدالت کے سامنے کسی الجزائری کے قتل کے الزام میں مجرم گردانا گیا ہو۔ انڈو چائنا، مڈغاسکر یا نوآبادیات میں ہر مقام میں مقامی باشندہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے دوسری سمت سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ نوآبادکار کا کام تو یہ ہے کہ وہ مقامی باشندے کو آزادی کا خواب بھی دیکھنے نہ دے۔ مقامی باشندے کا کام یہ ہے کہ وہ نوآبادکار کی تباہی کے لئے ہر ممکن اقدام کا تصور باندھے۔ منطقی سطح پر نوآبادکار کی مانویت دیسی باشندوں کی مانویت کو جنم دیتی ہے۔ مقامی باشندے کی سراپا برائی'' کے تصور کا جواب ''نوآبادکار کی سراپا برائی'' ہے۔

فلسفہ اتحاد قوم و مذہب کی اصطلاح میں نوآبادکاری کا مفہوم قدیم معاشرت کا خاتمہ ثقافتی تساہل، اور افراد کی بے حسی ہے۔ لیکن مقامی باشندے کی نظر میں زندگی محض نوآبادکار کی سڑتی ہوئی لاش سے پھوٹ سکتی ہے۔ اس طرح دونوں سلسلہ ہائے فکر کے مابین لفظ بہ لفظ تطابق ملتا ہے۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ چونکہ نوآبادیاتی باشندوں کے لئے محض یہ تشدد ہی ان کا کارنامہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے ان کے کردار میں مثبت اور تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ عمل تشدد ان سب کو ایک اکائی پرو دیتا ہے؟ یوں کہ ہر فرد ایک بڑی زنجیر میں تشدد کی ایک کڑی یا تشدد کے عظیم نامیاتی کل کا ایک جز ہوتا ہے۔ اس تشدد کا جو نوآبادکار کے اولین تشدد کے جواب میں تیزی سے آگے کی سمت بڑھتا ہے۔ ان میں ہر گروہ ایک دوسرے کو تسلیم کرتا ہے اور مستقبل کی یہ قوم ناقابل تقسیم ہو جاتی ہے۔ مسلح جدوجہد عوام کو تیزی سے متحرک کرتی ہے یعنی انہیں ایک راہ پر اور ایک سمت میں ڈال دیتی ہے۔

عوام کا یہ تحرک جو جنگ آزادی سے جنم لیتا ہے، ہر شخص کے شعور میں مشترکہ مقاصد قومی تقدیر، اور اجتماعی تاریخ کے تصورات پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرے دور میں جو تعمیر کا دور ہوتا ہے۔ اسی سیمنٹ سے مدد ملتی ہے جس میں عوام کا خون اور غصہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس طور پر ہم ان الفاظ کی اصلیت کا مکمل مفہوم سمجھ لیتے ہیں جو ایسے پس ماندہ ممالک میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے دوران میں عوام کو تشدد کے خلاف جدوجہد کے لئے ابھارا جاتا ہے۔ قومی آزادی کے بعد انہیں افلاس، جہالت، اور پس ماندگی کے خلاف جنگ پر اکسایا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے بقول جدوجہد جاری رہتی ہے۔ اور لوگ اس حقیقت کا ادراک کر لیتے ہیں کہ زندگی ایک لامتناہی جدوجہد کا نام ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ دیسی باشندوں کا تشدد عوام کے اتحاد کا سبب بنتا ہے۔ نو آبادیاتی نظام اپنی ساخت کے اعتبار سے تفرقہ پردازی اور علاقائیت کا حامل ہوتا ہے۔ استعماریت محض قبیلوں کے وجود کا احساس نہیں دلاتی۔ یہ انہیں قوت بخشتی ہے۔ اور ان میں تفریق ڈالتی ہے۔ استعماریت سرداروں کی ہمت افزائی کرتی ہے اور قدیم مرابطین کی برادریوں کو زندہ رکھتی ہے۔ تشدد با عمل ہو کر قومی سطح اختیار کر لیتا ہے جس میں ہر کوئی شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ علاقائیت اور قبائلیت کے خاتمے کے لئے بھی آلہ کار ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا قومی جماعتیں قائدوں اور روایتی سرداروں کے لئے ذرہ برابر ہمدردی نہیں رکھتیں۔ عوام کے اتحاد کے لئے ان کی تباہی شرط اول ہے۔

انفرادی سطح پر تشدد ایک مصفیٰ قوت ہے۔ یہ مقامی باشندوں کو ان کے احساس کمتری، مایوسی اور بے عملی سے نجات دلاتا ہے۔ یہ اسے نڈر بناتا ہے اور اس میں عزت نفس بحال کرتا ہے۔ اگر مسلح جدوجہد محض علامتی ہی ہو اور ختم استعماریت کا تیز عمل لوگوں میں تحریک ختم کر دے تو بھی عوام کو یہ دیکھنے کا موقع ضرور مل جاتا ہے کہ آزادی کا حصول ہر فرد کی اجتماعی کوشش کا نتیجہ ہے اور یہ کہ اس میں رہنماؤں کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہے۔ یہاں سے اس جارحانہ لاتعلقی کا آغاز ہوتا ہے جو نئی حکومتیں سرکاری آداب و رسوم کے خلاف بڑی تیزی سے ظاہر کرتی ہیں۔ اگر عوام نے قومی آزادی کے لئے تشددانہ عمل کیا ہے تو وہ کسی کو یہ حق نہیں دیں گے کہ وہ خود کو ''آزاد کنندہ'' سمجھے۔ وہ اپنے عمل کے نتائج کے بارے میں بڑے حساس ہوتے ہیں اور اس بات کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ کہیں ان کا مستقبل، ان کی تقدیر، یا ان کے ملک کا مقدر کسی ''زندہ دیوتا'' کے ہاتھ میں نہ چلا جائے۔ کل وہ مکمل طور پر غیر ذمہ دار تھے مگر آج وہ ہر شے کو سمجھنا اور ہر قسم

کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔تشدد سے منور عوامی شعور، ہر قسم کی بے حسی کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔اب رطب اللسان خطیبوں،موقع پرستوں،اور جادوگروں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔وہ عمل جس نے عوام کو دست بدست جدوجہد سے ہمکنار کیا،اسی نے ان میں ٹھوس حقائق کا شدید احساس بھی بخشا ہے اسی لئے حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش بالاخر مطلق ناممکن بن جاتی ہے۔

تشدد بین الاقوامی پس منظر میں

گذشتہ صفحات میں ہم کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ پسماندہ علاقوں میں سیاسی راہنما عوام کو ہمیشہ جنگ کے لئے اکساتے رہتے ہیں۔استعماریت کے خلاف جنگ،غربت اور پسماندگی کے خلاف جنگ، بے جان روایات کے خلاف جنگ وغیرہ۔اپنی اپیلوں میں جو الفاظ وہ استعمال کرتے ہیں وہ فوجی سربراہ کے الفاظ ہوتے ہیں،مثلاً ''عام لام بندی''،''زراعتی محاذ''،''جہالت کے خلاف جہاد''،''شکستیں جن کا ہمیں سامنا کرنا پڑا ہے''،''فتوحات جو ہم نے حاصل کی ہیں۔'' چونکہ پسماندہ ملک کا سیاسی راہنما اس طویل فاصلے کو جو کے ملک کو طے کرنا ہوگا،بہت پریشانی سے دیکھتا ہے،اس لئے نوآزاد قوم پہلے ایک برس میں تو میدان جنگ کی سی فضا میں پنپتی ہے۔وہ اپنی قوم کو آواز دیتا ہے اور یہ کہتا ہے'' آیئے اپنی کمر کس لیں اور کام پر ٹوٹ پڑیں۔'' اور اس کی قوم ایک قسم کے تخلیق جنون میں بڑی عظیم اور غیر متوازن کوششوں میں مصروف ہو جاتی ہے۔منصوبہ صرف دلدل سے باہر نکلنے کا نہیں ہوتا بلکہ اپنے موجودہ ذرائع کی مدد سے دوسری اقوام کی برابری کا بھی ہوتا ہے۔ان کی توجیح یہ ہوتی ہے کہ یورپی اقوام اس ارتقائی مقام پر محض اپنی کوششوں سے ہی پہنچی ہیں۔لہٰذا وہ یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ'' آیئے ہم خود پر اور ساری دنیا پر یہ ثابت کر دیں کہ ہم بھی یہ کامیابیاں حاصل کرنے کے لئے اہل ہیں۔'' ہمارے خیال میں ارتقا جدوجہد میں پس ماندہ ممالک کا یہ انداز نہ تو درست ہے اور نہ ہی دانشمندانہ۔

یورپی ریاستوں نے قومی اتحاد اس وقت حاصل کیا تھا جب زیادہ تر دولت قوم کے متوسط طبقے کے ہاتھوں میں سمٹ آئی تھی۔قومی ڈھانچے میں دکانداروں،کاریگروں،کلرکوں اور بنکاروں کے پاس دولت، تجارت اور سائنس کی اجارہ داری تھی۔متوسط طبقہ سب طبقوں سے زیادہ متحرک اور خوشحال تھا۔اس کے ہاتھ میں حکومت آئی تو اس نے بعض بہت اہم منصوبوں پر عمل درآمد کیا مثلاً صنعت کاری،رسل ورسائل کی

ترقی اور پھر جلد ہی بحری راستوں کی تلاش۔

یورپ میں، بعض مستثنیات کے علاوہ (مثلاً انگلستان کچھ زیادہ آگے نکل چکا تھا)، مختلف ممالک قومی اتحاد کے وقت کم وبیش ایک ہی اقتصادی سطح پر تھا۔ کوئی قوم بھی ایسی نہ تھی جو اپنی ترقی وارتقاء کی نوعیت کی وجہ سے دوسروں کو ہتک کا احساس دلاتی۔

آج کل پسماندہ علاقوں میں قومی آزادی اور قومی شعور کا ارتقائے نئے پہلوؤں سے سامنے آتا ہے۔ ان علاقوں میں بعض نمایاں ترقیوں کو چھوڑ کر، مختلف ممالک میں اس ذیلی طبقے کی عدم موجودگی نظر آتی ہے۔ اب بھی عوام اس غربت کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں، پہلے کی طرح گر گر کر سنبھلنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے پچکے ہوئے پیٹ کے ساتھ بھوک کے جغرافیہ کے نقشے کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک پسماندہ دنیا ہے، وہ دنیا جو غربت کی وجہ سے غیرانسانی نظر آتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ وہ دنیا ہے جہاں نہ تو ڈاکٹر ہیں نہ انجنیئر اور نہ ہی منتظمین۔ اس دنیا کے سامنے یورپی اقوام دولت کا طمطراق لئے مست پڑی ہیں۔ یہ یورپی دولت حقیقی معنوں میں مذموم ہے کیونکہ اس کی بنیاد غلامی پر رکھی گئی ہے۔ یہ غلاموں کے خون سے پلتی رہی ہے اور بلاواسطہ طور پر پسماندہ دنیا کی زمین اور زیرزمین سے اکٹھی کی گئی ہے۔ یورپی خوشحال اور ترقی میں نیگرو عرب، ہندوستانی اور زردفام باشندوں کے پسینے اور خون سے اضافہ کیا گیا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اب ہم اس بات کو نظرانداز نہیں کریں گے۔ جب استعماری ملک نوآبادی کے آزادی کے مطالبات سے گھبرا اٹھتا ہے تو وہ قومی راہنما سے کہتا ہے۔ ''ٹھیک ہے اگر تم آزادی چاہتے ہو تو لے لو۔ لیکن اس سے تم ایک بار پھر قرون وسطیٰ میں لوٹ جاؤ گے۔'' نوآزاد عوام اس حقیقت کو تسلیم کر کے یہ چیلنج قبول کر لیتے ہیں۔ آپ اس حقیقت کا مشاہدہ کریں گے کہ استعماریت اپنا سرمایہ اور کاریگر نوآبادیوں سے نکال کر نوآزاد قوم پر ہر چہارطرف سے اقتصادی دباؤ ڈالتی ہے۔ (13)

آزادی کا مقدس دیوتا آزادی کی لعنت میں بدل جاتا ہے او استعماری قوت اپنی تمام تر استبدادی طاقت کے ساتھ نئی قوم کو مراجعت پر مجبور کر دیتی ہے۔ استعماری قوت واضح لفظوں میں یہ کہتی ہے ''تم آزادی چاہتے ہو، لے لو اور اب بھوکے مرو۔'' قومی راہنماؤں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ اپنے عوام کی طرف رخ کریں اور انہیں انتھک کوششوں کی ترغیب دیں۔ ان فاقہ زدہ لوگوں پر ایک سخت سادگی پسند حکومت ٹھونس دی جاتی ہے اور ان کے لاغر اعصاب پر کام کا انتہائی بوجھ ڈال دیا جاتا

ہے۔ اقتصادی خودمختاری دلانے والی حکومت کی تشکیل کی جاتی ہے اور ہر ملک اپنے بجدنا کافی ذرائع کی مدد سے قوم کی شدید غربت اور بھوک کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں ہم اس قوم کو بیدار ہوتا دیکھتے ہیں جو قومی ہیکل اور شکی مزاج یورپ کے سامنے جان لیوا جدوجہد میں مصروف ہے۔

تیسری دنیا کے دوسرے ممالک اس آزمائش سے گذرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور مصائب پر عبور حاصل کرنے کے لئے سابقہ سرپرست طاقت کی شرائط مان لیتے ہیں۔ یہ ممالک اپنی فوجی اہمیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معاہدوں میں شامل ہوتے ہیں اور بعض ذمہ داریاں قبول کرتے ہیں اور اس طرح سے ان کا یہ اقدام انہیں دو بلاکوں کی کش مکش میں زیادہ بہتر توجہ کا مستحق بنا دیتا ہے۔ وہ ملک جو پہلے کسی کے قبضے میں تھا اب اقتصادی طور پر دست نگر ہو جاتا ہے۔ سابقہ استعماری قوت جس نے اپنے سابقہ استعماری تجارتی ذرائع نہ صرف قائم رکھے ہیں بلکہ بعض حالات میں ان میں اضافہ بھی کیا ہے، نوآزاد قوم کے بجٹ میں تھوڑی بہت امداد دینا قبول کر لیتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نوآبادیاتی ممالک کا حصول آزادی دنیا کے سامنے ایک اہم مسئلہ پیش کرتا ہے، اس لئے کہ قومی آزادی ان ممالک کی صحیح اقتصادی صورت حال کو بے نقاب کر دیتی ہے اور ان کا وجود اور بھی زیادہ ناپائیدار نظر آنے لگتا ہے۔ وہ بنیادی جھگڑا جو استعماریت اور غیر استعماریت کے درمیان بلکہ سچ پوچھئے تو سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان نظر آتا تھا، اب اپنی اہمیت کھوتا نظر آتا ہے۔ آج کل جس چیز کی اہمیت ہے اور وہ مسئلہ جو آج دنیا کے افق پر نمایاں ہے، دولت کی تقسیم نو کی ضرورت کا مسئلہ ہے۔ انسانیت کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ ورنہ پھر یہ اسے پاش پاش کر ڈالے گا۔

ممکن ہے کہ عام طور پر یہ سوچا جاتا ہو کہ دنیا کے لئے اور بالخصوص تیسری دنیا کے لئے سرمایہ داری اور سوشلسٹ نظاموں کے درمیان انتخاب کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ پسماندہ ممالک کو خود ان دو نظاموں کے اس شدید مقابلے کا حصہ بننے سے انکار کر دینا چاہئے جسے وہ اپنی قومی آزادی کی جدوجہد کو یقینی طور پر کامیاب بنانے کے لئے استعمال کر چکے ہیں۔ تیسری دنیا کو یہ نہیں کہ وہ خود کو ان اقدار کے حوالے سے متعارف کرائے جو اس کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھیں۔ اس کے برعکس پسماندہ ممالک کو پوری کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنی اقدار تلاش کریں، اپنا طریقہ کار اور اپنا انداز اپنائیں جو ان کے حالات کے لئے مخصوص ہو۔ وہ ٹھوس مسئلہ جو آج ہمارے سامنے ہے، کسی قیمت پر بھی اس سرمایہ داری اور سوشلزم کے

درمیان انتخاب کا نہیں ہے، جسے دوسرے براعظموں اور دوسرے ادوار کے لوگوں نے متعارف کیا ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سرمایہ داری ایک نظام حیات کی حیثیت سے نہ تو ہمیں اپنے گھر میں اپنا کام کرنے کی اور نہ ہی دنیا میں اپنے فرائض سرانجام دینے کی آزادی دے سکتی ہے۔ سرمایہ دارانہ استحصال، لین دین اور اجارہ داری پسماندہ ممالک کے دشمن ہے۔ دوسری طرف سوشلسٹ نظام کا انتخاب جو مکمل طور پر سارے عوام کے لئے ہوتا ہے اور اس اصول پر قائم ہے کہ انسان ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے، ہمیں زیادہ تیزی سے اور زیادہ سلیقے سے آگے بڑھنے دے گا اور معاشرے کی اس بھونڈی صورت کو ناممکن بنا دے گا جس میں تمام اقتصادی اور سیاسی قوت چند ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جو پوری قوم کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

لیکن اس نظام سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے تاکہ ہم ہر حال میں ان اصولوں کا احترام کر سکیں جو ہمارے لئے محرک قوت ثابت ہوتے ہیں، ہمیں انسانی محنت کے علاوہ بھی اور چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ بعض پسماندہ ممالک اس طور سے اپنی بے بہا قوت صرف کر دیتے ہیں۔ عورتیں، مرد اور بچے بوڑھے بڑے ہی جذبے کے ساتھ جبری محنت کو قبول کرتے ہیں اور خود قوم کا خادم گردانتے ہیں۔ اپنی ذات کا عطیہ اور ہر اس چیز کے لئے نفرت جس میں سب کا یکساں فائدہ نہ ہو قوم میں وہ ولولہ پیدا کر دیتا ہے جو لوگوں کے دلوں کو تسکین پہنچاتا ہے، انسان کے مقدر کے بارے میں ایمان تازہ کرتا ہے، اور بہت ہی محتاط مبصروں سے بھی اپنا لوہا منوا لیتا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں مان سکتے ہیں کہ ایسی کوششیں زیادہ دیر تک اسی شدید قوت کے ساتھ جاری جا سکتی ہیں۔ سابقہ استعماری قوتوں کی غیر مشروط واپسی کے بعد نئے ملکوں نے یہ چیلنج قبول کر لیا ہے۔ اب ملک نئے منتظموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، لیکن دراصل یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر چیز کی اصلاح کی جائے اور ہر بات کو نئے سرے سے سوچا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ استعماری نظام کی دلچسپی محض دولت کی ان چند صورتوں اور ان ذرائع تک محدود ہوتی ہے جو اس کی اپنی صنعت کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ زمین کی دولت اور معدنی ذخیروں کا اندازہ لگانے کی کوئی سنجیدہ کوشش آج تک نہیں کی گئی۔ یوں نو آزاد قوم استعماری دور کے پیدا کئے ہوئے اقتصادی ذرائع تک محدود رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ممالک دوسرے ملکوں اور دوسری کرنسی کے علاقوں میں بھی برآمدات کر سکتے ہیں لیکن برآمدات کے اصولوں میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آتی۔ استعماری نظام نے جو چند راہیں پیدا کی ہیں انہیں

قائم رکھنا ضروری ہے ورنہ پھر تباہی کا سامنا کرنا ہوگا۔ غالبًا ہر چیز کو از سرنو شروع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملکی برآمدات کی صرف منزل مقصود ہی نہیں بلکہ ان کی نوعیت میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ زمین اور معدنی ذخیروں کا از سرنو جائزہ لینا، دریاؤں اور اس سے آگے سورج کی پیداواری قوت کا اندازہ کرنا بھی، ضروری ہوگا۔ اب یہ سب کچھ کرنے کے لئے انسانی محنت کے علاوہ دوسری چیزوں کی بھی ضروری ہو گی۔ یعنی ہر قسم کا سرمایہ، کاریگر، انجنیئر، تربیت یافتہ مستری وغیرہ۔ آیئے اب ذرا کھل کر بات کریں، ہم نہیں مانتے کہ وہ بے پناہ محنت جس کا پسماندہ ممالک کے راہنما اپنے عوام سے مطالبہ کرتے ہیں، مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔ اگر کام کرنے کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاتی تو اس خطے کو جسے سامراجی طاقتوں نے حیوانی درجے تک پہنچا دیا ہے، انسانی سطح پر لانے کے لئے صدیوں کی ضرورت پڑے گی۔ (14)

سچ تو یہ ہے کہ ہمیں ان حالات کو قبول ہی نہ کرنا چاہئے۔ ہمیں صاف الفاظ میں اس صورت حال کو رد کر دینا چاہئے جس میں مغربی ممالک ہمیں پھنسانا چاہتے ہیں۔ استعماریت اور سامراجیت ہمارے علاقوں سے اپنے جھنڈے اتار کر اور اپنی پولیس ہٹا کر اپنا پورا قرض ادا نہیں کرتی۔ سرمایہ داروں نے صدیوں تک پسماندہ ممالک میں جنگی مجرموں کا سا کردار ادا کیا ہے ملک بدری، قتل عام، جبری محنت اور غلامی، یہ وہ خاص طریقے ہیں جنہیں سرمایہ داری نے اپنی دولت بڑھانے، سونے اور جواہرات کے ذخائر میں اضافہ کرنے اور اپنی قوت کو مسلط کے لئے استعمال کیا ہے۔ زیادہ عرصہ گذرا کہ نازیوں نے سارے یورپ کو سچ مچ نوآبادی میں بدل دیا تھا۔ مختلف یورپی اقوام کی حکومتوں نے تاوان کا مطالبہ کیا اور روپیئے یا جنس کی صورت میں اس دولت کی واپسی چاہی جو ان سے چرالی گئی تھی۔ ثقافتی خزانے، تصویریں، مجسّمے اور منقش شیشے ان کے مالکوں کو واپس دیئے جا چکے ہیں۔ 1945 کے یوم فتح کی صبح کو ہر یورپی کی زبان پر یہی نعرہ تھا ''جرمنی کو تاوان ادا کرنا ہوگا'' آئخمین کے مقدمے کے آغاز پر جناب ایڈنائر جرمن عوام کے ایما پر ایک بار پھر یہودیوں سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ ایڈنائر نے اپنے عوام کے اس وعدے، کا اعادہ کیا ہے کہ وہ اسرائیل کی حکومت کو کثیر رقوم، جسے نازیوں کے جرائم کا معاوضہ سمجھنا چاہئے۔، دیتے رہیں گے۔ (15)

اسی طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ سامراجی ریاستیں بہت بڑی غلطی کی مرتکب ہوں گی اور بڑی ناانصافی

برتیں گی اگر وہ محض اس بات پر اکتفا کریں کہ ہماری سرزمین سے اپنے فوجی دستوں اور انتظامیہ کے ان عہدیداروں کو واپس بلا لیں جن کا کام اب تک صرف یہ تھا، کہ یہاں دولت دریافت کریں اور اپنے وطن کو بھیج دیں۔قومی آزادی کے اخلاقی معاوضے سے ہماری آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں، نہ ہی اس سے ہمارا پیٹ بھرتا ہے۔ سامراجی ملکوں کی دولت بھی ہماری ہی دولت ہے۔ یقین رکھئے کہ بین الاقوامی سطح پر اس عقیدے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم مغربی فنون یا مغربی مکنیک سے متاثر ہو گئے ہیں۔ یورپ نے بڑے ہی ٹھوس طریقوں سے استعمارزدہ ممالک، لاطینی امریکہ، چین وافریقہ کے سونے اور خام مال سے اپنا پیٹ بری طرح بھرلیا ہے۔ان سب براعظموں سے، جن کی نظروں کے سامنے یورپ نے اپنی دولت کا مینار بلند کیا ہے، صدیوں تک اسی یورپ کی جانب، ہیرے اور تیل، ریشم اور کپاس، لکڑی اور بدیسی مصنوعات کا دھارا بہتا رہا ہے۔ یورپ حقیقی معنوں میں تیسری دنیا کی ہی تخلیق ہے۔ وہ دولت جس نے اسے پورے طور سے ڈھانپ لیا ہے، درحقیقت پسماندہ ممالک سے ہی چرائی گئی ہے۔ ہالینڈ کی بندر گاہوں، بوردو اور لیورپول کی گودیوں کو سیاہ فام غلاموں کی تجارت میں خصوصیت حاصل تھی اور ان کی شہرت ان لاکھوں غلاموں کے دم سے تھی جنہیں باہر بھیجا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب جب کسی یورپی ریاست کا سربراہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر افلاس زدہ پسماندہ ممالک کی حمائت کا اعلان کرتا ہے تو ہمارے سر تشکر سے جھک نہیں جاتے۔اس کے برعکس ہم خود سے یہ کہتے ہیں ''یہ تو محض تاوان ہے جو وہ ہمیں ادا کرے گا۔'' نہ ہی ہم پسماندہ ممالک کی اس امداد کو کوئی خیراتی کام تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔اس امداد کو دوطرفہ احساس اجاگر کرنا چاہئے، ایک جانب استعمارزدہ ممالک کا احساس کہ یہ ان کا جائز حصہ ہے اور دوسرے سرمایہ دارانہ طاقتوں کا احساس کہ یہ ان کو ادا کرنا ہی چاہئے۔(16) کیونکہ اگر سرمایہ دار ملکوں نے دانش کی کمی کے باعث (احسان شناسی کی کمی کا ہم ذکر نہیں کرتے) ادا کرنے سے انکار کیا تو ان کے اپنے نظام کی بے رحم جدلیت ان کا گلہ گھونٹ دے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ نوآزاد ممالک نجی سرمایہ کاری کے لئے زیادہ کشش کا باعث نہیں بنتے۔ایسی بہت سی وجوہات ہیں جس کے مطابق یہ جائز ہے اور جو اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ اجارے دار اپنا سرمایہ کیوں روک لیتے ہیں۔ جونہی سرمایہ داروں کو علم ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ سب سے پہلے تو انہیں ہی علم ہوتا ہوگا کہ ان کی حکومتیں ختم استعماریت کے لئے تیار ہو رہی ہیں تو وہ اس نوآبادی سے اپنا تمام سرمایہ نکال لینے میں ذرا بھی دیر نہیں کرتے۔نوآبادیوں میں سے

سرمائے کا حیرت انگیز اخراج ختم استعماریت کی ایک مستقل صورت حال ہے۔

جب نجی اداروں کو آزاد ممالک میں سرمایہ کاری کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ ایسی شرائط پیش کرتے ہیں جو عملی طور پر یا تو نا قابل قبول ہوتی ہیں یا نا قابل عمل۔ سمندر پار سرمایہ لگا کر سرمایہ دار فوری منافع کے اصول پر عمل کرتا ہے اور طویل المدت سرمایہ کاری کے بارے میں بہت ہی محتاط رہتا ہے۔ وہ ان منصوبوں کے مجوزہ پروگراموں کے بارے میں جو ایسی حکومتوں کے نوعمر افراد بناتے ہیں، اکثر کھلے بندوں مخاصمانہ رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ مجبوراً وہ قرضہ دینے کے لئے رضامند بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس شرط پر کہ اس رقم سے تیار شدہ مصنوعات و آلات ہی خریدے جائیں گے تا کہ دوسرے الفاظ میں اس قرضہ سے مادر وطن کے کارخانے چلتے رہیں۔

درحقیقت مغربی سرمایہ دار اداروں کی یہ احتیاط اس لئے ہوتی ہے کہ وہ کوئی خطرہ مول لیتے ڈرتے ہیں۔ وہ سیاسی استحکام اور پرسکون معاشرتی فضا کا مطالبہ بھی کرتے ہیں جن کا حصول آزادی کے فوراً بعد کی عام خوف وہراس کی فضا میں ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ پس کسی ایسی ضمانت کا بیکار تقاضا کرتے ہوئے جو سابقہ نوآبادی دے ہی نہیں سکتی وہ فوجی چوکیاں قائم کرنے یا نوعمر ریاست کو فوجی اور اقتصادی معاہدوں میں شامل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ نجی ادارے بھی اپنی حکومت پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ ان ممالک میں کم از کم فوجی اڈے ہی قائم کر دیئے جائیں تا کہ ان کے مفادات کے تحفظ کی تو ضمانت ہو سکے اور آخری حربے کے طور پر یہ ادارے اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان سرمایہ کاریوں کی ضمانت دے جو وہ فلاں اور فلاں پسماندہ علاقے میں کرنا چاہتے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ بہت کم ممالک اجارے داروں کے مطالبات کو پورا کرتے ہیں۔ لہٰذا سرمایہ اخراج کا محفوظ راستہ نہ پاتے ہوئے یورپ میں محصور ہو کر منجمد ہو جاتا ہے۔ اس پر اور بھی جمود اس لئے طاری ہو جاتا ہے کہ سرمایہ دار خود اپنے ملک میں بھی سرمایہ کاری سے انکار کر دیتے ہیں کیونکہ اس صورت میں ایک تو منافع بہت کم ہوتا ہے اور دوسرے حکومت کے خزانے کا کنٹرول بڑی ہمت والوں کو بھی مایوس کر دیتا ہے۔

انجام کار صورت تباہ کن ہوتی ہے۔ سرمایہ گردش کرتا ہی نہیں۔ یا پھر یہ گردش بے حد کم ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود کہ کثیر رقوم فوجی بجٹ نگل لیتے ہیں، بین الاقوامی سرمایہ داری مایوس کن حالات میں پھنسی ہوتی ہے۔

لیکن اسے ایک اور خطرے کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ جب خودغرض اور عیار مغربی قومیں تیسری دنیا کو نظرانداز کرنے، ماضی کی جانب دھکیلنے، یا کم از کم اس پر جمود طاری کرنے کی کوشش کریں گی تو پسماندہ ممالک کے عوام اپنی اقتصادی خودمختاری کے اندر رہتے ہوئے ارتقائی سلسلہ جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیں گے۔ اس طرح مغربی صنعتیں جلد ہی اپنی بیرونی منڈیوں سے محروم ہو جائیں گی۔ مشینیں گوداموں میں مصنوعات کا ڈھیر لگاتی جائیں گی اور یورپی منڈی میں سرمایہ داروں اور تاجروں کے درمیان ایک بے رحم مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ جب کارخانے بند ہو جائیں گے، مزدوروں کو چھٹی مل جائے گی، اور بے کاری بڑھے گی تو یہ عوامل یورپی مزدور طبقے کو سرمایہ دار حکومت کے خلاف ایک کھلی جدوجہد پر مجبور کر دیں گے۔ تب اجارہ داروں کو احساس ہوگا کہ ان کا حقیقی فائدہ پسماندہ ممالک کو امداد دینے میں ہی ہے، ایسی امداد جو بے غرض ہو اور بغیر بہت سی شرائط کے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تیسری دنیا کی نوعمر اقوام سرمایہ دار ملکوں کو مراعات دینے میں غلطی پر ہیں۔ ہم اپنے طور پر اور اپنے نقطہ نظر کی سچائی کے اعتبار سے بہت مضبوط ہیں۔ اس کے برعکس ہمیں سرمایہ دار ممالک کو یہ جتا دینا چاہیے اور ان پر واضح کر دینا چاہیے کہ اس دور کا بنیادی مسئلہ ان کے اور سوشلسٹ نظام کے درمیان کش مکش نہیں ہے۔ سرد جنگ کو ختم ہو جانا چاہیے کہ اس کا انجام کچھ نہیں ہے۔ دنیا کو جوہری طاقت سے لیس کرنے کا پروگرام ختم ہونا چاہیے اور پسماندہ ممالک میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری اور ان کی فنی امداد ہونی چاہیے۔ اس سوال کے جواب پر دنیا کی تقدیر کا دار ومدار ہے۔

مزید برآں ان گنت فاقہ زدہ رنگ دار لوگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سرمایہ دار حکومتوں کو ''یورپ کی تقدیر'' کے نام پر اشتراکی ممالک کی امداد حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ کرنل گارگرین کے کارنامے پر جنرل ڈیگال کو مطلق خفگی نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کہ ان کی یہ فتح مندی یورپ کے لئے باعث تکریم ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے سرمایہ دار ملکوں کے سیاست دانوں نے سوویٹ یونین کے بارے میں کچھ مبہم سا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ اپنی تمام قوت کو سوشلسٹ نظام کے خلاف متحد کر چکنے کے بعد اب انہیں یہ احساس ہونے لگا ہے کہ انہیں اس کے ساتھ معاملات طے کرنے ہی پڑیں گے۔ لہٰذا اب وہ سوچتی الامکان خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں، ہر طرح سے مراسم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سوویٹ عوام کو ہمہ وقت یاد دلاتے رہتے ہیں کہ آخر وہ بھی تو ''یورپی'' ہی ہیں۔

وہ ان ترقی پسند قوتوں میں جو انسان کو مسرت سے ہمکنار کرنے کی سعی کر رہی ہیں۔ اس خطرے کے اعلان سے پھوٹ نہ ڈال سکیں گے کہ تیسری دنیا کا سیلاب سارے یورپ کو ہڑپ کرنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔ تیسری دنیا کا مقصد یہ نہیں ہے کہ پورے یورپ کے خلاف بھوک کے ایک جہاد کی تنظیم کرے۔ ان لوگوں سے جنہوں نے صدیوں اسے اپنی غلامی میں رکھا، اس کی توقعات یہ ہیں کہ وہ انسانیت کی بحالی میں اس کی مدد کریں گے اور انسان کو ہر جگہ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فتحیاب کرائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ہم اتنے معصوم ہو سکے گا۔ یہ عظیم کام، نوع انسانی کو، تمام کی تمام نوع انسانی کو دنیا میں از سر نو متعارف کرانے کا کام، یورپی عوام کی ناگزیر امداد سے ہو گا، جنہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ماضی میں استعماریت کے معاملات میں وہ اکثر ہمارے اور اپنے مشترکہ آقاؤں کی صف میں شامل رہے ہیں اس کے لئے یورپی لوگوں کو سب سے پہلے بیدار ہو کر اپنے آپ کو جھنجھوڑنے، اپنے ذہن کو بیدار کرنے اور ''حسن خوابیدہ'' کا احمقانہ کھیل ترک کر دینے کا فیصلہ کر لینا چاہئے۔

بیساختگی...اس کی قوت اور کمزوری

تشدد کا یہ جائزہ ہمیں قومی جماعتوں کے راہنماؤں اور عوام کے انبوہ کے درمیان موجود زمانی تفاوت یا بے آہنگی کے مطالعے کی جانب لے جاتا ہے۔ ہر سیاسی یا مزدور اتحادی تنظیم میں، عوامی کارکنوں کا مطالبہ فوری فلاح و بہبود ہوتا ہے۔ اور چونکہ رہنما ان دشواریوں سے شناسا ہوتے ہیں جو مالک پیدا کر سکتا ہے لہٰذا وہ مزدوروں کے مطالبات محدود کرنے اور انہیں روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس ان دونوں کے درمیان ایک روایتی فاصلہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اکثر اس مستقل بے اطمینانی سے آگاہ ہوتے ہیں جو عام کارکنوں کے دل میں اپنے راہنماؤں کے بارے میں پائی جاتی ہے۔ ایک دن ان کے مطالبات کے لئے مظاہرے کرنے میں گذار کر، راہنما تو اپنی فتح منانے لگتے ہیں لیکن عام کارکن اس شدید شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ اپنے مطالبوں کی حمایت میں بہت سے مظاہروں اور مزدور اتحاد کے مطالبات میں اضافے کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ کارکن عوام کی سیاسی تعلیم ہو سکے۔ مزدور اتحاد کا سیاسی طور پر باخبر رکن وہ شخص ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ مقامی جھڑپ اس کے اور مالکوں کے درمیان آخری فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مقامی دانشور بھی، جو اپنے اپنے ''مادر وطن'' میں سیاسی

جماعتوں کے نظام کا مطالعہ کر لیتے ہیں، بڑی احتیاط کے ساتھ اس قسم کے اداروں کی تنظیم اپنے ملک میں کرتے ہیں تا کہ عوام میں بیداری پیدا کی جا سکے۔ اور نوآبادیاتی انتظامیہ کو متاثر کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جا سکے۔ استعمار زدہ ملکوں میں سیاسی جماعتوں کا ظہور تاجر دانشوروں کے وجود کے متوازی ہوتا ہے یہ دانشور تنظیمی معاملات کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور وہ اس حد تک کہ تنظیم کے اندھے عقیدے کو استعماری معاشرے کے مدلل مطالعے پر بھی فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جماعت کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو نوآباد کار ملک سے برآمد کیا جاتا ہے۔ جدید سیاسی جنگ کا یہ حربہ، ہو بہو بلا کسی ترمیم کے اس حقیقی زندگی پر استعمال کیا جاتا ہے جس میں لاتعداد اختلافات ہوتے ہیں۔ عدم توازن ہوتا ہے اور جہاں غلامی، بیکاری، ٹہ، ہنر مند مزدور طبقہ اور عظیم سرمایہ ساتھ ساتھ موجود ہوتے ہیں۔

سیاسی جماعتوں کی خامی صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس تنظیم جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ سرمایہ دار معاشرے میں مزدور طبقے کی جدوجہد کے لئے تخلیق کی گئی تھی، ایک میکانکی انداز میں استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ اگر ہم خود کو تنظیم کی نوعیت کے حدود میں رکھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں تبدیلی اور اختراع کی گنجائش ضرور ہے۔ پسماندہ علاقوں کی بیشتر سیاسی جماعتوں کی بڑی غلطی اور ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ روایتی خطوط پر چلتے ہوئے سب سے پہلے ان عناصر کی جانب متوجہ ہوتی ہیں جو سیاسی طور پر سب سے زیادہ باشعور ہوتے ہیں، یعنی شہروں کا محنت کش طبقہ، ہنر مند طبقہ اور سرکاری ملازمین، گویا آبادی کا محض ایک قلیل حصہ جو بمشکل ایک فیصد سے زیادہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس کے باوجود کہ یہ پرولتاری طبقہ سیاسی جماعت کی مطبوعات پڑھتا اور اس کے پروپیگنڈے کو سمجھتا ہے، یہ قومی آزادی کی خوفناک جدوجہد کو حرکت میں لانے والے احکامات کو ماننے کے لئے کم ہی تیار ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ ہم اس بات پر زور دیں کم ہے کہ ''شہری پرولتاری'' نوآبادیاتی آبادی کا مرکز ہوتا ہے جس پر استعماری حکومت بہت زیادہ نوازشیں کرتی ہے۔ شہروں کا ابھرتا ہوا پرولتاری مقابلتاً زیادہ بہتر حالت میں ہوتا ہے۔ سرمایہ دار ملکوں میں مزدور طبقے کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہوتا اور بالآخر ہر قسم کا فائدہ انہیں کو ہوتا ہے۔ استعمار زدہ علاقوں میں مزدور طبقہ سب کچھ کھو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ استعمار زدہ طبقہ قوم کا وہ جزو ہوتا ہے جو استعماریت کی مشین کو اچھی طرح چلانے کے لئے لازمی اور بے بدل ہوتا ہے۔ اس میں بسوں کے کنڈکٹر، ٹیکسیوں کے ڈرائیور، کان کن، بندرگاہ کے مزدوروں، مترجم اور نرسیں

وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ عناصر ہیں جو قومی جماعتوں سے سب سے زیادہ قابل اعتماد پیروکار ہوتے ہیں اور جو استعماری نظام میں بہتر درجہ کے حامل ہونے کے سبب استعمارزدہ آبادی کا متوسط طبقہ بھی ہوتے ہیں۔

پس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قومی سیاسی جماعتوں کے پیروشہروں کے باسی ہیں، یعنی دوکانوں کے سیلز مین، صنعتی مزدور، دانشور اور دوکاندار، وہ سب جو زیادہ تر شہر ہی میں رہتے ہیں۔ ان کا انداز فکر بہت سی باتوں میں اس نسبتاً خوشحال طبقے کا سا ہوتا ہے جس کا امتیازی نشان فنی ترقی ہے۔ اسی طبقے سے وہ جنم لیتے ہیں۔ ان پر جدید خیالات مسلط ہوتے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو لغو روایات کے خلاف جدوجہد کرتا ہے، پرانے رسوم کو بدلتا ہے، اور اس طرح اس ستون کے ساتھ کھلے بندوں ٹکر لیتا ہے۔ جس کے ساتھ قوم ٹیک لگائے ہوتی ہے۔

قومی جماعتوں کی بڑی اکثریت دیہی علاقوں کے لوگوں پر شدید بے اعتمادی کا اظہار کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے یہ لوگ بہ حیثیت مجموعی ایک بنجر جمود میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قومی جماعتوں کے اراکین (شہری مزدور اور دانشور) بھی نو آبادکاروں کی طرح دیہاتی علاقوں کے بارے میں ناپسندیدہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر ہم دیہی علاقوں کے بارے میں سیاسی جماعتوں کی اس بے اعتمادی کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ استعماریت نے ان علاقوں کے جمود کی حوصلہ افزائی کر کے ہی اکثر اپنے تسلط کو مضبوط اور مستحکم بنایا ہے۔ مرابطوں، عاملوں اور روایتی سرداروں کے چکر میں پھنسی ہوئی دیہی آبادی کی اکثریت، اب بھی جاگیری دور کے اندز میں زندگی بسر کرتے ہے، اور قرون وسطیٰ کے اس سماجی ڈھانچے کی پوری قوت کو نو آبادکار کے فوجی اور انتظامیہ کے حکام مستحکم رکھتے ہیں۔

لہٰذا اب اس نئے قومی متوسط طبقے کا جو بنیادی طور پر تجارت میں دلچسپی رکھتا ہے، بہت سے مختلف النوع میدانوں میں جاگیردار آقاؤں سے مقابلہ ہوتا ہے۔ مرابط اور عامل، بیماروں کو ڈاکٹری مشورہ سے باز رکھتے ہیں۔ پیر فیصلے صادر کر کے قانون دانوں کا وجود بیکار بنا دیتے ہیں، قائد اپنا سیاسی اور انتظامی اثر ورسوخ استعمال کر کے تجارت میں آجاتے ہیں یا بسیں چلانا شروع کرتے ہیں۔ پھر روایتی سردار ہیں جو مذہب اور روایات کے نام پر تجارتوں کے قیام اور نئی اشیاء کے تعاوف کی مخالفت کرتے ہیں۔ مقامی تاجروں اور تھوک فروشوں کا ابھرتا ہوا طبقہ ترقی کرنے کے لئے ان رکاوٹوں اور پابندیوں کا خاتمہ چاہتا ہے۔ جاگیرداروں کے سائے میں چلنے والے مقامی خریدار اب یہ جان جاتے ہیں کہ انہیں نئی چیزیں

خریدارنے کوکم وبیش ممانعت ہے، لہٰذا وہ ایک ایسی منڈی بن جاتے ہیں جس کے لئے تگ ودو شروع ہو جاتی ہے۔

جاگیردار رہنما مغرب پسند قوم پرستوں اور عوام الناس کے درمیان ایک دیوار بن جاتے ہیں۔ جب کبھی بھی یہ دانشور طبقہ دیہاتی عوام تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو قبائلی سردار، برادریوں کے سربراہ اور روایتی چودھری اپنی تسبیحوں، دھمکیوں اور برادری سے خارج کر دینے کے عمل کو تیز تر کر دیتے ہیں۔ یہ روایتی سردار جنہیں قابض نوآبادکاری سے قوت کی تائید حاصل تھی دیہاتی عوام کے ساتھ دانشور طبقہ کے رابطے کو غیر پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شہر سے آنے والے اثرات کی وجہ سے جو خیالات جنم لیں گے وہ اس ساکن وجامد اور لافانی جاگیردارانہ نظام کی ماہیت کو ہی للکاریں گے۔ لہٰذا ان کی دشمنی قابض قوت سے نہیں ہوتی جس کے ساتھ وہ ہمیشہ سے اچھی طرح نباہ کرتے آئے ہیں بلکہ جدید خیالات کے ان لوگوں سے ہوتی ہے جو قدیم معاشرے کو اکھاڑ پھینکنے کے درپے ہیں اور اس طرح ان کے منہ سے نوالہ چھین لینا چاہتے ہیں۔

یہ مغرب پسند عناصر کاشت کاروں کی ایک بڑی تعداد کے بارے میں اسی قسم کے احساسات رکھتے ہیں جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں شہری مزدوروں کے ہوتے ہیں۔ متوسط طبقے اور مزدور طبقے کے انقلاب کی تاریخ بتاتی ہے کہ کاشت کار عوام کی غالب اکثریت بسا اوقات انقلاب کے لئے ایک رکاوٹی عنصر بنا جاتی ہے۔ بالعموم صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں بحیثیت مجموعی کاشت کار سب سے کم آگاہ، سب سے زیادہ غیر منظّم اور اس کے ساتھ ساتھ بے انتہا انتشاری عنصر ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں متنوع خصوصیات پائی جاتی ہیں، انفرادیت، نظم وضبط کی عدم موجودگی، مال ودولت کی خواہش اور اس کے ساتھ ناقابل ضبط غصے اور شدید مایوسی کے میلانات۔ یہ سب چیزیں کردار کے ان خطوط کو ظاہر کرتی ہیں جو واضح طور پر رجعت پسندانہ ہوتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قومی جماعتیں طریق کار کے سلسلے میں مغربی سیاسی جماعتوں کی نقالی کرتی ہیں اور یہ بھی کہ وہ اکثر اپنے پروپیگنڈے کا رخ دیہاتی عوام کی جانب نہیں موڑتیں۔ درحقیقت اگر استعمار زدہ معاشرے کا عقلی تجزیہ کیا جاتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ دیہاتی عوام روایات کے اس پس منظر میں زندہ رہتے ہیں جہاں سماج کا روایتی ڈھانچہ اسی طرح سے قائم ہے۔ جب کہ صنعت یافتہ ممالک میں، صنعتی

ترقی روایتی ڈھانچہ کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ نو آبادیات میں ابھرتے ہوئے مزدور طبقے کی بنیادوں میں ہی آپ کو انفرادی کردار نظر آئے گا۔ کاشت کار جن کے پاس اپنی زمینیں نہیں ہوتیں، جو لمپن پرولتاری طبقہ کی تشکیل کرتے ہیں، دیہاتوں کو چھوڑ کر، جہاں ان کی زندگی کبھی حل نہ ہونے والے بیشتر مسائل میں گھری ہوتی ہے، شہروں کی جانب بھاگتے ہیں اور جھگیوں میں آباد ہو کر استعماری حکومت کی بنائی ہوئی بندرگاہوں اور شہروں میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیہاتیوں کی اکثریت اسی سخت ڈھانچے میں زندگی گذارتی رہتی ہے، اور فالتو لوگوں کے لئے آخری چارہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ پیٹ بھرنے کے لئے آبادی کے مراکز کی طرف نکل جائیں۔ وہ دیہاتی جو باہر نہیں جاتا بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنی روایات کی حفاظت کرتا رہتا ہے اور استعماری معاشرے میں اس ضابطہ پرست عنصر کا ساتھ دیتا ہے جس کا مفاد اس میں ہے کہ سماجی نظام کو برقرار رکھا جائے۔ یہ درست ہے کہ زندگی کا یہ نہ تبدیل ہونے والا انداز جو بے لوچ سماجی ڈھانچے کے سر پر بے رحم موت کی طرح سوار رہتا ہے، بعض اوقات ایسی تحریکوں کو جنم دیتا ہے جن کی بنیادی مذہبی دیوانگی یا قبائلی لڑائیوں پر ہوتی ہے۔ لیکن اپنی بے ساختہ تحریکوں میں دیہاتی لوگ بحیثیت مجموعی منظّم اور بے غرض ہی رہتے ہیں۔ فرد برادری کے مفاد میں اپنی انفرادیت کو ایک طرف کھسکا دیتا ہے۔

دیہاتی شہر کے لوگوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شہری یورپی لباس پہنتا ہے، یورپی زبان بولتا ہے، ان کے ساتھ کام کرتا ہے اور کبھی کبھی انہیں کے علاقے میں رہتا بھی ہے۔ لہٰذا کسان اسے ایسا غدار خیال کرتے ہیں جو پورے قومی ورثے کی ہر شے سے غداری کرتا ہے۔ شہر کے لوگ ''غدار اور بے ایمان'' ہوتے ہیں جن کی قابض حکومت سے خوب نبھتی ہے اور جو استعماری نظام میں رہتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اکثر دیہاتیوں سے یہ سنتے ہیں کہ شہر کے باسیوں میں اخلاق نہیں ہوتا۔ یہاں ہم شہروں اور دیہاتوں کی پرانی مخاصمت کی بات نہیں کرتے۔ یہ ایسی مخاصمت ہے جو استعماریت کے نفع سے محروم مقامی باشندوں اور ان کے نصف ثانی یعنی شہریوں کے درمیان ہوتی ہے جو استعماری استحصال کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ استعماری اس مخاصمت کو قومی جماعتوں کے خلاف اپنی جدوجہد میں خوب استعمال کرتے ہیں۔ وہ دیہاتوں اور پہاڑوں پر بسنے والے لوگوں کو شہریوں کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ وہ اندرون

ملک کو سمندری علاقوں کے سامنے ڈٹا دیتے ہیں۔ قبائیلیوں کو برانگیختہ کرتے ہیں اور اسی باعث کالونڈ جی کو کاسائی کا بادشاہ بنتے دیکھ کر ہمیں تعجب نہیں ہوتا اور نہ ہی چند برس پہلے جب گھانا کے سرداروں نے نکروما کو اپنی انگلیوں پر ناچنے پر مجبور کر دیا تھا یہ کوئی حیران کن بات تھی۔

سیاسی جماعتیں دیہاتی عوام کی تنظیم نہیں کر پاتیں۔ بجائے اس کے کہ وہ موجودہ نظام کو ہی قومی یا ترقی پسندانہ رنگ دینے کی کوشش کریں، وہ استعماری پس منظر میں موجود روایات کو تباہ کر دینے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ قوم میں نیا جذبہ بیدار کرنا ان کے بس کی بات ہے جب کہ فی الحقیقت استعماری نظام کی ڈھالی ہوئی زنجیریں اتنی وزنی ہوتی ہیں کہ وہ جذبہ سر اٹھا ہی نہیں سکتا۔ وہ عوام سے تعلق قائم کرنے کو باہر نہیں نکلتیں۔ وہ اپنا نظریاتی علم لوگوں کی خدمت کے لئے استعمال نہیں کرتیں بلکہ لوگوں کے گرد ایک ایسا ڈھانچہ کھڑا کرنا چاہتی ہیں جس کا نظام کار پہلے ہی سے طے شدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ دار الحکومت سے ایسے کارکنوں کو دیہاتوں میں ''ٹپکا'' دیتی ہیں جو یا تو بہت نوعمر ہوتے ہیں یا بالکل اجنبی اور جو مرکز کی ہدایات سے مسلح ہو کر دیہاتوں اور بستیوں کا کارخانہ سمجھتے ہیں۔

روایتی سردار نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں بلکہ بسا اوقات ان پر عتاب بھی نازل ہوتا ہے۔ مستقبل کی قومی تاریخ کے خالق چھوٹے چھوٹے مقامی تنازعات کو لاتعلقی سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہی تنازعات ہی رہے سہے قومی مسائل ہوتے ہیں۔ انہیں چاہئے تو یہ کہ وہ خود گاؤں کی تاریخ کو جو برادریوں اور قبیلوں میں روایتی اختلافات کی تاریخ ہوتی ہے، ایک مربوط اکائی کی صورت دیں اور اسے اس فیصلہ کن اقدام کے ساتھ ہم آہنگ کریں جس میں وہ سب لوگوں کو شمولیت کی دعوت دیتے ہیں۔ ان بوڑھے بزرگوں کا جن کی ہر روایتی معاشرے میں بڑی عزت کی جاتی ہے اور جنہیں ناقابل اختلاف اخلاقی رتبہ سونپا جاتا ہے، بھرے مجمع میں تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ قابض قوت کے مقامی حکام اس طرح سے پیدا ہونے والی نفرت کو استعمال کرنے سے کبھی نہیں چوکتے اور ہر اس چھوٹے سے چھوٹے فیصلے پر نظر رکھتے ہیں جو اقتدار کی یہ بگڑی ہوئی صورت کرتی ہے۔ ایسے میں پولیس جسے ہر بات کا علم ہوتا ہے اس لئے کہ اسے ذرا ذرا سی تفصیل کا پتہ ہوتا ہے فوراً تشدد شروع کر دیتی ہے۔ باہر سے وارد ہونے والے راہنما، جو نئی اسمبلی کے متوقع اراکین بھی ہوتے ہیں، گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔

ایسی ناکامیاں سیاسی جماعتوں کے ''نظریاتی تجزیے'' کی تصدیق کرتی ہیں۔ دیہاتی عوام کو ساتھ

ملانے کی کوشش کا یہ تباہ کن تجربہ بحیثیت مجموعی ان کے شکوک اور زیادہ مضبوط اور عوام کے اس طبقے کی جانب ان کی جارحیت کو اور بھی واضح کر دیتا ہے۔ قومی آزادی کی جدوجہد کی کامیابی کے بعد بھی یہی غلطیاں کی جاتی ہیں اور یہ غلطیاں مرکزیت کے خاتمے اور خود مختارانہ رجحانات کو قائم رکھنے میں مدد ہوتی ہیں۔ استعماری دور کی قبائلیت قومی دور میں علاقائیت کو جنم دیتی ہے۔ اور جہاں تک اداروں کا تعلق ہے، اس کا اظہار وفاقیت میں ہوتا ہے۔

لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ دیہاتی عوام، اس تھوڑے اثر ورسوخ کے باوجود جو سیاسی جماعتیں ان پر رکھتی ہیں، یا تو قومی شعور کی پختگی کے عمل میں حصہ لے کر یا قوم پرست جماعتوں کے ساتھ کام کر کے، یا پھر کبھی کبھار ان جماعتوں کے بنجر پن کی جگہ تخلیقی قوت کے طور پر اپنے آپ کو پیش کر کے ایک فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ قومی جماعتوں کا پروپیگنڈہ کاشت کاروں کے دلوں میں اپنی بازگشت ضرور پیدا کرتا ہے۔ دیہاتوں میں استعمار دشمن دور کی یادیں زیادہ زندہ و تابندہ رہتی ہیں۔ یہاں عورتیں اب بھی اپنے بچوں کے کانوں میں وہ گیت ڈالتی ہیں، جن کے آہنگ پر جانباز، فاتحین سے لڑنے کے لئے سر بکف نکلے تھے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں دیہاتی بچے ان بزرگوں کے نام جان لیتے ہیں جو گذشتہ بغاوت میں موجود تھے۔ اور بستیوں یا گاؤں میں جو خواب وہ دیکھتے ہیں، وہ شہری بچوں کی طرح روپیہ حاصل کرنے یا امتحان میں پاس ہونے کے خواب نہیں ہوتے بلکہ کسی نہ کسی باغی کے مماثل ہونے کے خواب ہوتے ہیں، جس کی مجاہدانہ موت کا قصہ اب بھی آنکھوں میں آنسو لے آتا ہے۔

اسی وقت جب کہ قومی جماعتیں شہروں میں ابھرتے ہوئے مزدور طبقے کو منظم کرنے میں مشغول ہوتی ہیں، ہمیں دیہاتی علاقوں میں بظاہر مکمل طور پر نا قابل تشریح دھماکے ہوتے سنائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مڈغاسکر میں 1947 کی مشہور بغاوت کو ہی لیجئے، استعماری حکام کا پختہ یقین تھا کہ یہ کسانوں کی بغاوت ہے۔ لیکن ہمیں اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ہمیشہ کی طرح بات اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بڑی بڑی استعماری کمپنیوں نے اپنی طاقت میں بے حد اضافہ کر لیا اور ان زمینوں پر بھی قابض ہو گئیں جو ابھی تک خالی پڑی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جزیرے کو یہودیوں، قبائلیوں اور ویسٹ انڈین مہاجروں سے آباد کرنے کا بھی ذکر چھڑا۔ یہ افواہ بھی بہت گرم تھی کہ ساؤتھ افریقہ کے سفید فام نو آباد کاروں کی مدد سے پورے جزیرہ پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ لہٰذا جنگ کے بعد

قومی سیاسی جماعت کے امیدوار بڑے فاتحانہ انداز سے منتخب ہوئے۔اس کے فوراً بعد ہی ''مڈغاسکر کی بحالی کی جمہوری تحریک'' کے حلقوں پر منظّم تشدد کا آغاز ہو گیا۔ استعماریت نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے روایتی طریقے اختیار کئے۔ وقتاً فوقتاً گرفتاریاں، قبائل کے درمیان نسلیت کا پروپیگنڈہ اور لمن پرولتاری کے غیر منظّم عناصر میں سے ایک نئی جماعت کی تشکیل۔''لاوارث مڈغاسکری'' نام کی اس نئی جماعت نے اپنی واضح طور پر اشتعال انگیز کارروائیوں کے باعث استعماری حکام کو نظم وضبط بحال کرنے کے لئے قانونی جواز فراہم کر دیا۔خود ساختہ جماعت کو نیست و نابود کرنے کا عمل ان مخصوص حالات میں زیادہ شدید اور زیادہ بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ دیہاتی عوام نے جو گذشتہ تین چار برسوں سے دفاعی انداز اختیار کئے ہوئے تھے، اچانک اپنے آپ کو شدید خطرے میں پایا اور انہوں نے وحشیانہ طاقت کے ساتھ استعماری قوتوں کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نیزوں بلکہ زیادہ تر محض لاٹھیوں اور پتھروں سے مسلح ہو کر یہ لوگ قومی آزادی کے لئے عام بغاوت پر اتر آئے۔ہم اس کہانی کا انجام جانتے ہیں۔

ایسی مسلح بغاوتیں، دیہات کے باسیوں کے قومی جدوجہد میں شامل ہونے کے مختلف طریقوں میں سے محض ایک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بعض اوقات جب شہروں میں قومی جماعتیں پولیس کے دباؤ میں آجاتی ہیں تو دیہاتی شہری احتجاج کی روایت جاری رکھتے ہیں۔تشدد کی خبریں دیہاتی علاقوں میں بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر پہنچتی ہیں۔مشہور ہو جاتا ہے کہ رہنما گرفتار کر لئے گئے ہیں، توپیں دنا دن چل رہی ہیں، اور شہر نیگروؤں کے خون سے سرخ ہو رہا ہے یا تھوڑے سے نو آباد کار عربوں کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ لہٰذا جمع شدہ مشتعل نفرت پھٹ پڑتی ہے۔ پڑوس کی پولیس بیرکوں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے اور پولیس کے سپاہیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے، مقامی مدرسے کا استاد قتل ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر محض اس لئے جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوتا ہے کہ وہ گھر سے ہی غائب تھا، وغیرہ وغیرہ۔ امن بحال کرنے کے لئے یہاں فوجیں دوڑائی جاتی ہیں اور اوپر سے ہوائی فوج ان پر گولے برساتی ہے۔تب بغاوت کا پرچم بلند کیا جاتا ہے، پرانی جنگجویانہ روایات پھر سے زندہ ہو جاتی ہیں۔عورتیں حوصلے بڑھاتی ہیں اور مرد منظّم ہو کر پہاڑوں پر مورچے سنبھال لیتے ہیں اور گوریلا جنگ شروع ہو جاتی ہے۔کسان فوری بے ساختگی سے کام لے کر عام عدم تحفظ کو ٹھوس شکل دے دیتے ہیں اور استعماریت خوفزدہ ہو جاتی ہے اور پھر یا تو جنگ جاری رکھتی ہے یا گفت وشنید پر اتر آتی ہے۔

قومی جدوجہد میں کسان عوام کی اس شمولیت کے بارے میں قومی جماعتوں کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قومی جماعتوں کی اکثریت اپنے پروپیگنڈے میں مسلح بغاوت کی ضرورت کو شامل نہیں کرتی۔ یہ جماعتیں بغاوت جاری رکھنے کی مخالفت نہیں کرتیں لیکن وہ اسے دیہاتی لوگوں کے بے ساختہ عمل پر چھوڑ دینے کو ہی کافی سمجھتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی وہ اس نئے عنصر کو ایک طرح سے آسمان سے نازل ہونے والا من وسلویٰ سمجھتی ہیں اور خدا سے دعا کرتی ہیں کہ یہ نزول جاری رہے۔ وہ اس من وسلویٰ سے تو خوب فائدہ اٹھاتی ہیں لیکن بغاوت کی تنظیم کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ وہ لوگوں کو سیاسی تعلیم دینے، ان کے شعور کو بڑھانے یا جدوجہد کو زیادہ بلند سطح پر لے جانے کے لئے راہنماؤں کو دیہاتوں کی طرف نہیں بھیجتیں۔ وہ محض یہ توقع کرتی ہیں کہ ایک بار اپنی ہی حرکی قوت سے آگے بڑھنے کے بعد عوام کی جدوجہد میں ٹھہراؤ نہیں آئے گا۔ شہری تحریک دیہاتی تحریک سے آلودہ نہیں ہوتی۔ دونوں اپنی اپنی جدلیات کے مطابق نشو ونما پاتی ہیں۔

قومی جماعتیں دیہی عوام کو قطعی ہدایات دینے کی کوشش نہیں کرتیں، حالانکہ وہ مکمل طور پر ان کی بات سننے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں۔ وہ انہیں کوئی نصب العین نہیں دیتیں۔ وہ محض یہ توقع رکھتی ہیں کہ نئی تحریک غیر معینہ مدت تک جاری رہے گی۔ اور بمباری اسے ختم نہیں کر سکے گی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایسا موقع ہاتھ آتا بھی ہے تو بھی قومی جماعتیں اس موقع سے جو انہیں دیہی آبادی کو منظم کرنے، سیاسی تعلیم دینے اور ان کی جدوجہد کی سطح بلند کرنے کے لئے میسر آیا تھا، فائدہ نہیں اٹھاتیں۔ اس طرح دیہاتوں پر غیر اعتمادی کا یہ پرانا رجحان مجرمانہ حد تک واضح نظر آتا ہے۔

سیاسی راہنما شہروں میں روپوش ہو جاتے ہیں اور استعماریوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کا بغاوت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا پھر وہ ملک سے باہر پناہ لیتے ہیں۔ یہ کم ہی ہوتا ہے کہ پہاڑوں پر جا کر لوگوں کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ مثال کے طور پر کینیا میں ماؤ ماؤ بغاوت کے دوران ایک بھی قوم پرست نے اس تحریک کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان نہیں کیا اور نہ ہی اس سے منسلک لوگوں کے دفاع کی کوشش کی۔

بدقسمتی سے قوم کے مختلف طبقے کبھی بھی آپس میں سودمند فیصلہ نہیں کر پاتے۔ ان کے درمیان حساب کتاب کبھی صاف نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب آزادی حاصل ہو جاتی ہے، جب دیہاتی لوگوں پر جبر ہو چکتا

ہے، جب استعماریت اور قومی جماعتوں کے درمیان مسائل طے ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ کو ان کے درمیان عدم مفاہمت اور زیادہ بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دیہاتوں کے رہنے والے حکومت کی جانب سے تجویز کی گئی تنظیمی اصلاحات جلد قبول نہیں کرتے اور اسی طرح معاشرتی اصلاحات کو سمجھنے میں بھی سست ہوتے ہیں اس کے باوجود اگر معروضی طور پر دیکھا جائے تو شاید وہ بے حد ترقی پسند ہوں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ موجودہ سربراہوں نے استعماری دور میں عوام پر بحیثیت مجموعی یہ کبھی واضح نہیں کیا کہ ان کی جماعت کے مقاصد کیا ہیں؟ قومی رجحانات کیا ہیں، یا بین الاقوامی سیاست کے کیا مسائل ہیں؟

غیر اعتمادی کا وہ احساس جو دیہی عوام اور جاگیردارانہ نظام میں زندگی بسر کرنے والے، استعماری دور میں جماعتوں کے بارے میں رکھتے تھے۔ اب قومی دور میں بھی اسی شدید مخالفت کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ استعماریت کا جاسوسی کا محکمہ جو آزادی کے بعد ختم نہیں ہوتا، بے اطمینانی کو ابھارے رکھتا ہے اور نوعمر حکومت کے لئے شدید دشواریاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ الغرض حکومت کو آزادی کی جدوجہد کے زمانے کی سستی اور دیہاتیوں کے بارے میں اپنی ہمہ وقت غیر اعتمادی کا معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ قوم کی سربراہی شائد دانش مندانہ ہو بلکہ ترقی پسندانہ بھی، لیکن اس کا دھڑ کمزور، ہٹ دھرم اور غیر معاون ہی رہتا ہے۔

تب انتظامیہ کو مرکزی حیثیت دے کر اور لوگوں کو ایک سخت حلقے میں لے کر اس دھڑ کو شکستہ کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ آپ جو اکثر یہ سنتے ہیں کہ پسماندہ ممالک میں آمریت کی ایک مختصر خوراک کی بھی ضرورت ہوتی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ معاملات کے سربراہ دیہاتی علاقوں کے عوام پر اعتماد نہیں کرتے۔ مزید برآں یہ بے اعتمادی سنجیدہ صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں چند حکومتوں کی مثال دی جا سکتی ہے جو آزادی کے اعلان کے بہت عرصہ بعد بھی، اندرون ملک کو ایک غیر امن پسند علاقہ تصور کرتی ہے اور جہاں حکومت کا سربراہ یا اس کے وزرا محض اسی وقت جا سکتے ہیں جب قومی فوج وہاں پر فوجی مشقیں کر رہی ہو۔ تمام عملی مقاصد کے لئے اندرون ملک کو اجنبیوں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ عجب تضاد ہے کہ قومی حکومت بحیثیت مجموعی دیہی عوام سے تعلقات میں سابقہ استعماری قوت کی بعض خصوصیات کی یاد دلاتی ہے۔ ''ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ یہ لوگ آخر کیا کریں گے؟'' یہ نعرہ اکثر بلند کیا جاتا ہے اور نیا حکمران طبقہ اس بات پر زور دینے سے بھی نہیں جھجکتا کہ اگر ملک کو قرون وسطیٰ کے دور سے آگے نکلنا ہے تو

ان لوگوں کو ڈنڈے کے زور سے ہی ہانکنا پڑے گا۔'' لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، استعماری دور میں سیاسی جماعتیں دیہاتی آبادی کے ساتھ نہایت غلط طریق پر پیش آتی ہیں اور اب یہ بات قومی اتحاد کو محض خراب ہی کرسکتی ہے جب کہ نوعمر قوم کو ایک اچھے آغاز کی ضرورت ہے۔

بسا اوقات استعماریت قومیت کے بڑھتے ہوئے دھارے کو کاٹنے یا اس کا رخ موڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ بجائے اس کے کہ شیخوں یا سرداروں کو شہروں کے ''انقلابیوں'' کے خلا منظّم کریں، مقامی کمیٹیاں، قبیلوں اور برادریوں کو جماعتوں میں منظّم کرتی ہیں۔ شہری جماعت کے مقابلے میں جو ''قومی مقاصد کو اپنانے'' اور استعماری اقتدار کے لئے ایک خطرہ بننے لگی تھیں۔ اب انتشاری گروہ پیدا ہونے لگتے ہیں اور ایسے رجحانات اور جماعتیں جن کی بنیادیں نسلی یا علاقائی اختلافات میں ہوتی ہیں، ابھرنے لگتی ہیں۔ پورے کا پورا قبیلہ ہی استعماریوں کی ہدایت پر اپنے آپ کو ایک جماعت میں ڈھال لیتا ہے۔ اب کانفرنس کی میز بچھانے کا وقت آتا ہے۔ اس جماعت کو جو اتحاد کی حمایت کرتی تھی، انتشاری گروہوں کی جمع تفریق لے ڈوبتی ہے، جبکہ قبائلی جماعتیں مرکزیت اور اتحاد کی مخالفت کرتی ہیں اور اتحاد پسند جماعت کو آمریت کا نام دے کر مذموم کرتی ہیں۔

بعدازاں قومی حزب مخالف بھی یہی ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ قابض قوت ان تین یا چار قومی جماعتوں میں سے جو قومی جدوجہد کی رہنمائی کرتی ہیں، ایک کا انتخاب کرلیتی ہے۔ اس انتخاب کے طریقے خاصے جانے پہچانے ہیں۔ کوئی جماعت پوری قوم کا اعتماد حاصل کرلیتی ہے اور قوم کی واحد نمائندہ کی حیثیت سے قابض قوت پر اپنا اثر ڈالتی ہے تو استعماری قوت بڑی پیچیدہ چالیں چلنی شروع کردیتی ہے اور گفت وشنید میں حتی الامکان تاخیر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ تاخیر اس جماعت کے مطالبات کو بتدریج کم کرنے یا اس کے رہنماؤں کو مجبور کرنے کے لئے ہوتی ہے کہ وہ بعض ''انتہا پسندوں'' کو پس منظر میں ڈال دیں۔

دوسری جانب اگر جماعت بھی قابض قوت کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو قابض قوت کسی ایسی جماعت کو مراعات دینی شروع کردیتی ہے جسے وہ سب سے زیادہ ''معقولیت پسند'' سمجھتی ہے۔ وہ قومی جماعتیں جو اس گفت وشنید میں حصہ لیتی ہیں اس سمجھوتے کی مذمت شروع کردیتی ہیں جس پر اس جماعت اور قابض قوت کا اتفاق ہوتا ہے۔ وہ جماعت جو استعمار پسندوں سے اقتدار حاصل کرتی ہے، اس

خطرے سے آگاہ ہو کر جسے مخالف جماعت کا شدید جذباتی اور پریشان کن رویہ پیدا کرتا رہتا ہے، اپنی حریف جماعتوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کو غیر قانونی قرار دے دیتی ہے۔ عتاب زدہ جماعت کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ شہر کی بیرونی بستیوں میں یا دیہاتی علاقوں میں پناہ ڈھونڈے۔ پھر یہ دیہاتی عوام کو ''بندرگاہ کے غدار اور دارالحکومت کے بددیانت سیاست دانوں'' کے خلاف ابھارتی ہے۔ اس کام کے لئے ہر جواز صحیح ہوتا ہے۔ وہ مذہبی احساسات ہوں یا نئی حکومت کی نئی اختراعات جو پرانی روایتوں کے منافی ہوتی ہیں اور اسی طرح دیگر باتیں۔ دیہات کے رہنے والوں کی جہالت پسندانہ روش سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ نام نہاد انقلابی منشور کی بنیاد درحقیقت دیہاتی علاقوں کی تنزل پسندی، جذباتیت اور بے ساختگی کی فطرت پر ہوتی ہے۔ ادھر ادھر کانا پھوسی کی جاتی ہے۔ کہ پہاڑی علاقے حرکت میں آ رہے ہیں اور دیہی علاقے غیر مطمئن ہیں....افواہ اڑتی ہے کہ فلاں جگہ پر پولیس نے دیہاتیوں پر گولیاں برسائی ہیں، پولیس کی کمک پہنچائی جا رہی ہے اور اب حکومت ختم ہی ہوا چاہتی ہے۔ چونکہ مخالف جماعتوں کا کوئی واضح پروگرام نہیں ہوتا اس لئے حکمران جماعت کی جگہ لینے کے سوا ان کا کوئی اور واضح نصب العین بھی نہیں ہوتا۔ پس یہ مقصد اپنے سامنے رکھ کر وہ اپنی تقدیر جاہل اور جذباتی کسان عوام کے ہاتھوں میں دے دیتی ہیں۔

اس کے برعکس بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مخالف جماعتیں دیہاتی عوام کی جماعت پر انحصار نہیں کرتیں بلکہ نوآزاد قوم کی مزدور اتحادیت میں پائے جانے والے ترقی پسندانہ عناصر پر بھروسہ کرتی ہیں۔ ان حالات میں حکومت دیہاتیوں کو مزدوروں کے مطالبات کی مخالفت کرنے پر اکساتی ہے جنہیں وہ روایت دشمن مہم جو لوگوں کی چالیں کہہ کر مطعون کرتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے بارے میں ہم نے جو حقائق تلاش کئے ہیں وہ، چند جزوی اختلافات کے ساتھ مزدور اتحادیت کی سطح پر بھی نظر آتے ہیں۔ شروع شروع میں نوآبادیاتی علاقوں میں، مزدور اتحاد تنظیمیں قابض ملکوں کی مزدور اتحاد تنظیموں کی باقاعدہ شاخیں ہوتی ہیں اور ان کے احکامات قابض ملک میں دیئے جانے والے احکامات کی بازگشت ہوتے ہیں۔

جب جدوجہد آزادی کسی فیصلہ کن مقام پر آتی ہے تو کچھ مقامی مزدور اتحادی قومی پیمانے پر اتحادی تنظیم کی تشکیل کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ جب مقامی اراکین تنظیم کو چھوڑنے لگتے ہیں تو وہ پرانا ڈھانچہ جسے

قابض ملک سے برآمد کیا گیا تھا، بری طرح مجروح ہوتا ہے۔ نئی اتحادی تنظیموں کی تشکیل شہری آبادی کے ہاتھوں استعمار پر دباؤ ڈالنے والا ایک نیا عنصر ہوتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ نوآبادیات میں مزدور طبقہ ابھی تشکیلی صورت میں ہوتا ہے اور وہ عوام کے اس حصے کی نمائندگی کرتا ہے جسے سب سے زیادہ مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ مزدور اتحادیت شہروں میں آزادی کی جدوجہد کی تنظیم سے جنم لیتی ہے اور اس کا پروگرام زیادہ سے زیادہ سیاسی یا قومی پروگرام ہوتا ہے۔ ایسی قومی اتحادی تنظیم جو قومی آزادی کی جنگ کے فیصلہ کن مراحل کے دوران میں ابھرتی ہے درحقیقت باشعور اور محرک قومی عناصر کی قانونی فہرست ہوتی ہے۔

دیہاتوں کے عوام جنہیں سیاسی جماعتیں نفرت کی نظر سے دیکھتی ہیں، دور دور رکھے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ کاشت کاروں کی بھی ایک اتحاد انجمن لے گی لیکن اس کی تشکیل ''استعماریت کے خلاف ایک متحدہ محاذ'' پیش کرنے کی قطعی ضرورت کا جواب ہوگی۔ وہ مزدور اتحادی عہدے دار جو قابض ملک میں اتحاد تنظیم کے سلسلے میں کارہائے نمایاں سرانجام دے چکے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ دیہی عوام کے انبوہ کی کس طرح تنظیم کی جائے۔ ان کا کاشت کاروں کے ساتھ کائی رابطہ نہیں ہوتا اور ان کا کام محض یہ ہوتا ہے کہ وہ بندرگاہ کے مزدوروں، کان کنوں، اور سرکاری گیس اور بجلی کے کاریگروں کو اپنی تنظیموں میں شامل کریں۔

استعماری دور میں قومی مزدور اتحادی تنظیمیں بہت موثر ضرب لگانے والی قوت ہوتی ہیں۔ شہر میں مزدور اتحادی، استعماری معیشت کی مشین کو روک سکتا ہے یا کم از کم کسی مخصوص لمحے میں اس کی رفتار سست کر سکتا ہے۔ چونکہ یورپی آبادی اکثر شہروں میں ہی محدود ہوتی ہے۔ لہٰذا ان آبادیوں پر ان مظاہروں کا نفسیاتی اثر بہت ہوتا ہے۔ نہ بجلی ہوتی ہے نہ گیس، کوڑوں کے ڈھیر پڑے ہوتے ہیں اور سامان گودیوں میں سڑتے رہتے ہیں۔

قابض ملک کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے، یعنی شہر، کہ استعماری نظام میں ان کی یہی حیثیت ہوتی ہے، مزدور اتحاد کاروائیوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ دارالحکومت جو استعماریت کا قلعہ ہوتا ہے، ان کی ضربوں سے لرزتا رہتا ہے۔ لیکن ''اندرون ملک'' دیہاتیوں کا انبوہ۔ اس تصادم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ قومی نقطہ نظر سے مزدور اتحاد کی اہمیت اور باقی ماندہ قوم میں توازن ناپید ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد وہ مزدور اتحاد تنظیم میں شامل ہوتے ہیں، خود کو خلا میں محسوس کرتے ہیں۔ وہ محدود نصب العین جو اپنے سامنے رکھتے ہیں، اسی لمحے سے جب اس کا حصول ہو جاتا ہے، قومی تعمیر نو کے کام کی وسعت کے سامنے بے حد چھوٹا نظر آتا ہے۔ جب قومی متوسط طبقے سے، جس کے حکومت کے ساتھ تعلقات اکثر بہت قریبی ہوتے ہیں، ان کا سامنا ہوتا ہے تو مزدور اتحاد رہنماؤں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو محض مزدور طبقے کے احتجاجوں تک ہی محدود نہیں رکھ سکتے۔ چونکہ وہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے دیہاتوں سے الگ تھلگ ہوتی ہیں، اور نواحی بستیوں کا باہر ہدایات دینے کی اہل نہیں ہوتیں لہٰذا مزدور اتحاد انجمنیں دن بدن سے زیادہ سیاسی رجحانات کی حامل ہوتی جاتی ہیں۔ فی الحقیقت اب وہ حکومت کی قوت حاصل کرنے کی امیدوار بن جاتی ہیں۔ وہ متوسط طبقے کو بہر طور گھیرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ قومی حدود میں غیر ملکی اڈوں کی موجودگی کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ تجارتی معاہدوں کی ملامت کرتی ہیں اور قومی حکومت کی خارجہ پالیسی کی مخالفت کرتی ہیں۔ مزدوروں کو جنہیں ''آزادی'' مل چکی ہے اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ آگے کیا کریں۔ اعلان آزادی کے ایک دن بعد سے ہی مزدور اتحادیت کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے معاشرتی مطالبات کو زیادہ واضح کر دے تو پوری قوم حیرت زدہ ہو جائے گی۔ اس لئے کہ درحقیقت مزدور آبادی کا وہ حصہ ہیں، جنہیں سب سے زیادہ مراعات حاصل ہوتی ہیں اور جو عوام میں سب سے زیادہ خوشحال جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر وہ تحریک جو ساحلی مزدوروں اور کاریگروں کی حالت بہت بنانے کے لئے جدوجہد کرے گی، نہ صرف یہ کہ بہت غیر مقبول ہو گی بلکہ مراعات سے محروم دیہاتی آبادی میں منافرت پیدا کرنے کا خطرہ بھی مول لے گی۔ مزدور اتحادیت، جس کے لئے مزدور اتحاد کا سب کام ممنوع ہو چکا ہے اب محض وقت گذارتی ہے۔

یہ غیر صحت مندانہ صورت حال اب ایک ایسے معاشرتی پروگرام ناگزیر ضرورت کا اظہار کرتی ہے جو پوری قوم کو بحیثیت مجموعی متاثر کر سکے۔ اچانک مزدور اتحادیت کو احساس ہوتا ہے کہ اندرون ملک کو بھی باشعور اور منظّم کرنا چاہئے۔ لیکن چونکہ انہوں نے کبھی اپنے اور کاشت کاروں کے درمیان عملی رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، اور چونکہ محض یہ کاشت کار طبقہ ہی ملک کی اکلوتی بے ساختہ انقلابی قوت ہوتا ہے، اس لئے مزدور اتحادیت محض اپنی نااہلی کا ہی ثبوت دے گی اور اسے خود ہی اپنے پروگراموں کی

تاریخی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔

مزدور اتحادی راہنما جو مزدور طبقے کی سیاسی کارروائیوں میں بہت زیادہ مشغول ہوتے ہیں۔ اب خود بخود حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے ہیں، لیکن یہاں پھر اندرون ملک کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ تو مزدور اتحاد کارکنوں اور قومی متوسط طبقے کے درمیان محض ایک محدود حد تک ہی حساب کتاب چکانے کی بات ہوتی ہے۔ قومی متوسط طبقہ، استعماریت کی روایت پر چلتے ہوئے، فوج اور پولیس کی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے، بلکہ اتحادی تنظیمیں بڑے بڑے جلسے بلاتی ہوئے، فوج اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کو متحرک کرتی ہیں۔ کاشت کار جب اس قومی متوسط طبقے کو اور ان مزدوروں کو دیکھتے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کا ملتا ہے تو وہ بے نیازی دکھاتے ہیں۔ کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ دونوں فریقین اپنا پلہ بھاری رکھنے کے لئے ان کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ اتحادی تنظیمیں، سیاسی جماعتیں اور حکومت سب کی سب کسانوں کے انبوہ کو اندھی، جامد اور وحشی قوت کے طور پر اپنی غیر اخلاقی خود غرضیوں کی خاطر استعمال کرتی ہیں۔

دوسری جانب، بعض حالات دیہاتی لوگ بڑے فیصلہ کن انداز میں قومی آزادی کی جدوجہد میں بھی اور ان راستوں کے تعین کے لئے بھی جو مستقبل کی قوم اپنے لئے انتخاب کرتی ہے، حصہ لیتے ہیں۔ پسماندہ ممالک میں یہ مظہر بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی لئے ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سیاسی جماعتوں میں استعماریت ختم کرنے کی خواہش کے ساتھ ایک بالکل متضاد خواہش استعماریت کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کر لینے کی بھی ہوتی ہے۔ ان جماعتوں میں بعض اوقات یہ دونوں سلسلے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ سب سے پہلے تو جب دانشور عناصر استعماریت کی حقیقی ماہیت اور بین الاقوامی صورت حال کا تفصیلی تجزیہ کر لیتے ہیں تو وہ اپنی جماعت کے نصب العین کی عدم موجودگی اور اس کے حربوں اور طریق کار کی نااہلی پر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے راہنماؤں سے اہم نکات کے متعلق مسلسل سوالات کرتے رہتے ہیں۔ ''قوم پرستی کیا ہے؟ اس لفظ کو آپ کیا معنی دیتے ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟'' وہ یہ سوالات پوچھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ طریق کار کا مسئلہ سب سے پہلے اچھی طرح طے ہو جانا چاہئے۔ وہ یہ رائے بھی دیتے ہیں کہ انتخابی ذرائع کے ساتھ

''باقی تمام ذرائع'' بھی شامل ہونے چاہئیں۔ ابتدائی نوک جھونک کے بعد ہی جماعت کے مستند راہنما اس ''ابال'' کو بچپنے کا نام دے کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ مطالبات محض ابال ہی نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ غیر پختگی کی نشانی ہوتے ہیں لہٰذا وہ انقلابی عناصر جو ان سے منسلک ہوتے ہیں، بہت جلد تنہا رہ جاتے ہیں۔ سالہا سال کے تجربات میں لپٹے ہوئے مستند رہنما بڑی بے رحمی کے ساتھ ان ''مہم پرستوں اور انتشار پسندوں'' سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔

جماعتی نظام ہر نئی اختراع کی مخالفت کرتا ہے۔ انقلابی اقلیت اپنے آپ کو تنہا پاتی ہے، اور اس کے سامنے وہ راہنما ہوتے ہیں جو اس خیال سے فکر مند اور خوفزدہ نظر آتے ہیں کہ یہ گرداب، جس کی نوعیت، شدت اور رخ کے بارے میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتے، کہیں انہیں بہا کر نہ لے جائے۔ دوسرے سلسلے کا تعلق ان راہنماؤں سے اور ان کے دست راست ساتھیوں سے ہے جو استعماریوں کے زمانے میں پالیس کے تشدد کا شکار رہے تھے۔ یہاں اس امر پر زور دینا ضروری ہے کہ یہ لوگ اپنے انتھک کام اپنے جذبہ قربانی اور بے حد مثالی حب الوطنی کی بنا پر جماعت کی سربراہی تک پہنچے ہیں۔ یہ لوگ جو بہت نچلی سطح سے اوپر کی منزلوں تک پہنچتے ہیں، محنت مزدوری کرنے والے اور بعض اوقات دیرینہ طور پر بے روزگار انسان ہوتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں میں ان کا زور و شور محض سیاست میں حصہ لینا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس واحد طریقے کا انتخاب ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ حیوان کے درجے سے انسان کے رتبے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جن کی راہ میں جماعت کی قانون دانی حائل ہوتی رہتی ہے، اپنے اس عمل کی حدود میں رہ کر جس کے کہ وہ ذمہ دار ہیں۔، حرکت و عمل، جرات اور اس جدوجہد کی اہمیت کا مظاہرہ کرتے ہیں جس کے باعث انہیں استعماراتی تشدد کا شکار بننا پڑتا ہے۔ انہیں گرفتار کیا جاتا ہے، سزا دی جاتی ہے، اذیت پہنچائی جاتی ہے اور بالآخر معاف کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ جیل خانوں میں پڑے پڑے اپنے خیالات نکھارنے اور اپنے ارادوں کو مضبوط کرنے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ بھوک ہڑتالوں اور قید خانے کی برادری کے سہارے وہ جیتے رہتے ہیں اور اپنی رہائی کی امید لگائے رہتے ہیں جسے وہ مسلح جدوجہد کے آغاز کے لئے ایک موقع خیال کرتے ہیں۔ لیکن انہیں لمحات میں قید خانوں کے باہر استعماریت جس پر چاروں جانب سے حملہ ہوتا رہتا ہے، قومی اعتدال پسندوں کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔

پس ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح جماعت کے قانونی اور غیر قانونی رجحانات کے درمیان قطع

تعلق ہو جاتا ہے۔ غیر قانونی اقلیت کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ ناپسندیدہ ہیں اور ہم لوگ ان سے دور ہی رہنا چاہتے ہیں۔ جماعت کے قانون پسند ارکان ان کی مدد کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔لیکن ان دو رجحانات کے درمیان تو پہلے ہی سے پھوٹ پڑ چکی ہوتی ہے۔اس لئے غیر قانونی عناصر ان دانشوروں کے ساتھ رابطہ قائم کرتے ہیں جن کے رجحانات سے وہ چند برس پہلے ہی آشنا ہو چکے ہوتے ہیں۔اب ان دو عناصر کے ملاپ کا نتیجہ ایک خفیہ تحریک ہوگی جو قانون پسند جماعت ہی کی ایک شاخ ہوگی۔لیکن جوں جوں قانونی جماعت استعماریت کے قریب ہوتی جائے گی اور اس میں ''اندر سے'' تبدیلیاں لانے کی کوشش کرے گی، ان بھٹکے ہوئے عناصر پر تشدد تیز ہوتا جائے گا۔اس طرح غیر قانونی اقلیت خود کو تاریخ کی اندھیری گلی میں بھٹکتا ہوا پاتی ہے۔

جب شہر ان سے قطع تعلق کر لیتا ہے تو یہ لوگ پہلے نواحی بستیوں میں جا کر رہتے ہیں۔لیکن پولیس جلد ہی ان کے گرد جال ڈالتی ہے اور انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے شہر چھوڑ جائیں اور سیاسی منظر سے الگ ہو جائیں۔ وہ سب دیہاتوں اور پہاڑوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور کاشت کاروں پر بھروسہ کرتے ہیں۔شروع ہی سے کاشتکار ان کے گرد حلقہ ڈال لیتے ہیں اور پولیس کی گرفت سے انہیں محفوظ رکھتے ہیں۔ان پر جوش قوم پرستوں کا، جو شہری مرکزوں میں پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے کی بجائے خود کو کاشت کاروں کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں، کچھ نقصان نہیں ہوتا۔کسان ایسی نرمی اور مضبوطی کے ساتھ انہیں خود میں سمٹ لیتے ہیں جس کی انہیں توقع بھی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ جنہیں ویرانوں میں دھکیل دیا گیا ہے اور جو اس شہری پس منظر سے جدا ہو گئے ہیں جس میں انہوں نے سیاسی جنگ اور قومیت کے بارے میں اپنے تصورات قائم کئے تھے، ان فی الحقیقت ''ماکوئسرؤ' بن گئے ہیں۔ چونکہ وہ پولیس سے بچنے کے لئے ہمہ وقت ادھر ادھر بھاگتے رہتے ہیں اور بالعموم رات کو نکلتے ہیں کہ لوگوں کی نظروں میں نہ آئیں لہٰذا انہیں اچھا موقع مل جاتا ہے کہ اپنے ملک میں گھوم پھر کر اسے اچھی طرح جان سکیں۔قہوہ خانے، آئندہ انتخابات یا کسی پولیس والے کے بغض و کینہ کے بارے میں سب کچھ بھلا دیا جاتا ہے۔ان کے کان ملک کی حقیقی آواز سنتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں اپنے عوام کی بے حد و حساب غربت کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔اب اس قیمتی وقت کا احساس ہوتا ہے جو استعماری حکومت کے بارے میں بے فائدہ تبصروں پر ضائع ہوا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تبدیلی سے نہ اصلاحات ہوں گی اور نہ حالات بہتر ہوں گے۔

اب وہ، اس حیرت کے ساتھ جواب کبھی ان سے الگ نہ ہوگی، یہ سمجھ جاتے ہیں کہ استعماری حکومت کو ختم کرنے یا اس میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے شہروں کے اندر ہر قسم کا سیاسی اقدام ہمیشہ بے جان ثابت ہوگا۔

یہ لوگ کسانوں سے بات چیت کرتے رہتے ہیں۔ اب انہیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دیہاتی عوام کے انبوہ نے اپنی آزادی کے مسئلے پر تشدد کے استعمال، غیر ملکیوں سے اپنی زمینیں چھین لینے، قومی سطح پر جدوجہد اور مسلح بغاوت کے علاوہ کبھی اور کچھ سوچا ہی نہیں، یہ بالکل سادہ سی بات ہے۔ ان لوگوں کو اب ایسے منظّم عوام کا پتہ چل جاتا ہے جو اعداد و شمار کے مطابق تو، جیسے تھے ویسے ہی رہتے چلے جاتے ہیں لیکن اپنی اخلاقی اقدار اور حب الوطنی کو برقرار رکھتے ہیں۔ وہ ایسے عوام دریافت کر لیتے ہیں جو فیاض، ہمہ وقت بھرپور قربانی دینے کیلئے تیار، بے چین، اور ایک ٹھوس خودداری کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ تشدد پسند عناصر جن کے پیچھے پولیس ہوتی ہے اور عوام کا وہ فولادی انبوہ، جن کی جبلت میں ہی بغاوت چھپی ہوتی ہے، جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک غیر معمولی طاقت سے پھٹ پڑنے والا مادہ تیار ہو جاتا ہے۔ شہر سے آنے والے لوگ عوام کے سخت کوش مدرسے سے سبق سیکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ لوگ فوجی اور سیاسی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لئے جماعتیں کھول دیتے ہیں۔ عوام اپنے ہتھیار تیز کرنے لگتے ہیں۔ یہ جماعتیں زیادہ دیر تک نہیں چلتیں کیونکہ ایک بار پھر لوگوں کو اپنی طاقت بازو کا علم ہو جاتا ہے اور وہ راہنماؤں کو عمل شروع کرنے کے لئے آگے دھکیلتے ہیں۔ یوں مسلح جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔

یہ بغاوت سیاسی جماعتوں کو بدحواس کر دیتی ہے۔ دراصل ان کے منشور نے ہمیشہ ہی قوت آزمانے کے بے فائدہ سمجھا۔ ان کا وجود ہی ہر قسم کی بغاوت کی مذمت سے عبارت ہوتا ہے۔ خفیہ طور پر کچھ سیاسی جماعتیں نوآبادکار کی خوش فہمی میں شامل ہوتی ہیں اور اپنے آپ کو اس بات پر مبارکباد دیتی ہیں کہ وہ اس دیوانگی سے بہت دور ہیں۔ جسے بالآخر قتل عام کے ذریعے دبا دیا جائے گا۔ لیکن ایک مرتبہ تیلی جل جائے تو شعلے جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ بکتر بند گاڑیاں اور ہوائی جہازوں کی مکمل فتح محال ہو جاتی ہے جب یہ مسئلہ پوری طرح کھل کر سامنے آتا ہے تو استعماریت سوچ بچار شروع کرتی ہے۔ خود جابر قوم میں ہی ایسی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور سنی بھی جاتی ہیں، جو اس خطرناک

صورت حال کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔

جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ اپنی جھونپڑیوں اور اپنے خوابوں میں قوم کے نئے آہنگ کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے دلوں اور اپنے سانسوں کی گہرائیوں میں جو شاندار مجاہدوں کی تعریف میں کبھی ختم نہ ہونے والے نغمات الاپتے ہیں۔ بغاوت کی لہر پوری قوم کو بہا کر لے جاتی ہے اور اب وقت آتا ہے کہ جماعتیں پیچھے ہٹا دی جاتی ہیں۔

تاہم انقلاب کے راہنماؤں کو احساس ہو جاتا ہے کہ کسی نہ کسی دن شہر بھی بغاوت میں شامل ہو جائیں گے۔ یہ آگہی محض اتفاقیہ نہیں ہوتی۔ یہ اس جدلیات کا نقطۂ عروج ہوتی ہے جسے قومی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کی روح رواں سمجھیئے۔ باوجود اس کے کہ دیہی علاقے عوام کی قوت کا بے پناہ ذخیرہ ہوتے ہیں اور مسلح افراد کے گروہ اس امر کی ضمانت دیتے ہیں کہ وہاں بدامنی کا دور دورہ رہے گا، استعماریت اپنے نظام کی پائداری کے بارے میں مشکوک نہیں ہوتی۔ اسے کبھی احساس نہیں ہوتا کہ اس کی بنیادیں خطرے میں ہیں۔ لہٰذا باغی راہنما جنگ کو دشمنوں کے کیمپ میں، باالفاظ دیگر عظیم الشان اور پرامن شہروں میں لے آنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

آبادی کے مراکز میں انقلاب کی تنظیم راہنماؤں کے لئے کچھ مسائل پیدا کرتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ شہر کے پروردہ راہنماؤں کی اکثریت شہروں سے اس لئے بھاگ جاتی ہے کہ وہ نوآبادیاتی پولیس کو مطلوب ہوتے ہیں اور سیاسی جماعتوں کی محتاط اور سمجھ بوجھ سے کام لینے والی انتظامیہ بھی انہیں قدر کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ ان کی دیہاتوں کی طرف مراجعت، عتاب سے فرار بھی ہے اور پرانے سیاسی ڈھانچے پر ان کی غیر اعتمادی کی علامت بھی۔ ظاہر ہے کہ ان راہنماؤں کی پذیرائی کرنے والے فطری عناصر وہ مشہور قوم پرست ہونے چاہئیں۔ جو سیاسی جماعتوں میں کافی رسوخ رکھتے ہیں۔ لیکن ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان راہنماؤں کی حالیہ تاریخ، ان مسکین، اعصاب زدہ جماعتی منتظمین کی ہی ایک توسیع ہوتی ہے جو اپنا بیشتر وقت استعماریت کے برے افعال کی مسلسل نوحہ خوانی میں صرف کرتے رہتے ہیں۔

مزید برآں اس سلسلے ملاقات میں ہی جو" کاوئیس کے یہ اراکین اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ شروع کرتے ہیں، بالخصوص ان کے ساتھ جنہیں وہ سب سے زیادہ بائیں بازو کی طرف جھکا ہوا سمجھتے ہیں۔ ان خطرات کی تصدیق ہو جاتی ہے جس کے باعث یہ پرانے دوست اپنے ساتھیوں سے دوبارہ ملنا

جلنا بھی پسند نہیں کرتے۔ درحقیقت وہ بغاوت جس کا آغاز دیہاتوں میں ہو چکتا ہے کسانوں کی آبادی کے اس حصے کے ذریعے شہر میں پہنچے گی، جو شہری مراکز کے بیرونی کناروں پر موجود ہوتا ہے اور جسے استعماراتی نظام سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جنہیں دیہاتوں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور استعماریت کی غاصیت اپنی خاندانی املاک چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے، اس امید پر مختلف شہروں کے گرد مسلسل گھیرا ڈالے رہتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن انہیں بھی داخل ہونے دیا جائے گا۔ دراصل آبادی کے اس انبوہ سے، جھونپڑیوں کے ان باسیوں کے اندر لمپن پرولتاری کی جڑوں سے ہی بغاوت کا شہری ہراول دستہ پیدا ہو گا۔ اس لئے کہ یہ لمپن پرولتاری، فاقہ زدہ لوگوں کا یہ اژدہام، جو اپنے قبیلے اور اپنی برادری سے بچھڑ چکا ہے، استعمار زدہ لوگوں کی سب سے زیادہ بے ساختہ اور سب سے بڑی انقلابی قوت ہوتا ہے۔

کینیا میں ماؤ ماؤ بغاوت سے پہلے چند برسوں میں یہ بات قابل غور تھی کہ کس طرح برطانوی استعماری حکومت نے لمپن پرولتاریوں پر دھمکیوں کے حربوں کو تیز کر دیا تھا۔ 51-1950 میں پولیس اور مشنریوں کے کینیا کے ان نوجوانوں کے مقابلے کے لئے مشترکہ کوششیں شروع کر دیں جو دیہاتوں اور جنگلوں سے شہروں میں امنڈ آتے اور محنت نہ ملنے پر چوری، بدمعاشی اور شراب خوری شروع کر دیتے تھے۔ استعمار زدہ ممالک میں نوجوانوں کی بے راہروی لمپن پرولتاری کے وجود کا براہ راست نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح کانگو میں 1957 کے بعد سے، نوجوان ہنگامہ پسندوں کو، جنہوں نے سماجی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ دیہاتوں میں واپس بھیجنے کے لئے بڑے سخت اقدامات کئے گئے۔ نوبحالی کے کیمپ کھولے گئے اور انہیں ان پادریوں کی تحویل میں دے دیا گیا جن کی حفاظت بلاشبہ بلجیم کی فوج کرتی تھی۔

لمپن پرولتاری کی تشکیل ایک ایسا مظہر ہے جو خود اپنی منطق کے تابع ہے۔ نہ تو پادریوں کی فیاضانہ کوششیں اور نہ ہی مرکزی حکومت کے فرمان اس کی نشوونما کو روک سکتے ہیں۔ یہ لمپن پرولتاری چوہوں کے جھنڈ کی طرح ہوتے ہیں۔ آپ انہیں روندیئے، ان پر پتھر ماریئے لیکن یہ آپ کی تمام کوششوں کے باوجود درخت کی جڑوں کو کاٹتے چلے جائیں گے۔

جھونپڑوں کی بستیاں مقامی باشندوں کے اس حیاتیاتی فیصلے پر اپنی منظوری دیتی ہیں کہ بہر قیمت اور ہر ممکن خفیہ طریق کار سے دشمن کے قلعہ کیا جائے۔ لمپن پرولتاری اگر ایک بار تشکیل پا جائے تو وہ پائے تو وہ اپنی تمام شہر کی ''سلامتی'' کے لئے خطرہ بننے پر لگا دیتا ہے اور استعماری حکومت کے لئے اٹل تباہی کا

نشان اور اس کے دل میں ہمہ وقت رہنے والا ناسور بن جاتا ہے۔ لہٰذا دلال، غنڈے، بے روزگار اور چھوڑے موٹے جرائم پیشہ جنہیں پیچھے سے اکسایا جاتا ہے، مضبوط برسرروزگار لوگوں کی طرح آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ غیر طبقاتی اور بیکار لوگ جو شیلے اور فیصلے کن عمل کی بدولت وہ راہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ غیر طبقاتی اور بیکار لوگ جو شیلے اور فیصلے کن عمل کی بدولت وہ راہ اختیار کرتے ہیں جو قومیت کی طرف جاتی ہے۔ وہ نوآبادیاتی معاشرے کی خوشی کے لئے اپنے کردار کی اصلاح نہیں کرتے، کہ خود کو حاکموں کی اخلاقیات سے ہم آہنگ کر سکیں۔ اس کے برعکس انہیں یقین ہوتا ہے کہ پستولوں اور دستی بموں کے بغیر شہر میں ان کا داخلہ ممکن نہیں۔ اس طرح یہ لوگ جو انسانی سطح سے نیچے اور بیکار ہوتے ہیں، خود اپنی اور تاریخ کی نظروں میں بحال ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ دوشیزائیں جو دو پونڈ مہینہ کماتی ہیں، طوائفیں بھی، انسانیت کی تمام بے کار تلچھٹ، وہ تمام لوگ جو ایک دائرے میں خودکشی اور دیوانگی کے درمیان گھومتے ہیں۔ سب اپنا اپنا توازن بحال کر لیں گے اور ایک بار پھر آگے بڑھیں گے اور بڑے فخر سے جاگی ہوئی قوم کے عظیم جلوس کے ساتھ قدم ملائیں گے۔

قومی جماعتیں اس نئے مظہر کو جو ان کی اپنی شکست وریخت کا پیش خیمہ ہوتا ہے، نہیں سمجھ پاتیں۔ شہروں میں بغاوت کا آغاز جدوجہد کی نوعیت کو بدل دیتا ہے۔ استعماری فوجیں جو پہلے محض دیہاتی علاقوں میں ہی مشغول تھیں، اب ہمیں فوری طور پر شہروں کی جانب بھاگتی نظر آتی ہیں تاکہ شہری آبادی اور اس کی املاک کی حفاظت کی سکیں۔ ظلم و تشدد کی قوتیں ہر جگہ پھیل جاتی ہیں۔ کوئی جگہ خطرے سے خالی نہیں ہوتی۔ اب قوم کی پوری سرزمین پوری کی پوری نوآبادی وجد آفریں کیفیت میں ڈوب جاتی ہے۔ کسانوں کے مسلح ٹولوں کے سامنے فولادی پنجے کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے۔ شہروں کی بغاوت کمان سے نکلا ہوا تیر ہے جو کبھی واپس نہیں آتا۔

باغی راہنما سرگرم اور پرجوش عوام کو استعماری نظام پر فیصلہ کن ضربیں لگاتے دیکھتے ہیں تو روایتی حکمت عملی پر ان کی بے اعتباری اور زیادہ پختہ ہو جاتی ہے۔ اپنی ہر کامیابی پر ان تمام باتوں کے بارے میں ان کی مخالفت تیز تر ہو جاتی ہے۔ جنہیں وہ آہندہ شغل فضول، لفاظی، لایعنی اور بے مقصد احتجاج کے نام سے پکاریں گے۔ یہ باغی رہنما خطیبانہ ''سیاست'' کے بارے میں ایک قطعی نفرت محسوس کرتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں ہمیں بے ساختہ عمل کے مسلک کی واضح فتح نظر آتی ہے۔

کسانوں کی متعدد بغاوتیں، جن کی جڑیں دیہاتی علاقوں میں ہوتی ہیں، ہر مقام پر نئی قوم کی ہمہ وقت ٹھوس موجودگی کی شہادت دیتی ہیں۔ ہتھیار اٹھانے والا ہر مقامی باشندہ اسی قومی کی کل کا ایک جزو ہوتا ہے۔ جس میں جلد ہی زندگی کی لہر دوڑنے لگے گی۔ کسانوں کی یہ بغاوتیں استعماری حکومت کے لئے خطرہ بن جاتی ہیں۔ وہ استعماری فوجوں کو حرکت میں لاکر انہیں ہر طرف پھیل جانے پر مجبور کرتی ہیں اور ہر موڑ پر انہیں کچلنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ ان کا محض ایک ہی اصول ہوتا ہے کہ عمل ایسا ہو کہ قوم زندہ رہے ان کے پاس نہ تو کوئی لائحہ عمل ہوتا ہے نہ تقریریں اور قراردادیں، نہ ہی سیاسی رجحانات۔ ان کا واضح مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ غیر ملکیوں کو باہر نکالا جائے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ آیئے ہم جابر حکمرانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کریں اور مسلح جدوجہد سے اپنے ہاتھ مضبوط کریں۔

جب تک استعماریت کی بے یقینی جاری رہتی ہے قومی مقاصد آگے بڑھتے رہتے ہیں اور یہ بالآخر ہر فرد کے مقاصد بن جاتے ہیں۔ آزادی کے لئے پورے ملک پر مشتمل منصوبے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس دور میں بے ساختگی کی حکمرانی ہوتی ہے اور ہر نئے عمل کا آغاز مقامی طور پر ہوتا ہے۔ ہر پہاڑی پر ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہو کر طاقت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ ہر جگہ، وادیوں اور پہاڑوں میں، جنگلوں اور گاؤں میں ہمیں قومی حکمرانی نظر آتی ہے۔ ہر عورت اور ہر مرد اپنے عمل سے قوم کو زندگی دیتا ہے اور اپنے علاقے میں قومیت کو فتح کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہاں ہم ایک ایسی فوری ضرورت کی حکمت عملی کی بات کر رہے ہیں جو انقلابی بھی ہوتی ہے اور آمرانہ بھی۔ مقامی طور پر تشکیل شدہ ہر گروہ کا مقصد اور پروگرام مقامی آزادی ہوتا ہے۔ اگر قوم ہر جگہ ہے تو وہ یہاں بھی ہے۔ اور اس سے ایک قدم آگے کی بات یہ ہے کہ وہ صرف یہیں ہے۔ مختلف چالوں کو حکمت عملی سمجھ لیا جاتا ہے اور سیاست کا فن جنگ کے فن کا روپ دھار لیتا ہے اور سیاست کا شدت پسند باغی بن جاتا ہے۔ جنگ لڑنا اور سیاست میں حصہ لینا، یہ دونوں چیزیں ایک ہو جاتی ہیں۔

عوام جو اپنے پیدائشی حقوق کھو چکے ہیں، جو خانہ جنگی اور عداوتوں کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اب مختلف علاقوں میں قوم کے چہرے کے صاف اور شفاف کرنے کے لئے متانت کی فضا میں آگے بڑھیں گے۔ ایک حقیقی اجتماعی کیف میں آکر، وہ خاندان جس کی روائتی دشمنیاں چلی آرہی تھیں۔ پرانی عداوتیں ختم کرنے اور ایک دوسرے کو معاف کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

بہت سی صفائیاں اورمیل ملاپ ہوتے ہیں۔ وہ ناقابل فراموش کدورتیں جوایک مدت سے دفن تھیں، پھر سے سامنے لائی جاتی ہیں۔ تا کہ انہیں پوری طرح جڑ سے نکال پھینکا جائے۔قومیت کی تشکیل میں شعور کا اضافہ بھی مضمر ہوتا ہے۔قومی اتحاد سب سے پہلے گروہوں کا اتحاداور پرانے جھگڑوں اوران کہی رنجشوں کا حتمی خاتمہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صلح صفائی میں وہ باشندے بھی شامل ہوتے ہیں جو اپنی حرکات اور قابض قوم کے ساتھ اپنے معاملات کے باعث قوم کے لئے بدنامی کا داغ بن گئے تھے۔ دوسری جانب غداروں اور دشمن کے ہاتھ بک جانے والوں کا محاکمہ کیا جاتا ہےاورانہیں سزائیں دی جاتی ہیں۔ اسی طور پر آگے کی جانب بڑھتے ہوئےعوام قانون سازی کرتے ہیں۔اور یوں خودکواقتدار اعلیٰ کے حامل اوراس کےحصول کے لئے کوشاں پاتے ہیں۔ملک کے ہرگوشہ میں جواب استعماری غنودگی سے بیدار ہو چکا ہے، زندگی ناممکن حدتک شدید حدت کے ساتھ بسر کی جاتی ہے۔ ہرگاؤں میں شاندار فیاضی، بے پناہ مروت اور مقاصد کے لئے جان دینے کا ایسا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس پر کبھی بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب بیک وقت ایک برادری، ایک چرچ اور ایک متصوفانہ عقائد رکھنے والے فرقے کے مماثل ہوتا ہے۔کوئی مقامی باشندہ بھی اس نئے آہنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جوقوم کو آگے کی طرف لے جاتا ہے۔ قرب وجوار کے قبیلوں میں پیغامبر بھیجے جاتے ہیں۔ وہ بغاوت میں باہمی مواصلات کا پہلا نظام ثابت ہوتے ہیں اوراس تحریک اور آہنگ کوان علاقوں تک پہنچاتے جواب تک غیر متحرک تھے۔ وہ قبائل بھی جن کی ہٹ دھرمی عداوتیں مشہور تھیں اب خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ ہتھیار پھینک کرایک دوسرے کیلئے اپنی مدداوراپنی اعانت پیش کرتے ہیں۔ مسلح جدوجہد میں وہ لوگ جوکل تک آپس میں دشمن تھے اب شانہ بشانہ قدم بڑھاتے ہیں۔قوم کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اور دشمن کوگھیرنے کی نئی تدبیری میدان عمل میں نئے قبیلوں کے داخلے کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ ہرگاؤں محسوس کرتا ہے۔ کہ وہ انقلاب کا ایک بھرپور کارکن ہونے کے علاوہ سارے سلسلہ عمل کی ایک کڑی بھی ہے۔قبیلوں اور دیہاتوں کے درمیان اتحاد کا، پوری قوم کے اتحاد کا، سب سے پہلا اظہار دشمن پر لگنے والی ضربوں کے اضافے سے ہوتا ہے۔ ہر نیا گروہ جوتشکیل پاتا ہے۔ ہر نیا شعلہ جو بھڑک اٹھتا ہے، اس امر کی نشانی ہوتا ہے کہ ہرکوئی دشمن کے پیچھے لگا ہوا ہےاور ہرکوئی اس سے نپٹنے کے لئے تیار ہے۔

یہ اتحاداس دوسرے دور میں اور بھی واضح طور پر نظر آئے گا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں

دشمن جارحانہ حملے شروع کرتا ہے۔ ایک بار آگ بھڑک اٹھے تو استعماری فوجوں کی دوبارہ نئی تشکیل اور نئی تنظیم کی جاتی ہے اور جنگ کے ایسے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جو بغاوت کی نوعیت کے مطابق ہوں۔ یہ جارحانہ حملے پہلے دور کی مثالی اور یوطوپیائی فضا پر شبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ دشمن چند مخصوص مقامات پر اپنی فوجیں مرکوز کرتا اور حملہ آور ہوتا ہے۔ مقامی گروہ بڑی تیزی سے بکھر جاتا ہے اور وہ اس لئے کہ وہ جنگ کی صف اول میں آنا چاہتا ہے۔ رجائیت جو پہلے دور کا خاصا تھی مقامی گروہ کو بے خوف بلکہ بے پرواہ بنا دیتی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس کی پہاڑی کی چوٹی ہی قوم ہے اور اس لئے وہ اسے چھوڑنے یا خود پسپا ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن نقصانات بہت شدید ہوتے ہیں اور ایسے شکوک ابھرنے لگتے ہیں جو باغیوں پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں گروہ کو ایک مقامی حملے کا سامنا کرنا پڑتا ہے گویا یہی فیصلہ کن آزمائش ہے اس کے رویے سے یہ لگتا ہے گویا اسی مقام پر اور اسی گھڑی پوری قوم کی تقدیر کی بازی لگی ہوئی ہے۔

لیکن ہمیں یہ بات جان لینی چاہئے کہ یہ بے ساختہ تندی جو فوری طور پر استعماریت کی تقدیر کا فیصلہ کرنا چاہتی ہے بالآخر خود کو رد کر دیتی ہے، بالخصوص فوری عمل کے عقیدے کی حد تک۔ وہ یوں کہ روزمرہ کی عملی حقیقت پسندی پچھلی وافر جذباتیت کی جگہ لے لیتی ہے اور ابدیت کے واہمہ کا بدل بن جاتی ہے۔ حقائق کے کڑے سبق اور بندوقوں کی گولیوں سے چھلنی جسم، واقعات کی از سرنو تعبیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بقا کی سیدھی سادھی جبلت کم سخت گیر اور زیادہ پیدا کرتی ہے۔ انگولا کے عوام کی آزادی کی خصوصیت پہلے ماہ میں جنگی طریقوں کی ایسی ہی تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ پندرہ مارچ 1961 کو دو یا تین ہزار انگولی کسانوں کے گروہ نے اپنے آپ کو پرتگالی چوکیوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔ مسلح اور غیر مسلح مرد، عورتیں اور بچے، بھاری تعداد میں، جرات اور ولولوں کی آگ سے بھرپور، ان علاقوں میں جہاں نوآباد کار رہتا تھا، فوجیں تھیں اور پرتگالی جھنڈا لہراتا تھا، موج در موج چڑھ دوڑے تھے، گاؤں اور ہوائی اڈوں کے گرد گھیرے ڈال کران پر اکثر حملے کئے گئے لیکن یہ بھی ہوا کہ ہزاروں انگولی استعماریت کی توپوں کے سامنے چھلنی ہو گئے۔ انگولا کی بغاوت کے راہنماؤں کو اس امر کا احساس ہوتے زیادہ دیر نہ لگی کہ اگر وہ واقعی اپنے ملک کو آزاد کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کوئی اور طریق کار تلاش کرنا ہوگا۔ لہٰذا گذشتہ چند ماہ میں انگولی راہنما ہولڈن رابرٹو (17) نے قومی انگولی فوج کو، پھر سے منظم کیا ہے اور اس سلسلہ میں متعدد جنگ

ہائے آزادی سے حاصل شدہ تجربات اور گوریلا طرز جنگ سے مناسب فائدہ اٹھایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گوریلا جنگ میں جدوجہد کا تعلق اس جگہ سے نہیں جہاں آپ ہیں بلکہ اس جگہ سے ہوتا ہے جہاں آپ جا رہے ہیں۔ ہر مجاہد اپنی جنگجو سرزمین کو اپنے ننگے تلوؤں کے نیچے لئے پھرتا ہے۔ آزادی کی فوج محض ایک مرتبہ ہی دشمن سے ٹکر نہیں لے لیتی بلکہ یہ ایک ایسی فوج ہوتی ہے جو گاؤں گاؤں پھرتی ہے، جنگلوں میں پناہ لیتی ہے، اور جب اسے نیچے وادی میں دشمن کے دستوں کے اڑائے ہوئے سفید گرد وغبار نظر آتے ہیں تو وہ خوشی سے ناچنے لگتی ہے۔ قبائلی بھی حرکت میں آجاتے ہیں اور مختلف گروہ چل پھر کر اپنے مقامات بدلتے رہتے ہیں۔ شمال کے لوگ مغرب کی جانب نکل جاتے ہیں اور میدانوں کے لوگ پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ ایسا کوئی مقام نہیں ہوتا جو فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے بہتر صورت حال میں ہو۔ دشمن سوچتا ہے کہ وہ ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے لیکن ہم ہمیشہ اس کے عقبی دستوں کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ہر بار جب وہ سمجھتا ہے کہ اس نے ہمیں تباہ کر دیا ہے تو ہم اس پر جوابی حملہ کر دیتے ہیں۔ اب ہم اس کا پیچھا کرنے لگتے ہیں۔ اس تمام فنی برتری اور توپخانے کی برتر قوت کے باوجود جو اسے حاصل ہوتی ہے، دشمن یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ بوکھلا گیا ہے اور مشکل میں پھنس گیا ہے، اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم گاتے ہیں اور گاتے ہی چلے جاتے ہیں۔

تاہم اسی دوران میں بغاوت کے رہنما یہ محسوس کرتے ہیں کہ مختلف گروہوں کو باشعور بنانا چاہئے، انہیں تعلیم دینی چاہئے، عقائد سے روشناس کرنا چاہئے اور اس طرح ایک باقاعدہ فوج اور ایک مرکزی انتظامیہ کی تشکیل کرنی چاہئے۔ اس انتشار کو جو اس امر کی نشانی ہوتا ہے کہ قوم مسلح ہو چکی ہے اب نظم وضبط کی صورت میں ڈھل جانا چاہئے اور انتشار کو ماضی کی یادگار رہ جانا چاہئے۔ وہ راہنما جو شہروں کی بے مقصد سیاسی سرگرمی چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے اب سیاست کو از سرِ نو دریافت کر لیتے ہیں۔ مگر اب یہ سیاست لوگوں کو لوری دے کر سلانے کا طریقہ نہیں ہوتی نہ ہی عوام کو بھول بھلیوں میں گرفتار کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے، بلکہ جدوجہد کو تیز کرنے اور لوگوں کو اپنا ملک چلانے کے لئے تیار کرنے کا واحد، واضح اور صاف طریق کار بن جاتی ہے۔ بغاوت کے راہنماؤں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کسانوں کی بڑے پیمانے کی بغاوت کو نظم وضبط میں لانے اور مختلف راستوں پر لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ رہنما اس تحریک کو محض کسانوں کی بغاوت کا نام دینے کی مذمت کرتے ہیں اور اسے ایک انقلابی جنگ میں تبدیل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ جدوجہد کی کامیابی کے لئے واضح مقاصد اور متعین طریق کار اولین شرط ہے اور سب سے بڑھ کر لوگوں کو اس احساس کی ضرورت ہے کہ ان کی غیر منظّم کوششیں محض ایک وقتی تحریک بن کر رہ جائیں گی۔ عوام الناس کے احتجاج کے بل پر آپ زیادہ سے زیادہ تین دن یا پھر تین ماہ نکال سکتے ہیں لیکن اس سے قومی جنگ نہیں جیتی جا سکتی، آپ کبھی بھی دشمن کے ظالم نظام سے چھٹکارا نہیں پا سکتے اور اگر آپ عام لوگوں کے شعور کا معیار بلند کرنے کا کام نہیں کرتے تو انسانوں کو کبھی بدل نہ سکیں گے۔ اس کام کے لئے نہ محض پائیدار جرات کافی ہے اور نہ ہی شاندار نعرے۔

مزید برآں جوں جوں جنگ آزادی آگے بڑھے گی۔ یہ ہماؤں کے ایمان پر ایک فیصلہ کن ضرب بھی لگائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ دشمن اپنی چالیں بدل دیتا ہے۔ مناسب وقت پر وہ اپنی جابرانہ پالیسی کے ساتھ ساتھ دوستی کے شاندار مظاہرے بھی کرتا جاتا ہے۔ پھوٹ ڈالنے والی چالیں اور ''نفسیاتی محرکات'' استعمال کرتا ہے۔ بسا اوقات وہ قبائلی جنگوں کو پھر سے زندہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کے لئے وہ ایجنٹوں کو استعمال کرتا ہے جو لوگوں کو بھڑکاتے ہیں اور وہ طریق اپناتا ہے جسے جوابی بغاوت کہا جا سکتا ہے۔ استعماریت اپنے مقاصد پورے کرنے کے لئے دو طرح کے مقامی باشندوں سے کام لیتی ہے۔ ان میں اول تو روایتی دوست، قائد، پیر اور عامل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کسانوں کا انبوہ ایک غیر متبدل، یکساں، اور بے حادثہ زندگی بسر کرتا ہے وہ اپنے مذہبی رہنماؤں کو جو پرانے خاندانوں سے چلے آ رہے ہیں، بہت محترم سمجھتا ہے۔ پورا قبیلہ ایک اکیلے انسان کی طرح اپنے روایتی سردار کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا رہتا ہے۔ استعماریت ان خفیہ آلہ کاروں کا تاوان دیکر ان کی خدمات اپنے لئے حاصل کرتی ہے۔

استعماریت کو پرولتاری عوام میں بھی اپنی چالوں کے لئے خاصے مواقع مل جاتے ہیں۔ اس وجہ سے کسی بھی تحریک آزادی کو سب سے زیادہ توجہ ان پرولتاریوں پر صرف کرنی چاہئے۔ کسانوں کے انبوہ تو ہمیشہ بغاوت کے اعلان پر لبیک کہیں گے۔ لیکن اگر بغاوت کے راہنما یہ سوچتے ہیں کہ وہ عوامی انبوہ کو نظر میں رکھے بغیر ہی کام چلا لیں گے تو بات یوں ہے کہ پرولتاری عوام جنگ تو ضرور کریں گے اور تصادم میں حصہ بھی لیں گے لیکن اس بار وہ ظالموں کی سمت ہوں گے اور ظاہم حکمران جو کانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کرنے کا موقع کبھی نہیں گنواتا، اس بے علمی اور ناسمجھی کو جو پرولتاری عوام کی کمزوری ہوتی ہے،

استعمال کرنے میں بڑی ہنرمندی کا مظاہرہ کرے گا۔ اگر انسانی مساعی کے اس حاصل شدہ ذخیرے کو باقی قوتیں فوری طور پر منظّم نہیں کرتیں تو یہ استعماری فوجوں کے شانہ بشانہ کرائے کے سپاہیوں کے طور پر لڑے گا۔ الجزائر میں یہ پرولتاری عوام ہی تھے جو فرانسیسی فوج میں بھرتی ہوئے، انگولا میں وہ سڑکیں کھولنے والے ہیں جو اب پرتگالی فوج کے آگے آگے چلتے ہیں اور کانگو میں بھی پھر یہی پرولتاری عوام ہیں جو کاسائی اور کٹنگا کی علاقائیت کے مظہر ہیں جب کہ لیو پولڈول میں کانگو کے دشمن انہیں لومبا کے خلاف ''بے ساختہ'' عوامی جلسے منعقد کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

دشمن کو نظریات کی کوتاہیوں کا علم ہوتا ہے کیونکہ وہ باغی قوتوں کا تجزیہ کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ احتیاط کے ساتھ اس ''مجتمع دشمن'' کا مطالعہ کرتا ہے جو استعمار زدہ عوام پر مشتمل ہوتے ہیں اسے عوام کے کچھ طبقات کے روحانی عدم استحکام کا بھی علم ہوتا ہے۔ بغاوت کے مستحکم اور اچھی طرح سے منظّم ہراول دستوں کے ساتھ ساتھ دشمن، عوام کا ایک ایسا انبوہ بھی دریافت کر لیتا ہے جس کی شمولیت ایک عرصہ دراز تک جسمانی تباہ حالی، بے حرمتی اور غیر ذمہ داری کے عادی رہنے کے باعث ہوتی ہے۔ دشمن اس انبوہ کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بھاری معاوضہ دینے کے لئے بھی تیار ہوتا ہے۔ وہ سنگینوں اور کوڑوں کی سخت مار سے بے ساختگی پیدا کرتا ہے۔ کانگو میں ڈالروں اور بلجیمی فرانکوں کی بارش ہوتی ہے جب کہ مڈغاسکر میں ''حودا'' پر لگان بڑھ جاتے ہیں اور الجزائر میں مقامی رنگروٹ جو فی الحقیقت یرغمال ہوتے ہیں، فرانسیسی فوج میں شامل کئے جاتے ہیں۔ بغاوت کا راہنما حقیقی معنوں میں قوم کا بیڑا غرق ہوتے دیکھتا ہے۔ پورے کے پورے قبیلے دشمن فوج میں شامل ہو جاتے ہیں اور ان جدید ہتھیاروں کو لے کر، جن سے انہیں مسلح کیا گیا ہے وہ جنگ کی راہ اختیار کرتے ہیں اور پڑوس کے قبیلوں کے ان علاقوں پر حملہ کرتے ہیں جنہیں اس موقع پر قوم پرست سمجھا جاتا ہے۔ جنگی یکجہتی جو بغاوت کے ابتدائی دنوں میں اس قدر شاندار اور مفید نظر آتی تھی، ختم ہو جاتی ہے۔ قومی اتحاد ٹکرے ٹکرے ہو جاتا ہے اور بغاوت ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ جاتی ہے۔ عوام کی سیاسی تعلیم اب ایک تاریخی ضرورت نظر آتی ہے۔

وہ شاندار رضا کارانہ تحریک جس کا مقصد استعمارہ زدہ عوام کو ایک ہی لہر میں اقتدار اعلیٰ تک لے جانا تھا، وہ یقین جو آپ کو تھا کہ قوم کا ہر حصہ اسی رفتار کے ساتھ آپ کے ساتھ چل پڑے گا اور اسی روشنی میں آگے بڑھتا رہے گا۔ وہ قوت جس نے آپ کو امید بخشی، یہ سب کی سب تجربے کی روشنی میں ایک بہت

بڑی کمزوری کی علامتیں نظر آتی ہیں۔ مقامی باشندے نے یہ تو سوچ لیا کہ وہ عبوری دور سے گذرے بغیر استعمارہ زدہ انسان سے ایک آزادہ قوم کا خودمختار فرد بن جائے گا۔ اس کے پاس اعصابی قوت کے احساس کا ہیولہ ضرور تھا مگر اس نے اپنے علم کی راہ میں کوئی حقیقی ترقی نہ کی اور اس کا شعور نامکمل ہی رہا۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ کسان بڑے ولولے کے ساتھ لڑائی میں شامل ہوتے ہیں۔ بالخصوص اس وقت جب کہ جنگ مسلح ہو۔ کسان خود کو بغاوت میں نہایت جوش وخروش کے ساتھ اس لئے بھی جھونکتے ہیں کہ انہوں نے اس طرز حیات سے اپنی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں کی جو بنیادی طور پر استعمار دشمن ہوتا ہے۔ اباحت کے تصور، پہلودار ہتھکنڈوں اور نفع نقصان کے نظام کے باعث، جو بازی گروں کی کامیاب ہاتھ کی صفائی کی یاد دلاتے ہیں، دیہات کے لوگ اپنی انفرادیت کو استعماری اثرات سے کم وبیش آزاد ہی رکھتے ہیں۔ وہ تو یہاں تک سمجھ لیتے ہیں کہ استعماریت کی کبھی فتح نہیں ہوتی۔ کسان کا غرور، شہروں میں جانے اور غیر ملکیوں کی بنائی ہوئی دنیا میں شامل ہونے سیاس کی ہچکچاہٹ، استعماری انتظامیہ کے آلہ کاروں سے اس کا دائمی کھچاؤ، یہ سب ردعمل اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ نوآبادکار کی تنویت کی دنیا کی مخالفت اس نے اپنی تنویت سے کی ہے۔

ظلم کے خلاف مقامی باشندے کا جو ردعمل ہوتا ہے وہ نسلی تعصّبات کے بجائے نسلی احساسات اور اپنی زندگی کے لئے جنگ کرنے کے فیصلے کا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اس کے لڑائی میں شامل ہونے کا کافی معقول جواز ہے۔ لیکن آپ لڑائی نہیں لڑتے، نہ ہی بے رحم اور ہر چہار سمت پھیلے ہوئے جبر کو برداشت کرتے ہیں اور نہ ہی، جب آپ کے خاندان کے باقی تمام افراد صلیت اور نفرت کو فتح یاب کروانے کیلئے ختم کئے جا رہے ہوں تو آپ خاموش تماشائی رہ سکتے ہیں۔ صلیت اور نفرت اور حقارت، جو ''بدلہ لینے کی معقول خواہشیں ہیں'' کسی آزادی کی جنگ کو جاری نہیں رکھ سکتیں۔ آگاہی کی وہ خیرہ کن روشنی جو جسم کو طوفانی راستوں پر ڈال دیتی ہے یا جو اس پر کم وبیش ایک ایسی مریضانہ دیوانگی طاری کر دیتی ہے جس میں دوسرے شخص کا چہرہ وجد آفریں کیفیات کی دعوت دیتا ہے، جہاں میرا خون دوسروں کے خون کا پیاسا ہے، جہاں جسمانی کاہلی کے سبب میری موت دوسروں کی موت کو پکارتی ہے۔ پہلے چند گھنٹوں کے یہ سب شدید ہیجانات، اگر ان کو اپنے آپ ہی پلنے دیا جائے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ استعماری قوت کا کبھی نہ ختم ہونے والا دباؤ، جدوجہد میں پھر سے نئے جذباتی عناصر شامل کر

دیتا ہے اور باغیوں کو نفرت کرنے کے لئے نئے محرکات اور نوآبادکار کو چن چن کر مارنے کی نئی وجوہات فراہم کرتا ہے۔ لیکن رہنما کو روز بروز احساس ہوتا جاتا ہے کہ محض نفرت ہی سے پورا لائحہ عمل تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اس خلیج کو وسیع تر کرنے کیلئے اور تمام لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے محض دشمن پر ہی انحصار کریں گے (جو بلاشبہ حتی الامکان جرائم کرتا ہی رہے گا) تو آپ اپنے مقاصد کی شکست کا خطرہ مول لیں گے، جیسا کہ ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں، دشمن ہر قیمت پر آبادی کے کسی خاص طبقے، کسی خاص علاقے، یا چند خاص سرداروں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب جدوجہد آگے بڑھتی ہے تو نوآبادکاروں اور پولیس والوں کو ہدایات دی جاتی ہیں۔ ان کا رویہ اب ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیتا ہے، اب یہ زیادہ ''انسانی'' ہو جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ مقامی باشندے کو اس سے معاملات کے دوران میں ''صاحب'' کہہ کر بھی مخاطب کرنے لگتے ہیں۔ خاطر اور مدارت کا رویہ عام ہو جاتا ہے۔ مقامی باشندے کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ اب حالات بدل رہے ہیں۔

مقامی باشندے نے محض اس وجہ سے ہتھیار نہیں اٹھائے تھے کہ وہ بھوک سے مرا جا رہا تھا اور یہ کہ وہ اپنے سماجی نظام کو اپنی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھ رہا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ نوآبادکار اسے حیوان سمجھتا تھا اور اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ بھی کرتا تھا۔ وہ اب ان نئے حالات سے بڑی اچھی طرح متاثر ہوتا ہے۔ اس نفسیاتی نعمت غیر مترقبہ کی وجہ سے نفرت ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ ماہرین اور عمرانیات کے عالم استعماری چالوں پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں اور مختلف ''ذہنی الجھنوں'' کا جوان کے سامنے پیش ہوتی ہیں۔ مطالبہ کرتے ہیں۔ مثلاً مایوسی کی الجھن، جنگجویانہ الجھن اور نوآبادیاتی صورت حال کی الجھن۔ مقامی باشندے کو ترقی مل جاتی ہے۔ وہ اپنی نفسیات سے اسے تنہا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہاں اس کے ساتھ کچھ پیسے بھی دیتے ہیں۔ یہ قابل رحم طریقے، قطرہ قطرہ کر کے دی جانے والی یہ رعایتیں بھی کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل کر لیتی ہیں۔ مقامی باشندہ ہر شے کا اتنا بھوکا ہوتا ہے، ہر اس شے کا جو اس انسانی درجہ دے سکے، انسانیت کی کسی بھی ہڈی کا جو اس کی سمت پھینکی جا سکے، کہ اب جب کہ اس کی بھوک مطلق قابل برداشت نہیں رہتی، ادھر ادھر کے بھیک کے چند ٹکڑے بھی اسے احسان مند کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اس کا شعور اس قدر ناگفتہ بہ اور مدھم ہوتا ہے کہ ہمدردی کی ننھی سی چنگاری سے بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ اب یہ ہوتا ہے کہ روشنی کی پہلی عظیم اور بھرپور پیاس ضعیف الاعتقادی

کے سراب میں ہمہ وقت گھری رہتی ہے۔ وہ جارحانہ مکمل مطالبات جنہوں نے آسمان روشن کر دیا تھا اب متعدل بن جاتے ہیں، اور خود میں سمٹ جاتے ہیں۔ وہ لپکنے والا بھیڑیا جو ہر شے کو دیکھتے ہی چیر پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔ اور ہوا کا اٹھتا ہوا وہ طوفان جو ایک حقیقی انقلاب کو جنم دینے والا تھا، یہ سب اس خطرے سے دو چار رہتے ہیں۔ کہ شاید جدوجہد جاری رہے تو آہندہ ان کی شکل بھی پہچانی نہ جا سکے۔ اور جدوجہد جاری رہتی ہے۔ مگر مقامی باشندہ کسی لمحے بھی کسی نہ کسی رعایت کی خاطر ہتھیار ڈال سکتا ہے۔

مقامی باشندے کی فطرت میں اس عدم استقامت کی دریافت بغاوت کے رہنماؤں کے لئے ایک خوفناک تجربہ ثابت ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو وہ بھونچکے رہ جاتے ہیں، پھر انہیں حالات کے اس نئے موڑ سے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وضاحتیں بہت ضروری ہیں اور یہ کہ مقامی باشندوں کے شعور کو دلدل میں پھنسنے سے روکنا لازم ہے۔ جنگ جاری رہتی ہے اور دشمن اپنے مورچوں کو پھر سے منظّم و مستحکم کرتا ہے اور مقامی باشندوں کی حکمت عملی کا بھی اندازہ کر لیتا ہے۔ قومی آزادی کی جدوجہد ایک ہی جست میں فاصلہ پھاند جانے کا نام نہیں ہے۔ اس کھیل کو اپنی تمام تر دشواریوں کے ساتھ ہر روز کھیلنا پڑتا ہے۔ اس سے جو مصائب پیدا ہوتے ہیں وہ استعماری دور کے مصائب سے کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں۔ شہروں کے اندر یوں لگتا ہے کہ نوآبادکار بدل گیا ہے۔ ہمارے عوام اب خوش ہیں، ان کی عزت کی جاتی ہے۔ دن پہ دن گذرتے جاتے ہیں۔ اب ان مقامی باشندوں کو جو جدوجہد میں شامل ہیں اور لوگوں کو جو ان کی مدد کر رہے ہیں، متزلزل نہیں ہونا چاہئے۔ انہیں ہرگز یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ جب وہ جنگ کے حقیقی نصب العین سے روشناس کئے جائیں تو انہیں یہ مرگز خیال نہ کرنا چاہئے کہ وہ نا قابل حصول ہیں۔ ایک بار پھر ان کے سامنے حالات کی وضاحت کرنی چاہئے۔ عوام کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور انہیں وہاں کس طرح پہنچنا ہے۔ جنگ محض ایک لڑائی نہیں ہوتی بلکہ مقامی جھڑپوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے اور سچ پوچھئے تو ان میں سے کوئی بھی فیصلہ کن نہیں ہوتی۔

لہٰذا ہمیں اپنی قوت کو بچا کر رکھنا چاہئے اور ہر چیز کو ایک بار ہی داؤ پر نہ لگا دینا چاہئے۔ استعماریت کے پاس مقامی باشندوں کے مقابلے میں ذرائع زیادہ ہوتے ہیں۔ جنگ جاری رہتی ہے۔ دشمن اپنے آپ کو روک رکھتا ہے۔ آخری حساب کتاب نہ تو آج طے ہوگا اور نہ ہی کل۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جنگ کے پہلے دن ہی سے حساب کتاب شروع ہو گیا تھا اور اس کا خاتمہ اس لئے نہیں ہوگا کہ اب مارنے کے لئے

مزید دشمن باقی نہیں رہے، بلکہ سیدھے سادھے طریقے سے محض اس لئے کہ دشمن نے متعدد وجوہات کے باعث اب یہ محسوس کر لیا ہے کہ اس کا فائدہ جدوجہد ختم کرنے اور استعمارہ زدہ لوگوں کے اقتدار کو تسلیم کرنے میں ہے۔ جدوجہد کے لئے نصب العین بغیر کسی امتیاز کے منتخب نہیں کرنے چاہئیں، جیسا کہ آغاز میں کیا گیا۔ اگر احتیاط نہ کی گئی تو عوام کسی لمحے بھی دشمن سے تھوڑی سی رعایت ملنے پر جدوجہد کی طوالت کے بارے میں معترض ہونے لگیں گے۔ وہ نوآبادکار کی نفرت اور اس کی جبریت کے، جسے وہ ہر قیمت پر جاری رکھنے کا اعلان کرتا ہے، اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ کسی فیاضانہ رویے یا خیر سگالی کے ذرہ برابر اظہار کا بڑے تعجب اور مسرت سے خیر مقدم کرنے لگیں گے۔ ایسی صورت میں مقامی باشندہ ثنا خوانی شروع کر دیتا ہے۔ پس باغیوں پر یہ اچھی طرح واضح کر دینا چاہئے کہ وہ دشمن کی رعایتوں سے مطلق فریب نہ کھائیں کیونکہ یہ مراعات لاسا لگانے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتیں۔ ان کا بنیادی مسائل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا اور مقامی باشندے کے نقطہ نظر سے ہم یہ مفروضہ بنا سکتے ہیں کہ ایسی مراعات کا جو استعماری حکومت کی اصلی نوعیت کو تبدیل نہیں کرتیں، اصلیت سے کوئی واسطہ ہوتا ہی نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس طور حاکم قوت کی موجودگی کے زیادہ بے رحم مظاہر یقیناً غائب ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ ان کا یہ نمایاں عدم وجود استعماری طاقت کے لئے اخراجات کی کفایت بھی ثابت ہوتا ہے اور اس کی فوجوں کو زیادہ وسیع علاقے پر نہ پھیلنے دینے کا ایک قطعی طریقہ بھی۔ لیکن اس عدم وجود کی کہیں زیادہ بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اور قیمت یہ ہوتی ہے۔ کہ پھر ملک کے مستقبل کی تقدیر پر زیادہ کڑی پابندیاں لگ جاتی ہیں۔ لوگوں پر یہ بات واضح کرنے کے لئے تاریخی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ کس طرح بہتیرے ممالک نے رعایتوں کے ڈھونگ گویا محض رعایتوں کے اصول کو تسلیم کر کے، بدلے میں جو قیمت وصول کی ہے وہ ایسی غلامی ہے جو بظاہر کم اور بہ باطن بہت زیادہ اور بھرپور ہوتی ہے۔ عوام اور ان کے رہنماؤں کو وہ تاریخی قانون معلوم ہونا چاہئے جو یہ کہتا ہے کہ بعض مراعات عنان حکومت کو زیادہ سخت کرنے کا بہانہ ہوتی ہیں۔ لیکن عدم وضاحت کی صورت میں یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ بعض سیاسی رہنما بڑی خود اعتمادی کے ساتھ غیر معین سمجھوتے شروع کر دیتے ہیں۔ مقامی باشندے کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ استعماریت بلا غرض کبھی کوئی چیز نہیں دیتی۔ مقامی باشندہ سیاسی یا مسلح جدوجہد سے جو کچھ بھی حاصل کرتا ہے وہ نوآبادکار کی خوش خلقی یا خیر سگالی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مراعات کو اب مزید کچھ

عرصے کے لئے نہیں ٹال سکتا۔ مزید برآں مقامی باشندوں کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ نوآبادکار انہیں مراعات نہیں دیتا بلکہ وہ خود اس سے یہ مراعات چھینتے ہیں۔ جب برطانوی حکومت کینیا کی قومی اسمبلی میں چند مزید نشتیں افریقی آبادی کو عنایت کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو ایسے مواقع پر یہ کہنے کیلئے کہ برطانوی حکومت نے مراعات میں اضافہ کیا ہے بے تحاشا ڈھٹائی یا پھر حقائق سے مکمل لاعلمی کی ضرورت ہے۔ کیا یہ بات بالکل واضح نہیں ہے کہ یہ کینیا کے عوام ہیں جنہوں نے خود مراعات دی ہیں؟ استعمار زدہ لوگوں کو، ان لوگوں کو جنہیں لوٹا گیا ہے، اب ان ذہنی عادات کو ختم کر دینا چاہئے جو ان کی خصلت بن چکی ہیں۔ اگر ضرورت پڑے تو مقامی باشندہ استعماریت کے ساتھ مصالحت کر سکتا ہے مگر اسے اصول کی قربانی نہیں دینی چاہئے۔

حالات کا یہ جائزہ شعور کی یہ بیداری اور معاشرتوں کی تاریخ کے علم میں یہ اضافہ صرف ایک تنظیم کے پس منظر اور عوام کے ایک ڈھانچے کے اندر ہی ممکن ہے۔ ایسی تنظیم بغاوت کے آغاز میں شہروں سے آنے والے انقلابی عناصر اور ان کے ساتھ ان باغیوں کی مدد سے جاری ہوتی ہے جو جنگ کے دوران میں دیہاتوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ جڑ ہے جہاں سے بغاوت کی نئی سیاسی تنظیم پنپتی ہے۔ لیکن دوسری جانب وہ کسان بھی جو ہر وقت تجربے کی روشنی سے اپنے علم میں اضافہ کئے چلے جاتے ہیں، عوام جدوجہد کی رہنمائی کی اہلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں یوں جنگ میں شامل قوم اور اس کے رہنماؤں کے درمیان باہمی افہام وتفہیم اور لین دین کی رو جاری ہو جاتی ہے۔ روایتی اداروں کو مضبوط اور مئوثر بنایا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ان میں مکمل تبدیلیاں لائی جاتی ہیں۔ جھگڑے چکانے والے جرگے، اجماع اور دیہاتی پنچایت، اب انقلابی عدالتوں اور سیاسی اور فوجی کمیٹیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہر جنگی گروہ اور ہر دیہات میں غول در غول سیاسی مختار کار نکل آتے ہیں اور یہ سیاسی راہبر ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کم فہمیوں کی چٹانوں کو توڑنا شروع کر دیا ہے، منزل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ سیاسی رہنما ان مسائل کو سلجھانے سے نہیں گھبرائیں گے جنہیں اگر وضاحت کے بغیر چھوڑ دیا گیا تو وہ عوام کی الجھنوں میں اضافہ کریں گے۔ مسلح باغی درحقیقت یہ دیکھ کر بہت زچ ہوتا ہے کہ بہت سے مقامی باشندے شہروں میں اس طرح اپنی زندگی گذارتے چلے جاتے ہیں کہ گویا وہ پہاڑوں میں وقوع پذیر ہونے والی ہر چیز سے بے خبر ہوں اور جیسے انہیں یہ احساس ہی نہ ہوسکا ہو کہ آزادی کی اصل تحریک شروع ہو چکی ہے۔ شہر خاموش رہتا

ہے اور اس کا اپنی یک آہنگ روز مرہ زندگی کو جاری رکھنا کسانوں کو یہ تلخ تاثر دیتا ہے کہ قوم کا ایک پورا حلقہ ہی الگ تھلگ رہنے پر قانع ہے۔ لاتعلقی کی ایسی مثالیں کسانوں کی مایوں کر دیتی ہیں اور ان میں تمام ترشہریوں کو مذمت کا رجحانا اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ سیاسی معلم کو چاہئے کہ وہ عوام کے ایسے رجحانات کو تبدیل کرائے اور انہیں یہ سمجھائے کہ آبادی کے کچھ اجزاء اپنے خاص مقاصد رکھتے ہیں اور یہ مقاصد ہمیشہ قومی مقاصد کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس طرح لوگ یہ سمجھ جائیں گے کہ قومی آزادی بہت سے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے جو بسا اوقات مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ جدوجہد کے ان خاص لمحات میں صورت حال کا یہ جائزہ فیصلہ کن ہوتا ہے اس لئے کہ یہ لوگوں کو اندھی اور مکمل قوم پرستی سے گذار کر سماجی اور اقتصادی آگاہی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے جدوجہد کے آغاز میں نوآبادکار کی قدیم مانویت اپنائی تھی، یعنی سفید فام اور سیاہ فام، عرب اور عیسائی کی مانویت اور جب وہ اس کو لے کر آگے بڑھتے ہیں تو انہیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات ایسے سیاہ فام بھی مل جاتے ہیں جن کے خون سفید فاموں سے بھی زیادہ سفید ہوتے ہیں اور قومی پرچم اور قومی آزادی کی توقع آبادی کے ایک خاص طبے کو اس امر پر آمادہ نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے اغراض اور مفادات کو ترک کر دیں۔ لوگوں کو احساس ہو جاتا ہے۔ کہ ان کی ہی طرح کے مقامی باشندے خاص مواقع کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس اپنے مادی حالات بہتر بنانے کے لئے اور اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کو مضبوط کرنے کے لئے جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بعض مقامی باشندے جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منافع خوری جاری رکھتے ہیں اور ان عوام کے بل پر ذاتی منفعت حاصل کرتے ہیں، جو حسب معمول ہر چیز قربان کرنے کے لئے اور وطن کی سرزمین کو اپنے خون سے سینچنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ وہ انقلابی، جو کم سے کم ہتھیاروں سے استعمال کے جنگی نظام کا مقابلہ کرتا ہے، یہ جان لیتا ہے کہ استعماری جبریت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ وہ استحصال کا ایک اور نظام بھی خود بخود تعمیر کرتا چلا جا رہا ہے.... یہ دریافت ناخوشگوار، تلخ اور بھیانک ہوتی ہے، لیکن اس سے پہلے تو ہر چیز بالکل واضح نظر آتی تھی، برے لوگ ایک جانب تھے اور اچھے دوسری جانب.... آغاز کی صاف، غیر حقیقی اور دلکش روشنی کے بعد نیم تاریکی آتی ہے جو حواس کو پریشان کر دیتی ہے۔ لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ استحصال کی بداعمالی سیاہ فام یا عرب بھی ہوسکتی ہے۔ اور تب وہ ''غداری'' کی آواز بلند کرتے ہیں لیکن یہ غلط فہمی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس غلطی کو درست کر لینا چاہئے۔ یہ غداری قومی نہیں ہوتی بلکہ معاشرتی

ہوتی ہے۔عوام کو یہ سکھانا چاہئے کہ وہ اس کے بجائے یہ آواز لگائیں کہ ''چوری بند کرو۔''علم وشعور کی تھکا دینے والی شاہراہ پر چلتے ہوئے لوگوں کو اپنے فرمانرواؤں کے بارے میں سادہ تصورات ترک کر دینے چاہئیں۔ یہ نوع ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہی ہے۔اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ بعض نوآبادکار احساس جرم کے عام ہسٹریا میں مبتلا نہیں ہیں نوآبادکاروں کی نوع میں بھی اختلافات ہوتے ہیں۔ایسے لوگ جو پہلے بلاتفریق وامتیاز نوآبادکار کے سنگلاخ وجود کا حصہ سمجھے جاتے تھے اب استعماری جنگ کی حقیقی ملامت سے بھی گریز نہیں کرتے۔جب اس نوع کے بہت سے لوگ دشمن سے مل جاتے ہیں، نیگرو اور عرب بن جاتے ہیں، مصائب، اذیت اور موت کو دعوت دیتے ہیں تو غلط فہمی ختم ہو جاتی ہے۔

ایسی مثالیں اس عام نفرت کو کم کر دیتی ہیں جو مقامی باشندے غیر ملکی بستیوں کے لئے محسوس کرتے ہیں۔مقامی باشندے گرمجوشی سے ان چند آدمیوں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور بہت زیادہ جذباتی قدر دانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان پر مکمل اعتماد کرنے لگتے ہیں۔نوآبادکار ملک میں جسے کسی زمانے میں خون کی پیاسی سنگ دل سوتیلی ماں سمجھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، بہت سی آوازیں حکومت کی جنگجویانہ پالیسی کی مذمت میں بلند ہوتی ہیں جن میں ممتاز شہریوں کی آواز بھی شامل ہوتی ہے۔ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے۔کہ استعمار زدہ لوگوں کی رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔متعدد سپاہی استعماری دستوں سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور دوسرے کھلے عام، لوگوں کی آزادی کی خلاف لڑنے سے انکار کر دیتے ہیں اور عوام کی آزادی اور خودمختار حکومت کے حقوق کی خاطر جیل چلے جاتے ہیں۔

نوآبادکار ہمیشہ ایسا انسان نہیں ہوتا جسے قتل کر دینا چاہئے۔استعماریوں کے انبوہ میں بہت سے ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو قوم کے بعض سپوتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر قومی جدوجہد کے قریب ہوتے ہیں۔خون اور نسلی تعصب کی دیواریں دونوں ہی جانب گر جاتی ہیں۔اسی طرح ہر نیگرو یا ہر مسلمان کو خود بخود ہی معقولیت کی سند نہیں مل جاتی اور ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ جب کوئی نوآبادکار نظر آئے تو ناگزیر طور پر پستول یا چاقو نکال لیا جائے۔آگاہی آہستہ آہستہ ہی ان حقائق پر طلوع ہوتی ہے جو جزوی، محدود اور غیر مستحکم ہوتے ہیں۔جیسا کہ ہم خود قیاس کر سکتے ہیں یہ سارا کام بہت مشکل ہے۔لوگوں میں پختگی لانے کا کام بسیط تنظیم اور اس کے رہنماؤں کی بلند عقلی سطح کی وجہ سے آسان ہو جائے گا۔جیسے جیسے جدوجہد آگے

بڑھتی ہے، دشمن اپنے ہتھکنڈوں میں اضافہ کرتا ہے، فتوحات حاصل ہوتی ہیں اور شکستوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ویسے ویسے عقل کی قوت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ زیادہ سے زیادہ جامع اور وسیع ہوتی جاتی ہے۔ رہنما غلطیوں پر نکتہ چینی کر کے اپنی قوت اور اقتدار کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ماضی کے اعمال کا جائزہ لے کر اس سے سبق سیکھتے ہیں اور اس طرح ترقی کرنے کے لئے نئے حالات پیدا کرتے ہیں۔ جوار بھاٹے کے ہر مقامی ''اتار'' کا تمام دیہاتوں اور تمام سیاسی تنظیموں کے نقطہ نظر سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہر بار جب سیاسی جماعت کسی واقعہ کے حوالے سے لوگوں کے شعور میں اضافہ کرتی ہے تو بغاوت اپنی عقلی بنیادوں کا ثبوت دیتی ہے۔ اور اپنی پختگی کا اظہار کرتی ہے۔ تحریک میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ معنی کی مختلف سطحیں خطرے کا سبب ہوتی ہیں اور رائے عامہ کے ٹھوس ستون میں دراڑیں ڈالتی ہیں، مگر ان کے برعکس رہنما بڑی ثابت قدمی سے ان اصولوں پر قائم رہتے ہیں جو قومی جدوجہد اور دنیا بھر میں انسان کی آزادی کی جدوجہد کے دوران میں وضع کئے گئے ہیں۔ ایسی فکری بے رحمی اور باریک بینی کے خلاف ایک بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے جو انقلابیوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ مگر ایک اور طرح کی بے رحمی کا وجود بھی ہوتا ہے جو تعجب خیز حد تک پہلی کی طرح ہی ہوتی ہے، لیکن جو خاص طور پر انقلاب دشمن، خطرناک اور انتشار پسند ہوتی ہے۔ اس خالص اور مکمل بے رحمی سے نپٹنا لازمی ہے ورنہ وہ چند ہفتوں میں ہی تحریک کی شکست کا باعث بن جائے گی۔

وہ قوم پرست انقلابی جو رہنماؤں کے خطیبانہ اور اصلاح پسندانہ چالوں سے بددل اور سیاسی زندگی سے مایوس ہو کر شہر سے بھاگ نکلا تھا اس عملی صورت حال میں ایک نئی سیاسی سرگرمی دریافت کر لیتا ہے جو پچھلی سیاسی سرگرمیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ ساست ان رہنماؤں اور تنظیم کاروں کی سیاست ہوتی ہے جو تاریخ میں سانس لیتے ہیں اور جو اپنے دماغ اور اپنے بازوؤں کے ساتھ آزادی کی جنگ میں اولین کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ سیاست قومی، انقلابی اور سماجی ہوتی ہے اور یہ نئے حقائق جن کا علم اب مقامی باشندوں کو بھی ہو جائے گا، محض عمل کے حوالے سے اپنا وجود رکھتے ہیں، یہ حقائق اس جنگ کی روح ہوتے ہیں جو پرانے استعماری حقائق کے پرزے اڑا دیتی ہے اور حقائق کے ایسے غیر متوقع پہلو سامنے لاتی ہے۔ جن سے نئے مفاہیم ابھرتے ہیں اور ان تضادات کی وضاحت ہوتی ہے جو پچھلے حقائق نے چھپا رکھے تھے۔ وہ لوگ جو جدوجہد میں شریک ہوتے ہیں اور اس کے باعث حقائق کو سمجھتے ہیں اور ان پر

قدرت رکھتے ہیں، استعماری نظام سے آزاد ہوکر چیزوں کو غیر واضح اور مقدس بنانے کی ہوکوشش سے باخبر رہتے ہوئے، ہر قسم کے قومی نغمات کے بیجا تقدس کے خلاف پوری طرح لیس ہوکر ترقی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ محض تشدد، عوام کا تشدد، وہ تشدد جسے رہنما منظّم کرتے ہیں اور جسے کی وہ تعلیم دیتے ہیں، محض اسی کے سبب یہ ممکن ہوتا ہے کہ عوام سماجی حقائق کو سمجھیں اور ہر مشکل کا حل دریافت کریں۔ جدوجہد کے بغیر، عملی تربیت کو سمجھے بغیر، ہر شے فینسی ڈریس پریڈ یا ڈھولک کی تھاپ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ بس چند ترمیمیں ہوتی ہیں، بالائی سطح پر چند اصلاحیں کی جاتی ہیں، لہراتا ہوا ایک پرچم ہوتا ہے اور نچلی سطح عوام کا انبوہ کثیر جواب بھی عہد وسطی میں سانس لیتا ہے اور اسی طرح وقت گزارتا چلا جاتا ہے۔

قومی شعور کے خطرات

تاریخ ہمیں واضح پر یہ بتاتی ہے کہ استعمار کے خلاف جنگ براہ راست قومیت کے خطوط پر نہیں لڑی جاتی۔ مقامی باشندہ ایک عرصہ دراز تک چند خاص بدعنوانیوں مثلاً جبری محنت، جسمانی سزا، تنخواہوں میں عدم مساوات، محدود سیاسی حقوق وغیرہ کو دور کرنے میں اپنی توانائی صرف کرتا رہتا ہے۔ انسانیت پر ظلم کے خلاف جمہوریت کی یہ جنگ آہستہ آہستہ اور بعض اوقات وقت طلب مراحل سے گذر کر، خیال بین الاقوامیت کے جھمیلوں سے نکلتے ہوئے قومیت کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں تیاری کا نہ ہونا، ان کے اور عوام کے درمیان عملی روابط کی عدم موجودگی، ان کی کاہلی، اور یہ بھی کہہ لیجئے کہ جدوجہد کے فیصلہ کن لحات میں ان کی بزدلی، یہ تمام چیزیں المناک حادثوں کو جنم دیتی ہیں۔

ایسے میں قومی شعور تمام عوام کی دلی خواہشات کا واضح مجموعہ اور عوامی تحریک کا فوری اور واضح نتیجہ ہونے کے بجائے اصلیت کا محض ایک خول اور اس کی بھدی اور مضحک نقل ہوکر رہ جاتا ہے۔ اس میں ہمیں جو خامیاں نظر آتی ہیں وہ نوعمر اور آزاد قوم کے معاملات میں ان رویوں کی کافی وضاحت کر دیتی ہیں جن کے مطابق بڑی آسانی کے ساتھ نسل کو قوم پر اور قبائل کو ریاست پر ترجیح دی جاتی ہے۔ پورے ڈھانچے کے یہ شگاف اس انحطاطی عمل کو ظاہر کرتے ہیں جو قومی کاوشوں اور قومی اتحاد کے لئے بیحد نقصان دہ اور مذموم ثابت ہوتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ ایسے انحطاطی اقدام ان تمام کمزوریوں اور شدید

خطرات سمیت جو ان منسلک ہوتے ہیں، قومی متوسط طبقے کی اس نا اہلیت کا تاریخی نتیجہ ہوتے ہیں جن کے باعث وہ عوام کے عمل کا عقلی جواز مہیا نہیں کر سکتا بہ الفاظ دیگر وہ عوامی اعمال پر غور وفکر کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔

یہ روایتی کمزوری جو کم وبیش پسماندہ ممالک کے قومی شعور کی سرشت میں شامل ہوتی ہے، نو آبادیاتی عوام پر استعمار کی لائی ہوئی تباہی کا ہی نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ متوسط طبقے کی ذہنی کاہلی، روحانی مفلسی اور اس ذہنی ساخت کا نتیجہ بھی ہوتی ہے جو وسیع المشربی میں ڈھلا ہو۔

قومی متوسط طبقہ جو استعماری دور کے خاتمہ پر برسر اقتدار آتا ہے خود پسماندہ ہوتا ہے۔ اس کی اقتصادی قوت تقریباً ناپید ہوتی ہے اور نو آبادکار ملک کے بورژوا کے ساتھ جس کی جگہ یہ طبقہ لینا چاہتا ہے، اسے کسی صورت میں بھی کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ یہ متوسط طبقہ خود پسندی کے باعث اس بات پر بہ آسانی یقین کر لیتا ہے کہ وہ بخیر وخوبی قابض ملک کے متوسط طبقے کی جگہ لے سکتا ہے۔ لیکن وہی آزادی جس نے اسے واقعی کونے میں دھکیل دیا تھا، اب اس کی اپنی صفوں میں سے بہتیرے تباہ کن ردعمل ابھارے گی اور وہ اس بات پر مجبور ہو جائے گا کہ سابقہ قابض ملک سے مدد کے لئے دیوانہ وار درخواست کرے۔ نو آزاد ریاست کا سب سے زیادہ روشن خیال طبقہ اہل دانش اور تاجروں کا طبقہ ہوتا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تعداد میں کم اور دار الحکومت میں مجتمع ہونے کے علاوہ مخصوص قسم کے پیشے اختیار کرتے ہیں مثلاً تجارت، کاشت اور مختلف آزاد پیشے۔ اس قومی متوسط طبقے میں نہ تو لکھ پتی ہوتے ہیں اور نہ ہی صنعت کار۔ پسماندہ ممالک کا قومی بورژوا نہ تو پیداوار میں حصہ لیتا ہے، نہ ہی ایجادات میں، نہ تعمیر میں اور نہ محنت میں۔ وہ مکمل طور پر درمیانے قسم کے کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مصروفیت دوڑ بھاگ میں شامل رہنا اور شور شغب کا حصہ رہنا ہے۔ قومی بورژوا کی نفسیات تاجر کی نفسیات ہوتی ہے۔ صنعت کار کی نہیں۔ اور یہ بات بالکل درست ہے کہ نو آبادکار کی لالچ اور استعمار کی تجارتی پابندیوں نے اس کے لئے کوئی اور راہ چھوڑی ہی نہیں۔

استعماری نظام میں کسی ایسے متوسط طبقہ کا وجود جو سرمایہ رکھتا ہو ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ پسماندہ ملک کے سچے قومی متوسط طبقے کا تاریخی فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی بورژوائی فطرت کو یعنی سرمایہ داری نظام کا آلہ کار بننے والی فطرت کو رد کرے اور خود کو انقلابی سرمائے یعنی

عوام کا بے غرض غلام بنا لے۔

ہر پسماندہ ملک کے سچے متوسط طبقے کو چاہئے کہ وہ ان راستوں سے جو تقدیر نے اس کے لئے مقرر کر دیئے ہیں گریز کرنا اور اپنے آپ کو لوگوں کے ساتھ شامل کرنا اپنا فرض منصبی سمجھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ وہ تمام علمی اور فنی سرمایہ جو اس نے استعماری یونیورسٹیوں سے اچک لیا ہے، لوگوں کے لئے وقف کر دے۔ لیکن ہم بڑے افسوس کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ قومی متوسط طبقہ اکثر یہ دلیرانہ، مثبت، سودمند اور صحیح راہ اختیار نہیں کرتا۔ اس کے برعکس وہ پورے روحانی سکون کے ساتھ۔ ایک روایتی بورژوا کی مانند، ایک ایسے بورژوا کے مانند جو نہایت احمقانہ، حقارت آمیز اور بدخویانہ حد تک بورژوا ہوتا ہے نہایت غلط راہوں میں گم ہو جاتا ہے.... یہ راہیں غلط اس لئے ہوتی ہیں کہ یہ قوم دشمنی کی راہیں ہوتی ہیں۔

ایک خاص وقت کے بعد سے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قومی جماعتوں کا نصب العین، خالصتاً قومی ہو جاتا ہے۔ وہ آزادی کے نعروں سے لوگوں کو بیدار کرتی ہیں اور باقی سب کا مستقبل پر چھوڑ دیتی ہیں۔ جب ایسی جماعتوں سے ملک کے اقتصادی پروگرام کے بارے میں، جس کے متعلق وہ شور مچاتے رہتے ہیں یا اس حکومت کی نوعیت کے بارے میں جو وہ برسر اقتدار لانا چاہتے ہیں، سوال پوچھا جاتا ہے تو وہ جواب دینے سے قاصر رہتی ہیں اور یہ صرف اس لئے کہ وہ اپنے ہی ملک کی اقتصادیات سے مطلق لاعلم ہوتی ہیں۔

اقتصادیات ہمیشہ ان کے علم کی حدود سے باہر ہی ترقی پذیر ہوتی ہے۔ انہیں اپنے ملک کی زمین اور معدنی ذخیروں کے حقیقی وسائل کے بارے میں محض تھوڑا سا اندازہ اور کتابی واقفیت ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ ان وسائل کے بارے میں محض عمومی اور تجریدی سطح پر ہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ آزادی کے بعد یہ پسماندہ متوسط طبقہ جو تعداد میں کم اور سرمائے سے عاری ہوتا ہے اور جو انقلابی راستے پر چلنے سے انکار کرتا ہے، بالآخر ایک افسوس ناک جمود میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ طبقہ اپنے اعلیٰ شعور کو پوری آزادی کے ساتھ استعمال نہیں کرتا گو اسے اول اول یہ شکایت تھی کہ استعمار نے اس کے شعور کو مقید کر رکھا ہے اور بڑی تیزی اور طراری سے وہ اپنے اس دکھ کا اظہار کرتا تھا۔ اپنے وسائل کی بے یقینی اور انتظامی عملہ کی قلت اسے برس ہا برس کے لئے دست کارانہ اقتصادیات کی طرف ڈال دیتی ہے۔ اس کے نقطہ نظر سے جو یقیناً ایک محدود نقطہ نظر ہوتا ہے، قومی اقتصادیات وہ ہے جس کی بنیاد ان اشیاء پر ہو جنہیں مقامی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔

دست کار طبقے کے متعلق لمبی لمبی تقریریں کی جاتی ہیں۔ چونکہ متوسط طبقہ ایسے کارخانے لگانے سے قاصر ہے جو بحیثیت مجموعی اس کے لئے بھی اور ملک کے لئے بھی زیادہ منفعت بخش ثابت ہوں اس لئے وہ اس شدید حب الوطنی کے ساتھ جو قومی وقار کے احساس کے مطابق ہوتی ہے، اور جوان کے لئے وافر مقدار میں دولت بھی مہیا کرے گی، دست کار طبقے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مقامی پیداوار کے اس عقیدے اور نئے انتظامی طریق کار کی تلاش میں ناکامی، یہ دونوں ہی باتیں قومی متوسط طبقے کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ زرعی پیداوار کے اسی طریق کار کو جاری رکھے جو استعماری دور کی خصوصیت تھی۔

آزادی کے دور کی قومی اقتصادیات کسی نئی سطح پر قائم نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق اب بھی مونگ پھلی کی کاشت، کوکو کی فصل اور زیتون کی پیداوار سے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح بنیادی پیداواروں کو بیچنے کے طریقے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آتی اور ملک میں کوئی ایک کارخانہ بھی نصب نہیں ہوتا۔ خام مواد کی برآمد اب بھی جاری رہتی ہے۔ ہم اب بھی یورپ کے چھوٹے چھوٹے کسان اور خام پیداوار کے ماہر ہی بنے رہتے ہیں۔

تاہم قومی متوسط طبقہ اقتصادیات اور تجارتی حلقے کو قومی ملکیت میں لینے کا مسلسل مطالبہ کرتا رہتا ہے، اس لئے کہ اس کے نقطہ نظر سے قومی ملکیت سے مراد یہ نہیں ہے کہ پوری اقتصادیات کو قومی خدمت اور قومی ضرورت کے مطابق صرف کرنے کا فیصلہ کیا جائے۔ اس کے نزدیک قومی ملکیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ملک کو ان نئے سماجی تعلقات کی روشنی میں چلایا جائے جن کی نشوونما کی حوصلہ افزائی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس کے لئے قومی ملکیت بنانے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ان ناجائز منافعوں کو جو استعماری دور کی یادگار ہیں، مقامی ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے۔

چونکہ متوسط طبقے کے پاس نہ کافی سامان ہوتا ہے۔ اور نہ ہی کافی ذہنی وسائل (ذہنی وسائل سے ہماری مراد انجنیئر اور ماہرین ہیں) اس لئے یہ اپنے دعوؤں کو ان تجارتی دفاتر اور اداروں تک ہی محدود رکھتا ہے۔ جن پر پہلے نوآبادکار قابض تھے۔ قومی بورژوا سابقہ یورپی آبادی کی جگہ لے کر ڈاکٹر، بیرسٹر، تاجر، سیلز مین جنرل ایجنٹ ٹرانسپورٹ ایجنٹ وغیرہ بن جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ملک کے وقار اور اس کی اپنی بھلائی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ یہ سب جگہیں حاصل کر لے۔ اب سے وہ اس بات پر زور دے گا کہ تمام بڑی بڑی غیر ملکی کمپنیاں خواہ وہ ملک کے ساتھ تعلق برقرار رکھنا چاہتی ہوں یا نئے سرے سے تعلق قائم کرنا چاہتی

ہوں، اسی کی وساطت سے ہی سارا کاروبار کریں۔ اس طرح قومی متوسط طبقہ اپنے تاریخی کردار کو یعنی دلالی کے کردار کو بخوبی سمجھ لیتا ہے۔

اس کی اپنی نگاہوں سے دیکھا جائے تو اس کا مشن قوم کی قلب ماہیت نہیں معلوم ہوتا۔ حقیقی معنوں میں اس کا کام قوم اور سرمایہ داری کے داری کے درمیان رابطے کا ہے، ایسی شدید مگر ڈھکی چھپی سرمایہ داری جس پر فی زمانہ تو استعماریت کی نقاب پڑی ہوئی ہے۔ قومی بورژوا مغربی بورژوا کے تجارتی ایجنٹ کی حیثیت سے بڑا مطمئن نظر آتا ہے اور اپنا کردار کسی ذہنی الجھن کے بغیر بڑے پروقار انداز سے ادا کرتا ہے۔

لیکن اس کا یہی منفعت کوش کردار، بساطی کی حیثیت، پست زاویہ نظر اور ہر قسم کی امنگوں کی عدم موجودگی، یہی اس بات کی علامت ہے کہ قومی متوسط طبقہ بورژوازی کی حیثیت سے اپنا تاریخی رول ادا کرنے کا اہل نہیں ہے۔ تمام قومی متوسط طبقے کی خصوصیات مثلاً رہنمائی کا حرکی پہلو، نئی دنیاؤں کی ایجاد اور دریافت کی صلاحیت اس کے یہاں افسوس ناک حد تک ناپید نظر آتی ہے۔ استعماری ممالک میں عیاشی بورژوا کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ وہ اس لئے کہ قومی بورژوا اپنے آپ کو مغربی بورژوا کے مماثل سمجھتا ہے جس سے اس نے سبق حاصل کیا ہے۔ وہ مغربی بورژوا کی منفی اور انحطاطی راہوں پر گامزن ہو جاتا ہے گو وہ مغربی بورژوا کی تقلید اس کے پہلے دور کی ایجاد و تفتیش کے مراحل کے سلسلے میں مطلق نہیں کرتا۔ اور یہ پہلا دور بہرصورت مغربی بورژوا کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ استعماری ملکوں کا قومی بورژوا آغاز میں ہی خود کو مغربی بورژوا کے انحطاط سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ یہ تو سوچنا ہی بیکار ہے کہ اس کا یہ قدم آگے کی سمت ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ انتہا اسے ابتدا کرنے کے مترادف ہے۔ یہ نوجوانی کی بے صبری، بے خوفی اور کامیابی کے ارادے کے بغیر بڑھاپا قبول کر لیتا ہے۔

وہ مغربی بورژوا جو یہاں سیر و سیاحت، شکار کھیلنے اور عیاشی کی غرض سے آتے ہیں، قومی بورژوا کو انحطاط کے راستوں پر لے جانے میں بہت زیادہ مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مغربی بورژوا کی خواہشات پوری کرنے کے لئے قومی بورژوا آرام و آسائش کے مراکز اور عیش و عشرت کے اڈے قائم کرتا ہے۔ اس چیز کو سیاحت کا نام دے کر اس موقع کے لئے اسے قومی صنعت کے طور پر فروغ دیا جاتا ہے۔ اگر اس بات کا کوئی ثبوت درکار ہو کہ کس طرح سابق بورژوا کے بعض عناصر مغربی بورژوا کے لئے دعوتوں کے منتظم بن جاتے ہیں تو لاطینی امریکہ میں جو کچھ ہو چکا ہے اس پر ایک نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ ہوانا اور میکسیکو

کے ہوٹل، رینو کے ساحل، برازیل اور میکسیکو کی چھوٹی چھوٹی دونسلی تیرہ تیرہ سالہ لڑکیاں، اکاپلکو اور کوپا کا بانا کی بندرگاہیں یہ سب قومی متوسط طبقے کی بدچلنی کا کلنک ہیں۔ چونکہ یہ خیالات سے محروم ہوتا ہے، چونکہ یہ اپنے آپ میں محدود رہتا ہے اور خود کو عوام سے توڑ لیتا ہے، چونکہ یہ اپنی موروثی نااہلیت کے باعث قوم کے مسائل پوری قوم کے نقطہ نظر سے دیکھنے کا اہل نہیں ہے، اس لئے قومی متوسط طبقہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتا کہ مغربی کاروبار کے دلال کا کردار ادا کرے اور اپنے ملک کو حقیقتاً یورپ کا قحبہ خانہ بنادے؟۔

ایک بار پھر ہمیں لاطینی امریکہ کی بعض جمہوریتوں کی افسوسناک مثالوں پر نظر ڈالنی ہوگی۔ ریاست ہائے متحدہ کے بینکوں کے مالکین، ماہرین، اور بڑے بڑے تاجروں کو ہوائی جہازوں میں قدم رکھنے کی دیر ہوتی ہے کہ وہ نیم گرم خطوں کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں وہ ایک ہفتے یا دس دن کے لئے ان لذیذ سیاہ کاریوں میں ڈوب جاتے ہیں جو ان کے ایجنٹ ان کے لئے مہیا کرتے ہیں۔

زمین کے مالکوں کا رویہ بھی شہروں کے متوسط طبقے کا سا ہی ہوتا ہے۔ بڑے بڑے کسان آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی زرعی پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا مطالبہ کردیتے ہیں۔ کئی تہہ دار چالبازیوں سے کام لے کر وہ اس زمین کو جس پر پہلے نوآبادکار قابض تھے اڑا لے جانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور اس طرح دیہاتوں پر اپنا پنجہ مضبوط کر لیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ نئے زرعی طریقے رائج کرتے ہیں نہ کھیتوں کو زیادہ کاوش سے کاشت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے زرعی نظام کو مناسب طور پر قومی اقتصادیات میں ضم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مالکان زمین اب اس بات پر مصر ہوں گے کہ حکومت انہیں ان سہولتوں اور مراعات کی نسبت جو پہلے وقتوں میں بیرونی آبادکاروں کو حاصل تھیں، سوگنا زیادہ سہولتیں اور مراعات دے۔ زرعی مزدوروں کا استحصال اب اور شدید ہوجائے گا، اور اسے جائز قرار دیا جائے گا۔ دو چار نعروں کا سہارا لے کر اور قومی کاوش کے نام پر یہ نئے استعماری زرعی مزدوروں سے بے تحاشا کام کا مطالبہ کریں گے۔ زراعت کو جدید طرز پر ڈھالا نہیں جائے گا، ترقی کے لئے کوئی منصوبہ تیار نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی نیا راستہ اختیار کیا جائے گا۔ کوئی نیا قدم ان لوگوں پر دہشت طاری کردیتا ہے اس لئے کہ نیا قدم اٹھانے میں تھوڑا بہت خطرہ بھی ہوتا ہے اور یہ بات ہچکچانے والے اس زیرک زمیندار بورژوا کو مکمل طور پر پریشان کر دیتی ہے جو آہستہ آہستہ استعماریت کے بنائے ہوئے راستوں پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دیہاتوں میں جہاں

اس طرح کی صورت حال ہو، حالات بہتر بنان کی کوشش حکومت ہی کی جانب سے ہوتی ہے، حکومت حکم چلاتی ہے، حوصلہ افزائی کرتی ہے اور سرمایہ مہیا کرتی ہے۔ زمیندار بورژوا ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوتا اور ہر نئی کوشش اور اس میں شامل خطرے کا مخالف رہتا ہے۔ وہ ریت پر محل بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کی غرض ٹھوس سرمایہ کاری اور فوری نفع خوری سے وابستہ ہوتی ہے۔ وہ کثیر منافع جو اس کی جیب میں جاتا ہے، اور قومی آمدنی کے پیش نظر تو یہ منافع کثیر ہی ہوتا ہے، دوبارہ کسی کام میں نہیں لگایا جاتا۔ ''اپنی دولت اپنی جیب میں'' والی ذہنیت ان مالکان زمین کی نفسیات میں نمایاں ہوتی ہے۔ بعض اوقات بالخصوص آزادی کے فوراً بعد کے سالوں میں بورژوا اس منافع کو جو وہ اپنی زمین سے کماتا ہے غیر ملکی بینکوں میں لگانے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ دوسری جانب وہ کثیر رقوم اپنی نمائش پر، کاروں، دیہاتی بنگلوں اور ان تمام چیزوں پر خرچ کرتا ہے، جنہیں ماہرین اقتصادیات بجا طور پر پسماندہ بورژوا کی خصوصیات گردانتے ہیں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ قومی بورژوا جب برسر اقتدار آتا ہے تو وہ اس حیثیت کو حاصل کرنے کے لئے جو پہلے غیر ملکیوں کے لئے مقرر تھی، اپنی جماعتی جارحیت استعمال کرتا ہے۔ درحقیقت آزادی کی پہلی صبح کو ہی یہ بڑی شدت سے استعماری شخصیات، بیرسٹروں، تاجروں، زمین کے مالکوں، ڈاکٹروں اور اعلیٰ سرکاری عہدیداروں پر حملے شروع کر دیتا ہے۔ یہ ان لوگوں کے خلاف جو ''ہمارے قومی وقار کی توہین'' کرتے ہین آخر دم تک جہاد کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ حکمران جماعتوں کو قومی اور افریقیائی بنانے کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے وہ اس کے یہ اعمال اس وقت تک نسلی تعصّبات میں رنگتے چلے جائیں گے جب تک وہ حکومت کے سامنے واضح طور پر یہ مطالبہ پیش نہیں کرتا کہ ''ہمیں ان عہدوں پر متعین کیا جائے۔'' جب تک انہیں ایک ایک عہدہ مل جاتا وہ اپنی غراہٹ بند نہیں کریں گے۔

شہروں کا مزدور پیشہ طبقہ، بے روزگاروں کا انبوہ، چھوٹے موٹے دستکا اور کاریگر اپنے طور پر اس قومی رجحان کی پیروی کرتے ہیں لیکن اگر آپ انصاف کی پوچھتے ہیں تو وہ محض بورژوا کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اگر قومی بورژوا یورپیوں کے ساتھ مقابلے پر اتر آتے ہیں تو یہ دستکار اور کاریگر غیر افریقیوں کے ساتھ جنگ شروع کر دیتے ہیں۔ آئوری کوسٹ میں دوہمان اور وولٹا کے خلاف دراصل نسلی فسادات ہی ہیں۔

دوہمان اور وولٹا کے لوگ چھوٹی موٹی تجارت کے زیادہ بڑے حصہ پر قابض ہیں اور اعلان آزادی کے بعد سے آئوری کوسٹ کے عوام ان کے خلاف معاندانہ رجحانات کا اظہار کرتے ہیں۔قوم پرستی سے ہم انتہا پسند قوم پرستی اور انتہا پسند قوم پرستی سے جارحانہ قوم پرستی اور بالاخر نسل پرستی تک پہنچ جاتے ہیں۔ غیر ملکیوں سے چلے جانے کو کہا جاتا ہے، ان کی دکانیں جلادی جاتی ہیں۔ان کی سڑک کی اسٹالیں گرادی جاتی ہیں اور ریوں آیوری کوسٹ کی حکومت انہیں نکل جانے کا حکم دیتی ہے اور اپنے ہم قوموں کو تسلی دیتی ہے۔ سینی گال میں یہ سوڈانیوں کے خلاف مظاہرے تھے، جنہوں نے مسٹر محمد الضیاء سے یہ الفاظ کہلوائے۔

''حقیقت یہ ہے کہ سینی گالی عوام کی مالی کے مبہم تصور سے وابستگی اس لئے تھی کہ وہ اس کے راہنماؤں سے محبت کرتے تھے۔ مالی سے ان کے تعلق کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان کی سیاسی حکمت عملی پر انہیں بھرپور اعتماد تھا۔سینی گال کی سرزمین پہلے بھی کم اہم نہ تھی۔حقیقت یہ ہے کہ اس کی اہمیت اس لئے بھی نمایاں ہوئی کہ ڈالر میں سوڈانیوں کی موجودگی ہمہ وقت سینی گال کے وجود کا احساس دلاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کپ چھپتانا تو دور کی بات ہے۔فیدریشن سے علیحدگی کا عوام کے انبوہ نے خیر مقدم کیا ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے کہیں ایک ہاتھ بھی بلند نہیں ہوا۔'' (18)

ادھر تو یہ ہے کہ سینی گالیوں کے بعض حلقے ان مواقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جو ان کے رہنما انہیں سوڈانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے فراہم کرتے ہیں، کہ یہ سوڈانی ان کے تجارتی معاملات اور انتظامی عہدوں کی راہ میں حائل ہیں۔ادھر کانگو والے جو ویسے تو بلجیم والوں کے اجتماعی کوچ پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی خاموش رہتے ہیں مگر ان سینی گالیوں پر البتہ دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کرتے ہیں جو لیو پولڈول اور ایلزیتھ ول میں آباد ہیں تا کہ وہ وہاں سے نکل جائیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ ان دومختلف صورتوں میں ایک ہی جیسے حالات ہیں۔اگر نوعمر قوم کے دانشور اور تاجر بورژوا کے راستے میں یورپی حائل ہوتے ہیں تو شہری عوام کا مقابلہ، اصولی طور پر کسی دوسری قوم کے افریقیوں سے ٹھہرتا ہے۔آیوری کوسٹ میں یہ مد مقابل دہومانی ہیں، گھانا میں نائجیریائی اور سینی گال میں سوڈانی۔

جب بورژوا کا یہ مطالبہ کہ حکمران جماعت محض نیگرو یا عربوں سے تشکیل دی جائے، قومی ملکیت کی

کسی معتبر تحریک سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ محض اس قوت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی بے قراری کا نتیجہ ہوتا ہے جو کہ آج تک غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی، تو عوام بھی اپنی سطح پر نیگرو یا عرب کے تصور کو محض چند علاقائی حدود تک محدود کرتے ہوئے اسی قسم کا مطالبہ کریں گے۔ براعظم کے اتحاد کے پر جوش دعوؤں اور رہنماؤں سے حاصل شدہ عوامی رویوں کے درمیان بہت سے مختلف رجحانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہمیں افریقی اتحاد کے تصور میں مستقل اونچ نیچ نظر آتی ہے۔ یہ تصور بڑی تیزی سے گمنامی کی دھند میں لپٹتا جاتا ہے اور جارحانہ قوم پرستی کی نہایت تلخ اور قابل نفریں صورت حال کی طرف دل شکن مراجعت نظر آتی ہے۔

''جہاں تک سینی گال کا تعلق ہے وہ رہنما جو افریقی اتحاد کا تصور پیش کر رہے تھے اور جنہوں نے اس تصور کی خاطر اپنی مقامی سیاسی تنظیموں اور ذاتی حیثیتوں کی قربانی بھی دی، پوری نیک نیتی کے باوجود یقینی طور پر اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی غلطی، یوں کہیے کہ ہماری غلطی، یہ ہے کہ ہم نے اتحاد دشمن قوتوں سے لڑنے کی دھن میں ماقبل استعمار کی علاقائیت کے رجحانات کو پیش نظر رکھا۔ ہماری غلطی یہ رہی ہے کہ ہم نے اپنے تجزیئے میں اس صورت حال پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اگر آپ چاہیں تو اسے استعماریت کا ثمرہ کہہ لیں، لیکن یہ ایسی عمرانی حقیقت ہے جسے اتحاد کا کوئی نظریہ بھی خواہ وہ کتنا ہی قابل تعریف اور دلکش کیوں نہ ہو ختم نہیں کر سکتا۔ ہم نے خود کو سراب کی کشش کے سپرد کر دیا۔ اس ڈھانچے کے سراب کے سپرد جو ہمارے لئے سب سے زیادہ خوش کن تھا اور پھر تصور کو حقیقت سمجھتے ہوئے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ یہی علاقائیت اور اس کے فطری شاخسانے یعنی محدود سطح کی قوم پسندی کو رد کرنے، ہمارے لئے بہتر حالات پیدا کرنے اور ہمارے خیالی منصوبوں کی کامیابی کی ضمانت ہے۔'' (19)

سینی گالیوں کی جارحانہ قوم پرستی سے یولوفوں کی قبائلیت تک کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ قومی بورژوا لوگوں کو بحیثیت مجموعی متاثر کرنے، انہیں روشن خیال بنانے اور تمام مسائل کے بارے میں ان کے نقطہ نظر سے سوچنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ ناکامی بورژوا کی بے اعتمادی اور اس کے مبہم سیاسی نظریات کا شاخسانہ ہوتی ہے اور ہر جگہ جہاں قومی بورژوا نے پوری دنیا کے بارے میں بصیرت حاصل کرنے میں نااہلی دکھائی ہے، ہمیں قبائلی رجحانات کی جانب مراجعت نظر آتی ہے اور غصے اور دکھے ہوئے دل کے ساتھ ہم نسلی احساسات کو اپنی تندترین صورت میں فتح یاب ہوتا دیکھتے ہیں۔ چونکہ بورژوا کا

واحد نصب العین ہی یہی ہے کہ ''غیر ملکی کی جگہ لے لو''اور چونکہ یہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنے لئے انصاف حاصل کرنے اور غیر ملکیوں کی خالی کی ہوئی جگہوں پر قابض ہونے میں بڑی پھرتی دکھاتا ہے لہٰذا قوم کے ''چھوٹے لوگ''، ٹیکسی ڈرائیور، نانبائی اور بوٹ پالش کرنے والے اتنی ہی شدت سے دھومانیوں پر زور دیں گے کہ وہ اپنے علاقوں میں واپس جائیں بلکہ اس سے بھی آگے یہ کہیں گے کہ ''فویسز'' اور ''پیولز'' بھی اپنے اپنے جنگلوں اور پہاڑوں کو لوٹ جائیں۔

اسی نقطہ نظر سے ہمیں اس امر کی وضاحت کرنی چاہئے کہ نو آزاد ممالک میں یہاں وہاں وفاقیت کے اصول کی جیت کیوں ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ استعماریت چند علاقوں کو امتیازی سلوک کے لئے مخصوص کر لیتی ہے۔ نو آبادی کی اقتصادیات کو پوری قوم کی اقتصادیات کے ساتھ منسلک نہیں کیا جاتا۔ اس اقتصادیات کو قابض ممالک کی اقتصادیات کی تکمیل کے لئے منظّم کیا جاتا ہے۔ استعماریت مشکل سے ہی پورے ملک سے فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ صرف ان معدنی وسائل کو منظر عام پر لانے تک محدود ہوتی ہے جو وہ قابض ملک کی صنعتی ضروریات پوری کرنے کے لئے آمد کرتی ہے اور اس طرح سے نو آبادی کے چند مخصوص علاقوں کو نسبتاً مالدار بننے کا موقع مہیا کرتی ہے۔ لیکن باقی تمام نو آبادی پسماندگی اور غربت کے راستے پر چلتی رہتی ہے اور بہر صورت اس دلدل میں اندر دھنستی چلی جاتی ہے۔

آزادی کے فوراً بعد وہ ہم قوم جو زیادہ خوشحال علاقوں میں رہتے ہیں، اچانک اپنی خوش بختی کا احساس کرتے ہیں اور دوسرے ہم قوموں کو کھلانے کے خلاف شدید اور بنیادی ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ علاقے جہاں مونگ پھلی، کوکو اور جواہرات کی بہتات ہے۔ صف اول میں آجاتے ہیں اور اس خالی منظر پر چھا جاتے ہیں جو باقی قوم پیش کرتی ہے۔ مالدار علاقوں کے یہ ہم وطن دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اوان میں انہیں حسد، طمع اور خونخواری کے جذبات نظر آتے ہیں۔ ماقبل استعماریت کی قدیم مخاصمتیں اور مختلف نسلوں کے درمیان نفرتیں پھر منظر عام پر آجاتی ہیں۔ بابو باس لولوآس کے کھلانے سے انکار کر دیتے ہیں کٹنگا اپنی ایک علیحدہ ریاست بنا لیتا ہے اور البرٹ کالونجی جنوبی کا سائی کا بادشاہ بن بیٹھتا ہے۔

افریقی اتحاد کا مبہم کلیہ، وہ کلیہ جس کے ساتھ افریقہ کے مردوں اور عورتوں کی جذباتی وابستگی تھی، اور جس کی عملی صورت نے استعماریت پر بے پناہ دباؤ ڈالا تھا، اب وہی افریقی اتحاد بے نقاب ہو جاتا ہے

اورقومیت کے خول میں رہتے ہوئے بھی علاقائیت کے ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے۔ وہ قومی بورژوا جو اپنے اغراض کی حفاظت کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا اور جس کی نظر اپنے مقاصد سے آگے نہیں جاتی، قومی اتحاد کو قائم کرنے اور قوم کو زیادہ مستحکم اور تخلیقی بنیادوں پر تعمیر کرنے میں بالکل معذور نظر آتا ہے۔ وہ قومی محاذ جس نے استعماریت کے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا، اب بکھر جاتا ہے اور حاصل شدہ فتح کو ضائع کر دیتا ہے۔

نسلوں اور قبیلوں کی بے رحمانہ لڑائیاں اور غیر ملکیوں کے جانے کے بعد خالی آسامیوں کو پر کرنے کی شدید بیتابیاں، یہ چیزیں مذہبی مخالفتوں کو بھی ابھاریں گی۔ دیہاتی علاقوں اور جنگلوں میں چھوٹی چھوٹی برادریاں، مقامی مذاہب اور مرابطی عقیدے ایک نئے جوش کا اظہار کریں گے اور ایک بار پھر برادری اور مذہب سے خارج کرنے کی مہم کا آغاز ہوگا۔ بڑے شہروں میں طبقہ تنظیم کی سطح پر ہم دو بڑے الہامی مذاہب اسلام اور عیسائیت کو آپس میں پنجہ کشتی کرتے ہوئے دیکھیں گے۔

استعماریت جسے افریقی اتحاد کی پیدائش نے جڑوں سے ہلا کر رکھ دیا تھا، اپنا توازن بحال کر لیتی ہے اور تحریک کی تمام کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اتحاد کے عزائم کو توڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ افریقی لوگوں پر ''روحانی'' مخالفتوں کا وجود ظاہر کر کے استعماریت انہیں حرکت میں لے آتی ہے۔ سینی گال کا روز نامہ ''نیا افریقہ'' ہر ہفتہ اسلام اور عربوں کے خلاف نفرت کا زہر اگلتا ہے۔ لبنانی جس کے ہاتھوں میں مغربی ساحلی علاقوں کی چھوٹی موٹی تجارت ہے، قومی بدگوئی کے لئے چنا جاتا ہے۔ پادری موقع کی مناسبت سے عوام کو یہ یاد دلاتے ہیں کہ یورپی استعماریت کی آمد سے پہلے عظیم افریقی مملکتوں کو عرب حملوں نے تاراج کیا تھا۔ یہ کہنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ عربوں کے قبضے کے باعث ہی یورپی استعماریت کے لئے راستہ ہموار ہوا۔ عرب سامراجیت کا عام ذکر ہوتا ہے اور اسلام کی ثقافتی سامراجیت کی مذمت کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی بالعموم زیادہ اہم عہدوں سے عہدہ رکھا جاتا ہے۔ دوسرے علاقوں میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہاں مقامی عیسائیوں کو قومی آزادی کا باشعور اور معروضی دشمن تصور کیا جاتا ہے۔

استعماریت بڑی بے حیائی کے ساتھ ہر طناب کھینچی ہے اور ان افریقیوں کو جو کل تک نوآبادکاروں کے خلاف متحد تھے آپس میں برسرپیکار کر کے مطمئن نظر آتی ہے۔ کسی سینٹ بارتھولومیو کا تصور بعض ذہنوں

میں جگہ پالیتا ہے اور استعماریت کے حامی جب افریقی اتحاد کے شاندار اعلانات سنتے ہیں تو اپنے دل میں تمسخر سے ہنستے ہیں۔ایک ملک میں ہی مذہب عوام کو مختلف روحانی فرقوں میں بانٹ دیتا ہے، جنہیں استعمار اور اس کے آلہ کار اپنی اپنی جگہ قائم اور محفوظ رکھتے ہیں۔ادھر ادھر انتہائی غیر متوقع واقعات پیش آتے ہیں۔ان علاقوں میں جہاں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کا زور ہے ہم مسلمان اقلیتوں کو غیر معمولی سرگرمی کے دین سے وابستہ دیکھتے ہیں۔اسلامی تہوار زندہ کئے جاتے ہیں اور مذہب اسلام کیتھولک دین کی جارحانہ مطلق العنانی کے خلاف اپنے چپے چپے کی حفاظت کرتا ہے۔بعض افراد کے فائدے کے لئے ملک کے وزراء یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ اگر وہ قانع نہیں ہیں تو ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ قاہرہ چلے جائیں۔بعض اوقات امریکی پروٹسٹنٹ بھی اپنا کیتھولک دشمن تعصب افریقی سرزمین میں بوتے ہیں اور مذہب کے ذریعے قبیلہ داری دشمنیاں زندہ رکھتے ہیں۔

براعظم کو بحیثیت مجموعی دیکھئے تو یہ مذہبی کھچاؤ عام نسلی کی تجدید کا باعث ہوتا ہے۔افریقہ سیاہ اور سفید میں منقسم ہے اور اسے جو نئے نام یعنی صحرائے اعظم کے شمال کا افریقہ اور صحرائے اعظم کے جنوب کا افریقہ وغیرہ دیئے گئے ہیں وہ بھی اس مخفی صلیت کو پوشیدہ نہیں رکھتے۔یہاں اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ سفید فام افریقہ کی ہزار سالہ ثقافتی روایات ہیں، یہ بھی بحیرہ روم کے خطے کا ہی ایک حصہ ہے، یورپ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، اور یونانی ولاطینی تہذیب کا ورثہ دار ہے۔سیاہ افریقہ کو ست الوجود، ظالم اور غیر مہذب علاقہ سمجھا جاتا ہے جسے ایک لفظ میں وحشی کہہ کیجئے۔آپ وہاں تمام دن نقاب پوش عورتوں، کئی شادیاں کرنے والوں اور عورتوں کے لئے عربوں کی فرضی نفرت کے بارے میں ناخوشگوار باتیں سن سکتے ہیں۔یہ ساری باتیں اپنے جارحانہ انداز کی وجہ سے ان باتوں کی یاد دلاتی ہے جو نوآبادکار کے منہ سے سنی جاتی تھیں۔ان دونوں عظیم مذہبوں کا قومی بورژوا جو استعماری انداز فکر کو اس کی نہایت بگڑی ہوئی صورت میں ہضم کرتا ہے، یورپیوں سے ایک ایسا نسلی فلسفہ لے کر براعظم میں ہوتا ہے جو افریقہ کے مستقبل کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔اپنی کاہلی اور نقالی کی عادت کی وجہ سے یہ اس نسل پرستی کی پیوندکاری اور سخت گیری کی نشوونما کرتا ہے جو استعماری دور کی خصوصیت تھی۔پس ایسے ملک میں جو خود کو افریقی کہتا ہے، بے کم وکاست نسل پرستانہ باتیں سننا اور ایسے مربیانہ برتاؤ کا مشاہدہ کرنا جو یہ تلخ تاثر دے کہ آپ پیرس یا برسلز یا لندن میں ہیں، کچھ تعجب خیز بات نہیں۔

افریقہ کے بعض علاقوں میں سیاہ فاموں کے ساتھ پدرانہ برتری کا رویہ اور مغربی تہذیب سے مستعار لیا ہوا یہ مکروہ تصور کہ کالا آدمی منطق اور سائنس سے کورا ہے، بالکل واضح اور عریاں انداز میں مروج ہے۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ سیاہ فام اقلیت کو ایک قسم کی نیم غلامی میں جکڑ لیا گیا ہے جس کا فطری نتیجہ چوکنا رہنا یا بہ الفاظ دیگر بے اعتمادی ہے جو سیاہ فام افریقی ممالک سفید فام افریقی ممالک کے بارے میں محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ ظالم سفید افریقہ کے کسی بڑے شہر کی گلیوں میں پھرنے والا سیاہ فام افریقہ کا باشندہ یہ دیکھتا ہے کہ بچے اسے ''نیگرو'' کہتے ہیں اور افسر اس سے گلابی انگریزی میں مخالب ہوتے ہیں۔

اور بدقسمتی سے یہ بات بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ سیاہ افریقہ کے ان طلباء سے جو صحرائے اعظم کے شمال میں ثانوی اسکولوں میں پڑھتے ہیں، اسکول کے ساتھ یہ پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے ملک میں مکان بھی ہوتے ہیں؟ کیا تم جانتے ہو کہ بجلی کیا ہوتی ہے؟ اور کیا تمہارے خاندان میں مردم خوری کا رواج ہے؟ اور بدقسمتی سے یہ بات بھی کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے کہ صحرائے اعظم کے شمال کے بعض علاقوں میں صحرائے اعظم کے جنوب کے ملکوں سے آنے والے افریقی جب اپنے ہم قوموں سے ملتے ہیں تو وہ ہم قوم ان سے یہ التماس کرتے ہیں کہ ہمیں ''کہیں لے چلو بشرطیکہ ہم نیگرووں سے مل سکیں۔'' اسی کے متوازی سیاہ افریقہ کے بعض نئے ممالک میں پارلیمان کے اراکین بلکہ وزراء بھی مزاح کے ذرا بھی شائبے کے بغیر، یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں یہ خطرہ نہیں ہے کہ استعماریت ان کے ملک پر دوبارہ قابض ہو جائے گی بلکہ خطرہ ''شمال سے آنے والے عرب غارتگروں'' کے حملے کا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بورژوا کا دیوالیہ پن صرف اقتصادی میدان میں ہی نمایاں نہیں ہوتا وہ ایک تنگ نظر قوم پرستی اور ایک نسلی نمائندگی کے بل بوتے پر برسر اقتدار آتا ہے۔ ان خوشگوار اعلانات کے باوجود، جو اس لئے معنی سے عاری ہوتے ہیں کہ مقرر غیر ذمہ دارانہ انداز سے ان محاورات کی بھرمار کرتا رہتا ہے جو براہ راست اخلاق اور سیاسی فلسفے پر یورپی رسالوں سے لئے جاتے ہیں، بورژوا ایسے پروگرام کا کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے میں اپنی نااہلی کا ثبوت دیتا ہے جس میں ذرا بھی انسانیت نواز پہلو ہو۔ جب بورژوا کے ہاتھ مضبوط ہوں، جب وہ ہر چیز اور ہر شخص کو اپنے اقتدار کے لئے کام میں لا سکے تو وہ بڑے مثبت انداز میں بعض ایسے جمہوری خیالات کی حمایت کرنے سے نہیں جھجکتا جن کے بارے میں

یہ تصور ہے کہ وہ آفاقی طور پر قابل عمل ہیں۔ ایسا شاذ ہی ممکن ہے کہ وہ بورژوا جس کے اقتصادی طور پر قدم مضبوط ہوں اپنے ہی انسان پرست تصورات کی نفی کرنے پر مجبور ہو جائے۔ مغربی بورژوا، گو بنیادی طور پر نسل پرست ہے، مگر اپنی اس نسل پرستی کو اپنی موشگافیوں سے چھپا لیتا ہے اور اس طرح عظیم انسانی وقار کی حمایت کے بارے میں اس کا بھرم قائم رہتا ہے۔

مغربی بورژوا نے اتنی فصیلیں اور دیواریں کھڑی کر لی ہیں کہ اب اسے ان لوگوں کے مقابلے کا کوئی خطرہ نہیں جنہیں وہ حقیر سمجھتا اور لوٹتا رہا ہے۔ جہاں تک نیگروؤں اور عربوں کا تعلق ہے، مغربی بورژوا کے نسلی تعصب کی بنیاد نسلی حقارت پر ہے۔ یہ ایک ایسی صلیت ہوتی ہے جو اس شے کو جسے یہ حقیر جانتی ہے چھوٹا بنا دیتی ہے۔ بہر کیف بورژوا کے نظریات جو انسانوں کے درمیان ایک بنیادی مساوات کے اعلان پر مبنی ہوتے ہیں، اس کی اپنی نظروں میں منطقی نظر آتے ہیں کہ وہ آخر کار نیم انسانوں کو مکمل انسان بننے کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے مطابق مغربی انسانیت کی مثال اور مظہر، مغربی بورژوا ٹھہرتا ہے۔

نوعمر قومی بورژوا کا نسلی تعصب ایک وفاقی نسل پرستی ہے جو خوف پر مبنی ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ تعصب بھونڈی قبائلیت یا کنبوں اور برادریوں کے درمیان عداوتوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ یوں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ذہن بین الاقوامی مبصروں نے افریقی اتحاد کے بارے میں پر زور خطابت کو کبھی کوئی سنجیدہ بات کیوں نہ سمجھا۔ وہ اس لئے کہ اس اتحاد میں ہر دیکھنے والے کو اتنے زیادہ شگاف نظر آتے ہیں کہ بالآخر عقل کی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے پہلے کہ اتحاد کا دن آئے ان تضادات کو حل ہونا چاہئے۔

افریقہ کے لوگوں نے ابھی حال ہی میں اپنے آپ کو جاننا شروع کیا ہے۔ انہوں نے پورے براعظم کے نام پر پوری شدت سے استعماری حکومت کے خلاف کھڑے ہو جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب قومی بورژوا جو ہر ہر خطے میں اپنے قدم جمانے اور لوٹ کا ایک قومی جال بننے میں بڑی پھرتی دکھا رہا ہے، اتحاد کے اس یوطوپیائی تصور کی راہ میں روڑے اٹکانے کی سرتوڑ کوشش کرتا ہے۔ قومی بورژوا نے جو اپنے مقاصد میں بالکل واضح ہے، یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اس اتحاد کا اور پچیس کروڑ انسانوں کی اپنی کم عقلی، بھوک اور غیر انسانیت پر بیک وقت فتح پانے کی مربوط کوشش کا راستہ روکے۔ انہیں اسباب کے باعث ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ افریقی اتحاد کا حصول، عوام کی بڑھتی ہوئی قوت اور عوام کی رہنمائی سے ہی ممکن ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ بورژوا کے مفادات کو کچل دیا جائے۔

جہاں تک داخلی معاملات اور مختلف اداروں کا تعلق ہے، قومی بورژوا یہاں بھی یکساں طور پر اپنی نا اہلیت کا ثبوت دیتا ہے۔ بعض پس ماندہ ممالک میں پارلیمانی کھیل پہلے دن سے ہی چال بازی پر مبنی ہوتا ہے۔ اقتصادی طور پر ناتواں، ہموار معاشرتی تعلقات پیدا کرنے میں ناکام، اور بطور ایک طبقے کے اپنے تسلط کے اصول پر قائم، بورژوا وہ حل چنتا ہے جو اسے آسان ترین نظر آتا ہے یعنی محض ایک سیاسی جماعت کا قیام۔ اسے وہ مطمئن ضمیر اور سکون حاصل نہیں ہوتا جو صرف اقتصادی قوت اور ریاستی نظام کا کنٹرول ہی دے سکتا ہے۔ بورژوا وہ ریاست تشکیل نہیں کرتا جو ایک عام شہری کو اطمینان دلا سکے بلکہ ایک ایسی ریاست بناتا ہے جو اس کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کرے۔

ریاست جسے اپنی قوت اور فہم وادراک سے لوگوں میں خود اعتمادی پیدا کر کے انہیں غیر مسلح کرنا اور لوری دے کر سلانا چاہئے، اس کے برعکس اپنی شان وشوکت کے اظہار سے خود کو مسلط کرتی ہے، مختلف مظاہرے کرتی ہے، لوگوں کو ڈراتی دھمکاتی ہے اور اس طرح شہریوں کو یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ مسلسل خطرے میں ہیں۔ یک جماعتی نظام بورژوا آمریت کی وہ جدید صورت ہے جو بے نقاب، بے رنگ، بے ضمیر اور بے لحاظ ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ایسی آمریت زیادہ دیر نہیں چلتی۔ یہ خود اپنے تضادات کا سلسلہ روک نہیں سکتی۔ چونکہ بورژوا کے پاس اپنا تسلط محفوظ رکھنے اور باقی ماندہ ملک کے سامنے چند ٹکڑے پھینکنے کے لئے اقتصادی ذرائع نہیں ہوتے، مزید برآں چونکہ یہ جلد از جلد اپنی جیبیں بھرنے اور نہایت بے مزہ طور پر بھرنے میں مشغول رہتا ہے لہٰذا ملک اور بھی زیادہ گہرے جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس جمود کو چھپانے اور اس مراجعت پر نقاب ڈالنے کے لئے، اپنے آپ کو حوصلہ اور کوئی ایسی شے دینے کے لئے جس پر وہ فخر کر سکے بورژوا کو اس سے بہتر اور کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ وہ دارالحکومت میں عالیشان عمارتیں تیار کرائے اور دولت ان چیزوں پر صرف کرے جنہیں عرف عام میں نمود ونمائش کے اخراجات کہا جاتا ہے۔

قومی بورژوا اپنے پسماندہ ملک کے داخلی اور حقیقی مسائل سے نظریں پھیرتا جاتا ہے اور سابقہ قابض ملک اور غیر ملکی سرمایہ داروں کی جانب مائل ہوتا جاتا ہے جو اس کی فرمانبرداری پر انحصار کرتے ہیں۔ چونکہ یہ اپنے فائدے میں عوام کو حصے دار نہیں بناتا اور لوگوں کو ان رقوم سے کسی صورت مستفیض نہیں ہونے دیتا جو بڑی بڑی غیر ملکی کمپنیاں اسے ادا کرتی ہیں، لہٰذا اس کو ایک ایسے عوامی رہنما کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اقتدار کو مستحکم کرنے اور اس کے تسلط کو قائم رکھنے کا دوہرا کام انجام دے سکے۔ پسماندہ ممالک کی بورژوائی آمریت اپنی قوت کسی راہنما کے وجود سے حاصل کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں بورژوائی آمریت بورژوا کی اقتصادی قوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس پسماندہ ممالک میں راہنما اخلاقی قوت کی علامت ہوتا ہے اور اس کی پناہ میں نوخیز قوم کا کمزور اور غربت زدہ بورژوا امیر بننے کی ٹھانتا ہے۔

عوام جنہوں نے سالہا سال سے اس رہنما کو دیکھا ہے اور اس کی تقریریں سنی ہیں، جو اس سے فاصلے پر رہ کر بھی ایک خواب کی سی کیفیت کے ساتھ استعماری قوتوں سے مقابلے میں اس کے پیروکار رہے ہیں، وہ اس محبِّ وطن پر بے ساختہ اعتماد کا اظہار کر دیتے ہیں۔ آزادی سے پہلے یہ رہنما بالعموم عوام کی آزادی کی آرزوؤں، سیاسی حریت اور قومی وقار کی علامت ہوتا ہے لیکن آزادی کا اعلان ہوتے ہی عوام کی ضروریات کو نظرانداز کر کے جو روٹی، زمین اور ملکی نظام کو عوام کے مقدس ہاتھوں میں سونپنے پر مشتمل ہوتی ہیں، وہ اپنے نجی مقاصد کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اب وہ اس منافع خور دھڑے کی صدارت کرتا ہے جو اپنے منافع کے لئے بے چین ہوتا ہے اور جس سے قومی بورژوا کی جماعت تشکیل پاتی ہے۔

اپنے بیشتر ایماندارانہ رویے اور مخلصانہ اعلانات کے باوجود، اگر غیر جانبداری سے دیکھا جائے تو رہنما ان مفادات کا بہت سخت دفاع کرتا ہے جو آج قومی بورژوا اور سابق استعماری کمپنیوں کے مشترکہ مفادات ہیں۔ اس طور پر ایمانداری جو اس کی روح کا حقیقی خاصہ ہے، آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کا عوام سے رابطہ اس قدر غیر حقیقی ہو جاتا ہے کہ بالاخر وہ خود یہ سمجھنے لگتا ہے کہ لوگ اس کے اقتدار سے متنفر ہیں اور ان خدمات پر جو اس نے ملک کے لئے کی ہیں، شک وشبہ کیا جا رہا ہے۔ وہ عوام کی احسان فراموشی کو بڑے غصے سے دیکھتا ہے۔ دن بہ دن وہ اور زیادہ مستعدی سے اپنے آپ کو استحصال کنندگان کے ساتھ شامل کرتا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ جانتے بوجھتے ہوئے اس نوخیز بورژوا کا معاون و مددگار بن جاتا ہے جو بدی اور لذت پرستی کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔

نئی ریاست کی اقتصادی راہیں بالاخر ناگزیر طور پر نو استعماری راہوں سے آملتی ہیں۔ کل تک جس قومی اقتصادیات کی حفاظت کی جاتی تھی، آج اسے باقاعدہ کنٹرول کیا ہے۔ بجٹ کو قرضوں اور عطیوں سے متوازن کیا جاتا ہے جب کہ ہر دوسرے تیسرے ماہ وزرائے اعلیٰ خود یا ان کے سرکاری مندوب اپنے

پرانے قابض ملک یا کسی اور جگہ سرمائے کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔

سابقہ استعماری قوت اپنے مطالبات میں اضافے کرتی ہے اور مراعات اور ضمانتوں کے ڈھیر جمع کر لیتی ہے اور اب وہ اس تسلط کو جو اسے قومی حکومت پر حاصل ہے، چھپانے کی تکلیف بھی کم سے کم کرتی ہے۔ عوام جو قابل رحم حد تک نا قابل برداشت غربت میں دب چکے ہیں۔ آہستہ آہستہ اپنے رہنماؤں کی نا قابل بیان غداری کو سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ بیداری ان معنوں میں اور بھی زیادہ شدید ہوتی ہے کہ بورژوا کسی چیز سے سبق حاصل کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ سرمائے کی تقسیم جس پر بورژوا اثر انداز ہوتا ہے۔ بہت زیادہ حلقوں میں نہیں پھیلتی، نہ ہی یہ مختلف سطحوں میں پہنچتی ہے اور نہ ہی درجات کی سیڑھیاں بناتی ہے۔ یہ نیا فرقہ اس لئے بھی ذلت آمیز بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہوتا ہے۔ کہ بہت بڑی اکثریت، آبادی کا 9/10 حصہ فاقوں سے مرتا رہتا ہے۔ دولت کے حصول میں اس فرقے کی شرمناک، تیز رفتار اور بے رحم لوٹ کھسوٹ کے ساتھ ہی عوام میں ایک فیصلہ کن بیداری اور ایک ابھرتا ہوا شعور پیدا ہوتا ہے جو آنے والے طوفانی دنوں کا یقین دلاتا ہے۔ بورژوائی فرقہ یعنی قوم کا وہ طبقہ جو اپنے فائدے کے لئے ملک کا سارا سرمایہ سمیٹ لیتا ہے، ایک طرح کی غیر متوقع منطق سے، دوسرے نیگرو اور عربوں کے بارے میں ایسی تحقیر آمیز رائے کا اظہار کرتا ہے جو استعماری قوت کے سابقہ نمائندوں کے نسل پرستانہ عقائدہ کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی عوام کی غربت اور بورژوا طبقے کی غیر معتدل کمائی اور باقی تمام قوم کے لئے اس کی حقارت، فکر وعمل کی سخت گیری کا باعث بنے گی۔

لیکن ایسے اندیشے اقتدار کی قوت کو بروئے کار لائیں گے اور آمریت کے ظہور کا باعث ہوں گے۔ وہ رہنما جس کے پاس عمر بھر کی سیاسی سرگرمی اور بے لوث حب الوطنی ہوتی ہے اب عوام اور حریص بورژوا کے درمیان ایک پردہ بن جاتا ہے کیونکہ وہ اس طبقے کی جسارت کا تو ضامن بن جاتا ہے لیکن اس کی بد تمیزی، اس کے عامیانہ پن اور اس کی بنیادی بداخلاقی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ عوام کے جاگتے ہوئے شعور کو روکنے والی قوت کا کام کرتا ہے۔ وہ بورژوا طبقے کی مدد کرتا ہے اور اس چالبازیوں کو عوام سے چھپاتا ہے اور اس طرح عوام الناس کو پریشان خیال اور گمراہ کرنے کا کام بڑے شد ومد سے کرتا ہے۔ جب بھی وہ عوام سے مخاطب ہوتا ہے تو اپنی بہادرانہ زندگی، عوام کے نام پر کی گئی جدوجہد اور عوام کے نام پر حاصل کی گئی فتوحات کو ان کے ذہنوں میں تازہ کرتا ہے اور پھر لوگوں کو واضح طور پر یہ کہتا ہے کہ انہیں اس پر اعتماد

رکھنا چاہئے۔ ایسے افریقی حب الوطنوں کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جنہوں نے اپنے بزوگوں کے محتاط سیاسی اقدامات میں اپنے قوم پرست نقطہ نظر کے مطابق ایک فیصلہ کن اسلوب شامل کیا۔ یہ لوگ جنگلوں سے آئے اور حاکم قوت کی نظروں میں بدنام اور دارالحکومت کے قوم پرستوں کے لئے باعث شرم ہونے کے باوجود انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ جنگلوں سے آئے ہیں اور نیگروؤں کے حق میں آواز بلند کی۔ ان لوگوں نے اپنی نسل کی تعریف کے نغمے الاپے اور ماضی کا سارا بوجھ، جس میں مروم خوری اور انحطاط پسندی بھی شامل ہے، اپنے سر لے لیا۔ افسوس ہے کہ آج یہی لوگ منتظمین کے ایسے گروہ کے سربراہ ہیں جو جنگلوں سے اپنا منہ موڑ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے عوام کا کام ہی اطاعت کرنا، اطاعت کئے جانا اور رہتی دنیا تک اطاعت گذار ہی رہنا ہے۔

رہنما عوام کو تسلیاں دیتا رہتا ہے۔ حصول آزادی کے کئی سال بعد تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ عوام کو کوئی ٹھوس کام کرنے پر آمادہ نہیں کر پاتا، وہ ان پر مستقبل کے در کھولنے اور انہیں قومی تعمیر نو، بہ الفاظ دیگر ان کی اپنی تعمیر نو کی راہ پر ڈالنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ تاریخ آزادی کا جائزہ لیتا رہتا ہے اور جدوجہد آزادی کے مقدس اتحاد کو یاد کرتا رہتا ہے۔ چونکہ رہنما قومی بورژوا کو ختم کرنے سے انکار کر دیتا ہے لہٰذا وہ عوام کو یہ کہتا ہے کہ وہ ماضی کی طرف پلٹ جائیں اور اس دور کی یاد میں سرشار رہیں، جو انہیں بالآخر آزادی کی سمت لے گیا۔ معروضی طور پر دیکھئے تو رہنما عوام کو جمود میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ یا تو انہیں تاریخ سے خارج کر دے اور یا پھر اُنہیں تاریخ میں جڑیں نہ پکڑنے دے۔ جدوجہد آزادی کے دوران میں تو رہنما نے عوام کو بیدار کیا اور انہیں شجاعانہ اور انتھک طور آگے بڑھنے کا یقین دلایا۔ آج وہ انہیں سلا دینے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا ہے اور سال میں تین چار مرتبہ انہیں استعماری دور یاد کرنے اور اس طویل راہ پر جس پر وہ اب تک چل چکے ہیں نظر ڈالنے کے لئے کہتا رہتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ عوام اس سفر کی قدر مطلق نہیں کر پاتے جو وہ اب تک کر چکے ہیں، کسان جو زمین سے اپنے لئے رزق کرید لے چکے جاتے ہیں اور وہ بے روزگار جنہیں کبھی بھی روزگار میسر نہیں آتا، قومی تعطیلات اور پرچموں کے باوجود، خواہ ان کے رنگ کتنے ہی بھڑ کے لئے کیوں نہ ہوں، اپنے آپ کو یہ یقین دلا پاتے کہ ان کی زندگی میں کوئی چیز سچ مچ تبدیل ہوگئی ہے مگر وہ بورژوا، جس کے پاس قوت ہوتی

ہے، جلوسوں میں بے کار اضافے کرتا رہتا ہے۔ عوام کسی فریب نظر میں مبتلا نہیں ہوتے۔ عوام بھوکے ہوتے ہیں اور پولیس والے اپنے افریقی ہونے کے باوجود انہیں کسی قسم کی تسلی دینے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ عوام آرزدہ خاطر ہونے لگتے ہیں۔ وہ اب اس قوم سے منہ پھیر لیتے ہیں جس میں انہیں کوئی جگہ نہیں ملتی اور اب قوم سے ان کی دلچسپی ختم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔

تاہم وقتاً فوقتاً رہنما اپنی کوشش کرتا رہتا ہے۔ وہ عوام کو مطمئن کرنے، انہیں پرسکون رکھنے اور انہیں خوش کرنے کے لئے ریڈیو پر تقریریں اور ملک کا دورہ کرتا ہے۔ کسی جماعت کی عدم موجودگی میں رہنما اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران میں کم از کم ایک جماعت ضرور تھی جسے یہ موجودہ رہنما چلا رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے یہ جماعت افسوسناک طور پر انحطاط پذیر ہو گئی۔ اب سوائے جماعت کے ایک خول کے، جماعت کے امتیازی نشان اور امتیازی نعرے کے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ وہ زندہ جماعت جسے یہ چاہئے تھا کہ وہ ایسے خیالات کا آزادانہ تبادلہ ممکن بنائے جو عوام کی حقیقی ضروریات کی وضاحت کے لئے پیدا ہوئے ہوں، اب ذاتی اغراض کی ٹریڈ یونین بن جاتی ہے۔ آزادی کے اعلان کے بعد اب جماعت کا یہ کام نہیں رہ جاتا کہ وہ عوام کو اپنے مطالبات کے لئے آواز بلند کرنا سکھائے، ان کی ضروریات کے بارے میں آگہی حاصل کرے اور عوام کی قوت کے تسلط کے لئے بہتر صلاحتیں پیدا کرے۔ آج جماعت کا فرض محض یہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان ہدایات کو عوام تک پہنچا دے جو اسے اوپر سے حاصل ہوتی ہیں۔ اب اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کا وہ سودمند لین دین باقی نہیں رہتا جو کسی جماعت میں جمہوریت کے وجود اور بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اب جماعت رہنماؤں اور عوام کے درمیان ایک پردہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اب جماعتی سرگرمی باقی نہیں رہ جاتی اس لئے کہ وہ شاخیں جو استعماری دور میں قائم ہوئی تھیں اب مکمل طور پر ختم کر دی جاتی ہیں۔

پس شدت پسند اب اس نئے نظم وضبط کے تحت مضطرب رہتے ہیں۔ وہ رویہ جو بعض شدت پسندوں نے آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں اختیار کیا تھا، اب جائز نظر آتا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ عین جدوجہد کے دوران متعدد شدت پسندوں نے اپنے رہنماؤں سے کوئی عقیدہ بنانے، اپنے مقاصد واضح پر متعین کرنے اور کوئی پروگرام تیار کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر قومی اتحاد کی حفاظت کا عذر کر کے رہنماؤں نے اس قسم کی ہر کوشش سے صاف انکار کر دیا تھا۔ بار بار بس یہ کہا جاتا تھا کہ اکلوتا قابل قدر

عقیدہ استعماریت کے خلاف پوری قوم کا اتحاد ہے۔ اوراس طرح اصولوں کے بجائے محض ایک تند تیز نعرے سے مسلح ہوکر وہ آگے بڑھتے رہے۔ ان کی اکلوتی نظریاتی سرگرمی محض یہ رہ گئی کہ وہ عوام کے حق خود ارادیت کی مختلف صورت پیش کریں اور یوں تاریخ کے دھارے کے بہاؤ پر چلتے رہیں جس کا لازمی نتیجہ استعمار کی شکست ہوگا۔ اب اگر تشدد پسندوں نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا تاریخ کے اس دھارے کا کچھ زیادہ واضح تجزیہ نہیں کیا جاسکتا تو رہنما نے انہیں امید اور اعتماد عطا کرنے کے بجائے ختم استعماریت کی ضرورت اوراس کی ناگزیری پر ہی زور دیا۔

آزادی کے بعد جماعت ایک غیر معمولی میں ڈوب جاتی ہے۔ شدت پسند کارکنوں کا صرف اس وقت یاد کیا جاتا ہے جب عوامی مظاہروں، بین الاقوامی مذاکروں یا تقریبات آزادی کی ساعت آئے۔ جماعت کی مقامی رہنماؤں کی مستظمہ سے منسلک کرلیا جاتا ہے۔ جماعت کا کام انتظامی حدود میں ہوتا ہے اور شدت پسند عنصرانبوہ میں گم ہوکر ایک عام شہری کا خالی خولی خطاب حاصل کرلیتا ہے۔ اب چونکہ شدت پسند بورژوا کو تسلط دلانے کا تاریخی فریضہ پورا کر چکتے ہیں لہٰذا انہیں صاف طور پر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ علیحدہ ہو جائیں تاکہ پسماندہ ممالک کا بورژوا کسی بھی مقصد کو پورا کرنے اہل نہیں ہوتا۔ چند سال بعد جماعت کا انتشار واضح ہو جاتا ہے اور کوئی مبصر، چاہے وہ کتنا بھی سطح میں کیوں نہ ہو یہ دیکھ لیتا ہے کہ جماعت، کہ جماعت، جو آج اپنے پرانے وجود کا محض ڈھانچہ رہ گئی ہے، صرف عوام کو جمود میں مبتلا کرنے کا کام سرانجام دے رہی ہے۔ وہ جماعت جس نے جنگ کے دوران میں پوری قوت کو اپنے ساتھ ملالیا تھا، اب ٹکڑے ٹکڑے ہورہی ہے۔ دانشور جنہوں نے آزادی سے ایک دن پہلے جماعت کا ساتھ دیا تھا، اب اپنے رویے سے یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ان کی حمایت کا مقصد آزادی کے کیک سے اپنے حصے کی پھانک لینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اب جماعت ذاتی منفعتیں حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

تاہم نئی حکومت کے اندر اجارے داری اور دولت کے حصول میں عدم مساوات موجود ہوتی ہے۔ کچھ کے پاس آمدنی کے ذرائع ہوتے ہیں اور وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں موقع پرستی میں خاص مہارت حاصل ہے۔ مراعات دن ہوگنی اور رات چوگنی ہوتی جاتی ہیں، بدعنوانیاں فتح پاتی جاتی ہیں مگر اخلاق انحطاط پذیر ہوتا جاتا ہے۔ اب قومی آمدنی کے قلیل مال غنیمت پر جھپٹنے والے گدھ تعداد اور حرص میں تناسب سے بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ جماعت جواب بورژوا کے ہاتھوں میں اس کی طاقت کی آلہ کار بن

جاتی ہے، استحصال کی مشین کو تیز تر کر دیتی ہے اور لوگوں کو محصور کرنے اور انہیں جمود میں مبتلا کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ جماعت لوگوں کو دبا کر رکھنے میں حکومت کی مدد کرتی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ واضح انداز میں جمہوریت دشمن اور استبداد کی آلہ کار بن جاتی ہے۔ جماعت خارجی طور پر، اور بعض اوقات داخلی طور پر بھی، تاجر بورژوا کی شریک جرم ہوتی ہے۔ اسی طور قومی بورژوا بھی اپنی دولت سے لطف اندوز ہونے کی خاطر اپنے تعمیری منصوبوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور اسی انداز میں ادارتی احاطہ کار میں بھی وہ پارلیمانی دور سے چھلانگ لگا کر قومی سوشلزم قسم کی آمریت کا انتخاب کر لیتا ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ مہنگے داموں کی یہ فاشیت جس کی لاطینی امریکہ میں نصف صدی سے حکمرانی چلی آتی ہے۔ ان ریاستوں کا جدلیاتی نتیجہ ہے جو آزادی کے زمانے میں نیم استعماری صورت حال میں تھیں۔

ان غریب پسماندہ ملکوں میں جہاں قاعدہ یہ ہے کہ بے تحاشا دولت کے گرد، بے تحاشا غربت حلقہ بنائے ہو، وہاں فوج اور پولیس حکومت کے ستون ہوتے ہیں۔ ایسی پولیس اور فوج (ایک اور قاعدہ جو بھولنا نہیں چاہئے) جسے غیر ملکی ماہرین مشورے دیتے ہیں۔ پولیس کی قوت اور فوج کی طاقت اسی تناسب سے ہوتی ہے جس تناسب سے پوری قوم جمود کا شکار رہتی ہے۔ غیر ملکی ہر سال دیئے جانے والے قرضے کے بل مراعات چھین لیتے ہیں، بے شمار بدعنوانیاں ہوتی ہیں۔ وزراء امیر ہو جاتے ہیں۔ ان کی بیگمات بنی سنوری پھرتی ہیں۔ پارلیمنٹ کے اراکین اپنے گھر بھر لیتے ہیں، اور ایک عام پولیس کے سپاہی سے لے کر کسٹم آفیسر تک کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو بدعنوانی کے اس عظیم جلوس میں شامل نہ ہو۔

حزب مخالف اور زیادہ جارح ہو جاتی ہے اور لوگ فوراً اسکے پراپیگنڈے سے اثر قبول کرنے لگتے ہیں۔ بورژوا کے خلاف ان کی جارحیت اب صاف طور پر عیاں ہو جاتی ہے۔ یہ نوخیز بورژوا جو قبل از وقت کہن سالی میں مبتلا نظر آتا ہے، اس نصیحت پر جو اس پر برسائی جاتی ہے، ذرا کان نہیں دھرتا اور یہ بات سمجھنے کی اہلیت ہی ظاہر نہیں کرتا کہ اس کا اپنا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنے استحصال پر کوئی پردہ ڈال لے خواہ وہ کتنا باریک ہی کیوں نہ ہو۔ برازاول سے شائع ہونے والا کٹر عیسائی اخبار ''افریقی ہفت روزہ'' اپنی حکومت کے شہزادوں سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے۔

''آپ جو آج بہت اچھی حالت میں ہیں۔ آپ اور آپ کی بیگمات کو آج بہت سی آسائشیں میسر ہیں۔ اچھی تعلیم، اچھا مکان اور اچھے تعلقات۔ آپ کو بہت سے وفود میں نمائندہ بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ اور

اس طور آپ پر نئے افق طلوع ہوتے ہیں۔لیکن آپ کی دولت آپ کے گرد ایک سخت خول بن گئی ہے جو آپ کو چاروں جانب پھیلی ہوئی غربت دیکھنے نہیں دیتا۔ ذرا احتیاط سے کام لیجئے!'' افریقی ہفت روزہ کی اس تنبیہہ میں، جس کا تخاطب موسیو یولو کے گردہ کے لوگوں سے ہے، ہمیں کوئی انقلابی بات نظر نہیں آتی۔ افریقی ہفت روزہ کانگو کے عوام کو فاقہ کرانے والوں سے یہ کہتا ہے کہ خدا انہیں ان کی بداعمالیوں کی سزا دے گا۔ آگے چل کر یہ ہفت روزہ لکھتا ہے ''اگر آپ کے دلوں میں ان لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جو آپ کے ماتحت ہیں تو خدا کے گھر میں بھی آپ کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔''

یہ تو ظاہری ہے کہ قومی بورژوا ایسی فرد جرم کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ اپنے کان یورپی لے پر لگا کر، یہ بڑی شدت اور ثابت قدمی کے ساتھ صورتحال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بے پناہ منافع جو اسے عوام کے استحصال سے حاصل ہوتا ہے، غیر ملکوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ نوخیز قومی بورژوا اکثر غیر ملکی کمپنیوں سے بھی زیادہ خود اپنی قائم کی ہوئی حکومت کو مشتبہ خیال کرتا ہے۔ قومی بورژوا اپنے ہی ملک میں سرمایہ کاری سے انکار کر دیتا ہے اور یہ بات ذہن نشین کرنی چاہئے کہ وہ خود اپنے ملک کے ساتھ جو اسے پناہ دیتا ہے اور پالتا ہے، بہت ہی تعجب خیز احسان فراموشی سے پیش آتا ہے۔ وہ یورپی منڈی میں غیر ملکی حصص خریدتا ہے اور ہفتہ وار چھٹی گذارنے پیرس یا ہمبرگ جاتا ہے۔ بعض پسماندہ ممالک میں بورژوا کا رویہ ڈاکوؤں کے کسی ایسے ٹولے کی یاد دلاتا ہے جس کے اراکین ہر لوٹ کے بعد اپنے قبضے کا مال شریک کار ساتھیوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں اور نہایت چالاکی سے الگ ہو جانے کے بارے میں سوچنے میں لگ جاتے ہیں۔ بورژوا کا یہ رویہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کم و بیش جان بوجھ کر وہ ایک ایسا کھیل کھیل رہا ہے۔ جو اگر زیادہ دیر جاری رہا تو اس کی شکست پر منتج ہوگا۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت حال زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی مگر وہ اس سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ استحصال اور ملک کے لئے یہ نفرت، ناگزیر طور پر عوام کے دلوں میں بے اطمینانی کو بیدار کرتی ہے۔ ان حالات میں حکومت اور بھی سختی پر اتر آتی ہے۔ پارلیمنٹ کی عدم موجودگی میں فوج ثالث بن جاتی ہے۔ لیکن جلد یا بدیر اسے بھی اپنی قوت کا احساس ہو جائے گا اور یہ بھی موجودہ حکومت کو ایک نئے منشور کی دھمکی دے گی۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں بعض پسماندہ ممالک کے قومی بورژوا کتابوں سے کچھ نہیں سیکھتے۔ اگر انہوں

نے لاطینی امریکہ کے ممالک کے حالات کو بنظر غائر دیکھا ہوتا تو وہ بلا شبہ ان خطرات سے آگاہ جاتے جو انہیں لاحق ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ چھوٹے پیمانے کے اس بورژوا کی قسمت میں، جو اپنے آپ کو صف اول میں دھکیل دیتا ہے، صرف یہی لکھا ہے کہ وہ بیٹھا وقت گذارتا رہے اور کسی کام کو پورا نہ کرے۔ پسماندہ ممالک میں بورژوائی دور ناقابل یقین حد تک بنجر ہوتا ہے۔ پولیس کی آمریت بھی موجود ہوتی ہے اور منافع خور طبقہ بھی، لیکن ایک وسیع بورژوائی معاشرے کی تشکیل بہرصورت ناکام ہو جاتی ہے۔ یہ عریاں منافع خور جن کے حریص ہاتھ ایک غربت زدہ ملک سے بینکوں کے نوٹ جمع کرتے ہیں۔ جلد یا بدیر اس فوج کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جائیں گے۔ جسے غیر ملکی ماہرین بڑی چالاکی سے قابو میں رکھتے ہیں۔ اس طرح سابق قابض ملک اس بورژوا کی مدد سے جسے وہ سہارا دیتا ہے اور اس قومی فوج کے بل پر جسے اس کے ماہرین چلاتے ہیں۔ اپنی بالواسطہ حکومت قائم رکھتا ہے۔ فوج لوگوں کو دباتی ہے اور انہیں ساکت اور خوفزدہ رکھتی ہے۔

قومی بورژوا کے متعلق ہمارے مشاہدات سے اخذ شدہ نتائج کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہیں۔ پسماندہ ممالک میں بورژوا کے وجود اور اس کی نشوونما کی اجازت ہی نہیں ہونی چاہئے۔ بہ الفاظ دیگر ان عوام کو اپنی جماعت کی سربراہی میں، اور دانشوروں کو جو بہت باشعور اور انقلابی اصولوں سے لیس ہوتے ہیں، اپنی مشترکہ مساعی سے اس بے کار نقصان وہ متوسط طبقہ کی راہ روکنی چاہئے۔

گذشتہ پچاس برسوں میں جب کبھی بھی پسماندہ ممالک کی تاریخ زیر بحث آتی ہے، یہ سوال برابر اٹھایا جاتا ہے کہ آیا بورژوائی دور سے بچ کر نکلا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس نظریاتی سوال کا جواب منطق کے زور سے نہیں بلکہ انقلابی اقدامات کی حدود میں دیا جانا چاہئے۔ پسماندہ ممالک میں بورژوائی دور صرف اسی صورت میں اپنے آپ کو حق بجانب قرار دے سکتا ہے کہ قومی بورژوا کے پاس ایک بورژوا معاشرے کی تشکیل کے لئے کافی اقتصادی اور فنی قوت موجود ہو، وہ ایک وسیع پیمانے کی پرولتاریت کی نشوونما کے لئے ضروری حالات پیدا کر سکتا ہو، زراعت کو مشینی دور میں لا سکتا ہو اور بالآخر ایک صحیح قومی تہذیب کا وجود ممکن بنا سکتا ہو۔

اس قسم کا بورژوا جس نے یورپ میں نشوونما پائی اپنے نصب العین کو تفصیل سے پیش کرنے اور ساتھ ہی اپنی قوت کو مضبوط کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ ایسا بورژوا جو متحرک، تعلیم یافتہ اور غیر مذہبی ہوتا ہے،

سرمایہ اکٹھا کرنے میں کامیابی کے علاوہ ملک کوتھوڑی بہت خوشحالی بھی عطا کرتا ہے۔ہم نے دیکھا ہے کہ پسماندہ ممالک میں حقیقی بورژوا کا دراصل کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تو محض ایک کم ظرف اور لالچی حریص اور ندیدہ، خردہ فروش ذہنیت والا طبقہ ہوتا۔ جو استعماری قوت سے حاصل شدہ منافع کو حاصل کر کے بہت خوش ہوتا ہے۔ راتوں رات دولت مند بن جانے کی سعی کرنے والا یہ متوسط طبقہ، عظیم خیالات اورقوت اختراع کا اہل ہی نہیں ہوتا۔ اسے یورپ کی نصابی کتابوں میں پڑھا ہوا سبق تو یاد رہتا ہے لیکن وہ یورپ کو چربہ بننے کے بجائے محض اس کی بگڑی ہوئی صورت رہ جاتا ہے۔

پسماندہ ممالک کے بورژوا کے خلاف جدوجہد نظریاتی سطح کی نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف ہوتی ہے۔ اس جدوجہد کا تعلق تاریخ کے فیصلے کے مطابق بورژوا کی مذمت کرنے سے نہیں ہے۔ پسماندہ ممالک کے قومی بورژوا کی مخالفت اس لئے نہیں کرنی چاہئے کہ اس کی وجہ سے قوم کی مجموعی اور ہموار ترقی ست پڑ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس کی پوری شدت کے ساتھ محض اس لئے مخالفت کرنی چاہئے کہ وہ فی الحقیقت بالکل ناکارہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے چھچھورے پن کا اظہار اپنے منافعوں، اپنی کامیابیوں اور اپنے افکار میں کرتا ہے اور پھر ان بڑی بڑی عمارتوں میں جو نجی طور پر عزت وقار کا اظہار ہوتی ہیں، بڑی بڑی چمکیلی امریکی کاروں میں، ساحل سمندر پر تعطیلات گزارنے میں اور روشنیوں سے منور شبینہ کلبوں کی تفریح میں ہفتہ کا آخری دن گذار کر وہ اپنے چھچھورے پن کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

بورژوا جو تمام عوام کی جانب سے اپنا منہ موڑ لیتا ہے، مغرب سے شاندار مراعات کے حصول میں بھی کامیاب نہیں ہوتا۔ مثلاً ایسی سرمایہ کاری کے حصول میں جو ملک کی اقتصادیات کے لئے فائدہ مند ہو یا جس سے چند صنعتوں کا قیام عمل میں آئے اس کے برعکس اسمبلی پلانٹ نصب ہو جاتے ہیں اور ملک اس نو استعماری صنعت کاری کے لئے وقف ہو جاتا ہے جس میں ملک کی اقتصادیات ٹھوکریں کھاتی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہنا چاہئے کہ قومی بورژوا ملک کے ارتقاء کو روک دیتا ہے یا وہ وقت ضائع کرتا ہے یا یہ کہ اس سے یہ خدشہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کو تاریک راہوں کی جانب لے جائے گا درحقیقت پسماندہ ممالک کی تاریخ میں بورژوائی دور مکمل طور پر ایک بے کار دور ہوتا ہے۔ جب یہ طبقہ ختم ہو جائے گا، جب اسے اس کے اپنے تضادات نگل جائیں گے تو یہ نظر آئے گا کہ جب سے آزادی کا اعلان ہوا اس وقت سے اب تک کوئی نئی چیز واقع نہیں ہوئی اور ہر چیز کو دوبارہ ابتدا سے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ تبدیلی ان ڈھانچوں کی سطح

پر وقوع پذیر نہیں ہوگی جو بورژوا نے اپنے دور حکمرانی میں قائم کئے تھے کیونکہ اس طبقے نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ اس نے استعماری کی چھوڑی ہوئی اقتصادی وراثت، افکار اور ادارے جیسے کے تیسے اپنا لیے۔

اس بورژوا طبقے کو بے اثر کرنا بہت ہی آسان ہے، کیونکہ جیسا کہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں، یہ تعداد میں بھی، دانشور میں بھی اور اقتصادی طور پر بھی کمزور ہوتا ہے۔ استعمارہ زدہ علاقوں میں بورژوا طبقہ آزادی کے بعد اپنی قوت زیادہ تر سابقہ استعماری طاقت کے ساتھ معاہدوں سے ہی حاصل کرتا ہے۔ قومی بورژوا کے لئے تو جابر حکمرانوں سے طاقت کے حصول کے اور بھی زیادہ مواقع میسر ہوتے ہیں کیونکہ اسے سابقہ استعماری طاقت کے ساتھ راز نیاز کرنے کے لئے زیادہ پرسکون مواقع حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن گہرے تضادات بورژوا کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عام مبصر کو عدم استحکام کا تاثر ملتا ہے۔ اس طبقے میں ابھی تک یک رنگی پیدا نہیں ہو پاتی۔ مثال کے طور پر بہت سے دانشور چند لوگوں کے تسلط پر قائم حکومت کی مذمت کرتے ہیں۔ پس ماندہ ممالک میں بہت سے روشن خیال، دانشور، اور سرکاری افسر ایسے بھی ہوتے ہیں جو بڑے خلوص کے ساتھ اقتصادی منصوبوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور جو منافع خوری کو غیر قانونی ثابت کرنے اور گمراہی کی ہر کوشش کو سختی سے روکنے کے حق میں ہوتے ہیں۔ مزید آں ایسے لوگ سرکاری معاملات میں کسی حد تک عوام کی شمولیت کے متقاضی ہوتے ہیں۔

ان پسماندہ ممالک میں جو آزادی کا آغاز کرتے ہیں، تقریباً ہمیشہ ہی دیانتدار دانشوروں کی ایک چھوٹی سی تعداد موجود ہوتی ہے جو سیاست کے بارے میں تو کچھ زیادہ واضح طور پر نہیں جانتے لیکن جبلی طور پر عہدوں اور وظیفوں کی دوڑ کو جو استعمار زدہ ممالک میں آزادی کے ابتدائی دنوں کی خاصیت ہوتی ہے، شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی نجی صورت حال (بڑے بڑے کنبوں کے لئے روٹی کے حصول کی کاوش) سے یا ان کے پاس منظر (سخت جدوجہد اور کڑی اخلاقی پرورش) سے اس امر کی تشریح ہوتی ہے۔ کہ ان کے دلوں میں سازشیوں اور منافع خوروں کے لئے نمایاں نفرت کیوں ہے۔ ہمیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہئے کہ ایسے لوگوں کو اس فیصلہ کن لڑائی میں جس کا ہم عزم کئے ہوئے ہیں اور جو قوم کو زیادہ صحت مند نقطہ نظر عطا کرے گی، کس طرح استعمال کرنا ہے۔ قومی بورژوا کے لئے راہیں بند کرنا، یقیناً وہ طریق کار ہے جس کی مدد سے نئی ملنے والی آزادی کو ہر نشیب وفراز سے بچایا جا سکتا ہے۔ اسی طریق کار

سے ہی اخلاق کے تنزل، ملک میں بدعنوانیوں کے دور دورے اور اقتصادی مراجعت کو روکا جاسکتا ہے اور قوت و دبدبے پر منحصر غیر جمہوری حکومت کی فوری تباہی بروئے کار لائی جا سکتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے علاوہ ترقی کا بھی واحد طریقہ یہی ہے۔

جو چیز نوعمر قوم کے شدید جمہوری عناصر کا فیصلہ کرنے سے روکتی ہے اور ان کی بزدلی میں اضافہ کرتی ہے وہ بورژوا کی ظاہری قوت ہے۔ نو آزاد پسماندہ ممالک میں تمام تر حاکم طبقہ استعمار کے بنائے ہوئے شہروں میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ کسی ایسے تجزیئے کی عدم موجودگی جو پوری آبادی پر مشتمل ہو، دیکھنے والے پر یہ تاثر ڈال دیتی ہے کہ ملک میں ایک مضبوط اور مکمل طور پر منظّم بورژوا موجود ہے۔ درحقیقت آج ہمیں یہ معلوم ہے کہ پسماندہ ممالک میں بورژوا طبقے کا وجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ جو چیز بورژوا کو تخلیق کرتی ہے وہ نہ تو بورژوائی روح ہے، نہ اس کا ذوق، نہ اس کی عادات واطوار اور نہ ہی اس کی آرزوئیں۔ بورژوا بہر صورت محض خالص اقتصادی حالات کی براہ راست تخلیق ہوتا ہے۔

جہاں تک نو آبادیوں کا تعلق ہے اقتصادی حالات غیر ملکی بورژوا کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ استعمار زدہ شہروں میں قابض ملک کا بورژوا ہی اپنے ایجنٹوں کے روپ میں نظر آتا ہے۔ آزادی سے پہلے نو آبادیات میں مغربی بورژوا کا عمل دخل ہوتا ہے جو قابض ملک کے بورژوا کی ہی ایک اصل شاخ ہوتا ہے۔ وہ اپنا حق، اپنی قوت اور اپنا استحکام قابض ملک کے بورژوا سے حاصل کرتا ہے۔ قبل از آزادی کی کش مکش کے دور میں بعض مقامی عناصر، دانشور اور تاجر، جو درآمد شدہ بورژوا کے عین درمیان میں رہتے ہیں، خود کو اس کے مماثل گردانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقامی دانشوروں اور تاجروں میں اس بورژوا کے ساتھ جو قابض ملک کا نمائندہ ہوتا ہے، مماثلت کی ایک مستقل خواہش پائی جاتی ہے۔

مقامی بورژوا، جو کوئی حد قائم کئے بغیر بڑے خوش وخروش سے اس انداز فکر کو جو قابض ملک کی خصوصیت ہے اپنا لیتا ہے، جو حیرت انگیز طریقے سے اپنی فکر سے لاتعلق ہو جاتا ہے، اور جس نے اپنے شعور کو ان بنیادوں پر قائم کیا ہے جو خالصتاً غیر ملکی ہیں، تمام تر لالچ کے ساتھ، بالآخر ایک دن اسے یہ احساس ہو جائے گا کہ اس کے پاس ایک ایسی چیز کی کمی ہے جو بورژوا کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے، یعنی دولت۔ پسماندہ ممالک کے بورژوا کے پاس محض بورژوا روح ہوتی ہے۔ اس کے پاس نہ تو اقتصادی قوت ہوتی ہے، نہ رہنماؤں کی متحرک قوت، اور نہ خیالات کی وسعت، کہ یہی چیزیں بورژوا کی منفرد

خصوصیات کی ضمانت ہوتی ہیں۔ نتیجتاً یہ شروع شروع میں اور بہت عرصے بعد تک بھی سرکاری ملازمتوں کا ہی بورژوا رہتا ہے۔ اس نئی قومی انتظامیہ میں محض عہدہ ہی اسے قوت اور سکون دیتا ہے۔ اگر حکومت اسے کافی پیسہ اکٹھا کرنے کا بندوبست کرے گا۔ لیکن پھر بھی یہ ایک معتبر بورژوا معاشرے کو، ان تمام اقتصادی اور صنعتی نتائج کے ساتھ جو اس سے وابستہ ہوتے ہیں، جنم دینے میں ہمیشہ نااہل ثابت ہوگا۔

آغاز ہی سے قومی بورژوا درمیانے قسم کے کاموں میں اپنی کوششیں صرف کرتا ہے۔ تجارت اور چھوٹے موٹے کاروبار کی طرف اس کے میلانات اور کمیشن کے حصول کے لئے اس کی کاوشیں بورژوا کی قوت کی بنیاد ہوتی ہیں۔ اس کا کام دولت سے نہیں بلکہ کاروباری فراست سے چلتا ہے۔ وہ سرمایہ کاری نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے پاس وہ سرمایہ اکٹھا ہوسکتا ہے جو اصل بورژوا طبقہ کی پیدائش اور نشوونما کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس رفتار سے تو وہ صنعتی انقلاب کی ابتدائی صورت کو شروع کرنے میں صدیاں لے گا اور ہر صورت میں اسے سابقہ قابض ملک کی بے رحم مخالفت راستہ روکتی نظر آئے گی جس نے استعماری تجارتی روایات قائم کرنے میں تمام تر احتیاطی تدبیروں سے کام لیا تھا۔

اگر حکومت ملک کو اس کے جمود سے نکالنا اور اسے ترقی وارتقا کی راہ پر ڈالنا چاہتی ہے تو اسے سب سے پہلے ایجنٹوں کے تجارتی حلقہ کو قومی ملکیت بنانا ہوگا۔ وہ بورژوا جو دولت پیدا کرنے کے جذبے کی فتح بھی چاہتا ہے اور اشیائے صرف کی مسرت سے لطف اندوز ہونا بھی اور اس کے ساتھ ہی منافع خوری کو بدنام کرنے کے رویوں، اور عوام کے انبوہ کے خلاف نفرت کے رجحان کی فتح بھی (کیا ہم اسے ڈاکہ زنی کے نام سے موسوم نہ کریں؟) وہی درحقیقت اس تجارتی حلقے میں سرمایہ لگاتا ہے۔ ایجنسیوں کی منڈی پر جو پہلے نوآبادکاروں کے تسلط میں تھی، اب قومی بورژوا کا حملہ شروع ہوتا ہے۔ نوآبادیاتی معیشت میں ایجنٹوں کا یہ تجارتی حلقہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگر آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو پہلے چند گھنٹوں میں ہی اس حلقے کو قومی ملکیت بنانے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اسے قومی ملکیت بنانے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اسے حکومت کے سخت نظم وضبط کے تابع کر دیا جائے۔ یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایسے شہریوں کو جن کی کوئی سیاسی تعلیم نہیں ہے ان ملازمتوں پر فائز کر دیا جائے۔ جب کبھی ایسا طریق کار اپنایا گیا تو دیکھنے میں یہ آیا کہ حکومت نے درحقیقت ان سرکاری افسران کی آمریت کے لئے راستہ ہموار کر دیا ہے جو سابقہ قابض ملک کے سانچے میں ڈھلے تھے اور جنہوں نے بہت جلد بحیثیت مجموعی

قومی نقطہ نظر سے سوچنے میں اپنی نا اہلی ظاہر کی۔ ایسے سرکاری افسران نے بہت جلد قومی معیشت کی شکست وریخت شروع کردی اوراس کے پورے ڈھانچے کا جوڑ جورا لگ کر کے رکھ دیا۔ ہر قسم کی بدعنوانی، چالبازی، ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکیٹ انہیں لوگوں کے زیر سایہ پرورش پاتی ہے۔ ایجنٹوں کے تجارتی حلقے کو قومی ملکیت بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جمہوری طرز پر تھوک اور پرچون فروشی کے لئے امداد باہمی کے اداروں کی تنظیم کی جائے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ عوام الناس کو حکومت کے معاملات میں دلچسپی دلا کر ان اداروں کی مرکزیت کو ختم کیا جائے۔ آپ یہ سب کچھ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ عوام کو کچھ نہ کچھ سیاسی تعلیم نہیں دے لیتے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس بنیادی مسئلے کو ایک بار ہی ہمیشہ کے لئے حل کر لینا چاہئے۔ آج بھی یہ حقیقت ہے کہ پسماندہ ممالک میں عوام کے لئے سیاسی تعلیم کا اصول تجویز کیا جاتا ہے۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ شاید اس بنیادی کام کو کبھی دل سے نہیں چاہا گیا۔ جو لوگ عوام کو سیاسی تعلیم دینے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ ہی اس خواہش کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں کہ جو کام وہ کرنا چاہتے ہیں اس میں عوام بھی ان سے تعاون کریں۔ وہ حکومت جو عوام کو سیاسی تعلیم دینے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے، وہ اس کے ساتھ ہی ایسی حکمرانی بھی چاہتی ہے جو عوام پر عوام کے ساتھ مل کر ہو۔ اس کو ایسی زبان نہیں بولنی چاہئے جس سے بورژوا انتظامیہ پر پردہ ڈالنا مقصود ہو۔ سرمایہ دار ملکوں میں تو بورژوا حکومتیں اقتدار کے اس بچکانے مرحلے سے گزر چکی ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ وہ اب اپنے قوانین، اپنی اقتصادی قوت اور اپنی پولیس کی مدد سے حکومت کرتی ہیں۔ اب جب کہ ان کی قوت پوری طرح سے مستحکم ہو چکی ہے انہیں لفاظی میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی اغراض کے لئے حکومت کرتے ہیں اور ان کی قوت ان کی ہمت افزائی کرتے ہے۔ انہوں نے اپنا جواز خود پیدا کیا ہے اور اب وہ اپنے طور پر مضبوط ہیں۔

نو آزاد ممالک کے بورژوا طبقے میں ابھی نہ تو بے حسی ہوتی ہے اور نہ ہی مکمل سکون، جن کا انحصار ایک مدت سے مستحکم شدہ بورژوا یت کی قوت پر ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے اصلی عقائد چھپانے کے لئے ٹال مٹول کرنے کے لئے گویا مختصر الفاظ میں اپنے آپ کو ایک عوامی قوت کو طور پر ابھارنے کے لئے بے چین ہوتے ہیں۔ لیکن عوام کو سیاست میں شامل کرنے کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ سال میں تین چار مرتبہ دس ہزار یا ایک لاکھ مردوں اور عورتوں کو متحرک کر دیا جائے۔ یہ عوامی جلسے

اور شاندار اجتماع قبل آزادی کے پرانے حربوں کے مماثل ہوتے ہیں، جن کے مطابق اپنی قوت کی نمائش اس لئے ہوتی ہے کہ خود پر اور دوسروں پر یہ ثابت کر دیا جائے کہ عوام ہمارے ساتھ ہیں۔ عوام کی سیاسی تعلیم کا مقصد یہ نہیں کہ ان سے بچوں کا سا سلوک کیا جائے، اس کا مقصد تو یہ ہے کہ انہیں بالغ بنایا جائے۔

اب ہم پسماندہ ممالک میں سیاسی جماعت کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ بسا اوقات یہ سادہ لوح لوگ جو نوزائیدہ بورژوا کے طبقے سے بھی ہوتے ہیں۔ ہمہ وقت یہی دہراتے رہتے ہیں کہ پسماندہ ممالک میں نظم و نسق کے لئے مضبوط اقتدار یا بہ الفاظ دیگر آمریت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس آمریت کے پیش نظر جماعت کو لوگوں کی نگرانی کا کام سونپا جاتا ہے۔ جماعت انتظامیہ اور پولیس کی نائب بن کر عوام کی رہبری کرتی ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ عوام کو فی الواقعی قومی حکومت میں حصہ دار بنایا جائے بلکہ محض اس لئے کہ انہیں یہ مسلسل یاد دلایا جائے کہ حکومت ان سے فرماں برداری اور نظم و ضبط کی توقع رکھتی ہے۔ وہ مشہور آمریت، جس کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تاریخی عمل کی پیداوار ہے اور جسے وہ طلوع آزادی کا ایک ناگزیر ابتدائیہ خیال کرتے ہیں، درحقیقت بورژوا طبقے کے اس فیصلہ کی علامت ہے جس کے مطابق اول اول تو یہ طبقہ عوام کے تعاون سے اور پھر جلد ہی عوام کی مرضی کے خلاف حکومت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جماعت کی محکمہ اطلاعات کی شکل میں بتدریج کایا کلپ اس بات کی نشانی ہے کہ حکومت زیادہ سے زیادہ مدافعتی انداز اختیار کر رہی ہے۔ عوام کے منتشر انبوہ کو ایک اندھی طاقت سمجھا جاتا ہے جس پر مسلسل قابو رکھنا ضروری ہے، خواہ وہ گمراہ کرنے کی صورت میں ہو یا پھر پولیس سے خوفزدہ کر کے۔ جماعت ایک پیمانہ اور ایک دفتر اطلاعات کا کام سرانجام دیتی ہے۔ متشدد کارکن کو مخبر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اسے دیہاتیوں کے خلاف تعزیری مہم کا کام سونپا جاتا ہے۔ ابھرتی ہوئی مخالف جماعتوں کو مار پیٹ اور خشت باری سے خاموش کر دیا جاتا ہے۔ حزب مخالف کے امیدوار اپنے گھروں کو جلتا دیکھتے ہیں۔ پولیس اپنی اشتعال انگزیاں تیز تر کر دیتی ہے۔ ان حالات میں یہ یقینی ہے کہ جماعت کا کوئی مدمقابل نہ ہوگا۔ اور 99.9 فی صد ووٹ حکومت کے امیدوار کے حق میں ہی پڑیں گے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ افریقہ میں بعض حکومتیں فی الواقعی اس طرح برتاؤ کرتی ہیں۔ تمام مخالف جماعتوں کو جو بالعموم ترقی بھی ہوتی ہیں اور اس لئے سرکاری معاملات میں عوام کے زیادہ عمل دخل کے لئے کام کرتی ہیں، اور جن کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مغرور اور دولت کے پجاری بورژوا کے قدم اکھاڑ دیئے جائیں۔ اول اول

تو پولیس کے ڈنڈوں اور جیل خانوں کی مدد سے خاموش کر دیا جاتا ہے اور پھر ان کے وجود کو ناکارہ بنا دیا جاتا ہے۔

افریقہ کے متعدد حصوں میں جو آزاد ہیں، سیاسی جماعتوں کو بڑے خوفناک طریقوں سے پھونک دی جاتی ہے۔ جماعت کے کسی رکن کی موجودگی میں تو لوگ خاموش رہتے ہیں، بھیڑوں کے گلے کی طرح برتاؤ کرتے ہیں اور حکومت یا رہنما کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں۔ لیکن جب شام پڑتی ہے تو گاؤں سے دور سڑکوں پر قہوہ خانوں میں یا دریا کے کنارے پر، نہ صرف لوگوں کی تلخ ناامیدی اور مایوسی، بلکہ ان کا کبھی ختم نہ ہونے والا غصہ بھی سنائی دیتا ہے۔ جماعت تک خیالات کے آزادانہ بہاؤ کو ایک بنیادی مقصد بنانے کی بجائے، ایک پردہ بن کر ایسے خیالات کے لئے رکاوٹ بنتی ہے۔ جماعت کے رہنماؤں کا رویہ فوج کے سارجنٹ میجر کا سا ہوتا ہے جو اکثر لوگوں کو ''صفوں میں خاموشی'' کی ضرورت کا احساس دلواتا رہتا ہے۔ یہ سیاسی جماعت جو اپنے آپ کو عوام کا خادم کہا کرتی تھی، جو یہ دعویٰ کیا کرتی تھی کہ اس کا نصب العین ہی رائے عامہ کے مکمل اظہار کے لئے کام کرنا ہے، جوں ہی استعمار حکومت اس کے سپرد کرتا ہے، وہ لوگوں کو واپس ان کے غاروں میں بھیجنے میں بڑی پھرتی سے کام لیتی ہے۔ جہاں تک قومی اتحاد کا تعلق ہے جماعت یہاں بھی بہت سی غلطیاں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ نام نہاد قومی جماعت نسلی تفرقات پر قائم جماعت کا سا رویہ اختیار کر لیتی ہے۔ درحقیقت وہ ایک ایسا قبیلہ بن جاتی ہے جس نے اپنے آپ کو جماعت کی شکل میں ڈھال لیا ہو۔ یہ جماعت جو خود اپنی خواہش سے ہی قومی جماعت ہونے کا اعلان کرتی ہے اور جو بحیثیت مجموعی عوام کی نمائندگی کا دعویٰ بھی کرتی ہے، خفیہ طور پر، اور بعض اوقات کھلے عام بھی۔ ایک بھرپور نسلی آمریت کی تشکیل کر لیتی ہے۔ اب ہمیں بورژوا آمریت کے بجائے ایک قبائلی آمریت کا ظہور ہوتا نظر آتا ہے۔ وزراء کابینہ کے اراکین، سفیر اور مقامی حکام تک رہنما کے ہی نسلی گروہ سے، بلکہ بعض اوقات سیدھے اس کے ہی خاندان سے، چنے جاتے ہیں۔ اس قسم کی خاندانی حکومتیں خاندانی نسل کشی کے پرانے قانون کی طرف مراجعت کرتی نظر آتی ہیں، اور جب ہمیں ایسی جماعت عیاری اور ایسے ذہنی اور روحانی افلاس کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس پر غصہ نہیں بلکہ شرم آتی ہے۔ افریقہ کے حقیقی غدار حکومت کے یہی سربراہ ہیں جو اپنے ملک کو اپنے سب سے زیادہ خوفناک دشمن، یعنی حماقت کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ امر لازمی ہے کہ مرکزی، اقتدار کو قبائلیت کا رنگ دینے کی یہ کوشش علاقائیت اور علیحدگی کے

تصورات کو جنم دے گی۔ ایسی صورت میں لامرکزیت کے رجحانات پھر سے بیدار ہو کر فتحیاب ہو جاتے ہیں اور قوم ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ وہ رہنما جو کبھی ''افریقی اتحاد'' کا نعرہ لگا کر محض اپنے چھوٹے سے کنبے کو ذہن میں رکھتا تھا بالاخر ایک صبح بیدار ہو کر یہ دیکھتا ہے کہ پانچ قبیلے اس پر سوار ہیں جو اپنے اپنے وزراء اور سفرا کی تقرری چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اب بھی اپنی مستقل غیر ذمہ داری، بے خبری اور نفرت انگیزی کے سبب ان کی ''غداری'' کی ملامت کرتا ہے۔

ہم متعدد بار رہنماؤں کے مضرت رساں اثرات کی جانب توجہ منذول کرا چکے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض علاقوں میں جماعت کی تشکیل ٹولے کی طرز پر کی جاتی ہے جس میں سب سے طاقتور شخص سر براہ بن جاتا ہے۔ ایسے سر براہ کی بالا دستی اور دوسروں پر اس کے اقتدار کا ذکر اکثر آتا ہے اور لوگ ہجو ملیح کے انداز میں یہ کہنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ اس کا رعب ودبدبہ اپنے قریبی ساتھیوں پر بھی بہت ہے۔ ایسے متعدد خطرات سے بچنے کے لئے ایک مسلسل جدوجہد شروع کرنی ہوگی، ایسی جدوجہد جو جماعت کو بہ رضا اور غب رہنما کا آلہ کار بننے سے روکے۔ ''رہنما'' کا انگیریزی متبادل ''لیڈر'' انگریزی فعل ''ٹو لیڈ'' یعنی ''رہنمائی کرنا'' سے نکلا ہے، لیکن اس کا فرانسیسی ترجمہ بالعموم ''ہانکنا'' کیا جاتا ہے۔ فی زمانہ ہانکنے والوں یا عوامی بھیڑوں کے گڈریوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نہ تو عوام گلہ ہیں اور نہ ہی انہیں ہانکنے کی ضرورت ہے۔ اگر رہنما مجھے ہانکتا ہے تو میں بھی اسے یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ ہانکے جانے کے ساتھ ساتھ میں نے بھی اسے راہ بھی دکھائی ہے۔ قوم کو محض ایسی چیز نہیں بن جانا چاہئے جس پر ہمیشہ کسی ''تیس مار خان'' کی ہی حکومت ہو۔ اس طرح ہم اس دہشت کو سمجھ سکتے ہیں جو کسی رہنما کے بیمار پڑ جانے پر سرکاری حلقوں پر طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے سامنے ہمیشہ یہ سوال ہوتا ہے کہ اس کی جگہ کون لے گا۔ اگر رہنما زندہ نہ رہے تو ملک کا کیا حال ہوگا؟ حکمران طبقہ جو رہنما کے حق میں دست بردار ہو چکتا ہے، غیر ذمہ داری، غفلت، روز مرہ زندگی کی عیش وعشرت، شراب کی دعوت، حکومت کے خرچ پر سیر و سیاحت، اور مختلف منصوبوں سے حاصل شدہ منافعوں میں بنیادی طور پور مصروف رہتا ہے.... اور مختلف اوقات میں قوم کے روحانی بنجر پن کی دریافت بھی کرتا رہتا ہے۔

ایک ایسا ملک جو واقعی ان سوالات کا جواب دینا چاہتا ہے جو تاریخ پیش کرتی ہے، جو نہ صرف اپنے شہروں بلکہ اپنے شہریوں کے ذہنوں کو بھی ترقی دینا چاہتا ہے، ایسے ملک میں ایک قابل اعتماد سیاسی

جماعت کا وجود لازمی ہے۔ جماعت حکومت کی آلہ کار نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس وہ عوام کی آلہ کار ہوتی ہے۔عوام ہی کو حکومت کی حکمت عملی کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہئے۔ جماعت نہ تو ایسا سیاسی دفتر ہوتی ہے اور نہ اسے ہونا چاہئے، جہاں کے تمام کے تمام اراکین اور تمام اہم سرکاری معززین آزادانہ ایک دوسرے سے مل سکیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ بسا اوقات یہ سیاسی دفتر پوری جماعت اور اس کے اراکین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی مستقل رہائش دارالحکومت میں ہوتی ہے۔ پس ماندہ ممالک میں جماعت کے سرکردہ اراکین کو دارالحکومت سے اس طرح بچنا چاہئے گویا وہاں پلیگ پھیلا ہو۔ انہیں چند مثتنیات کے علاوہ دیہاتوں میں رہنا چاہئے۔شہر میں تمام سرگرمیون کو مرکز کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ دارالحکومت میں جہاں پہلے سے ہی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے، اور جو پہلے ہی پورے ملک کے 9/10 حصے سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ غیر ضروری اضافے کا جواز بننے کے لئے انتظامی نظم وضبط کا بہانہ کبھی قبول نہیں کرنا چاہئے۔ جماعت کی مرکزیت کو انتہائی حد تک کو انتہائی حد تک ختم کر دینا چاہئے۔ مردہ علاقوں کو زندگی بخشنے کا، یعنی ان علاقوں کو زندہ کرنے کا جن میں ابھی تک زندگی کے آثار پیدا نہیں ہوئے ہیں، یہی ایک طریقہ ہے۔

عملی طور پر ہر علاقے میں جماعت کا کم از کم ایک عہدیدار ہونا چاہئے۔ اس عہدیدار کو دانستہ طور پر اس علاقے کا سربراہ مقرر کرنا چاہئے۔ اس کے پاس کوئی انتظامی قوت بھی نہ ہونی چاہئے۔ سیاسی جماعت کے مقامی عہدیدار سے یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ وہ مقامی انتظامیہ کا سربراہ ہو۔ مقامی انتظامیہ سے اس کا تعلق خود بخود ہی نہیں ہونا چاہئے۔ جماعت عوام پر حکمران قوت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ایسی ہیئت اجتماعی ہوتی ہے جس کے ذریعے عوام اپنا اقتدار قائم کرتے ہیں۔ اور اپنی خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ اقتدار کی ثنویت اور انتشار جتنا کم ہوگا اسی قدر جماعت رہنما کردار ادا کر سکے گی اور اتنا ہی زیادہ وہ عوام کے لئے فیصلہ کن ضمانت ثابت ہوگی۔ اگر جماعت حکومت کے ساتھ خلط ملط ہوتی ہے تو جماعت کا پرزور کارکن ہونے کا مطلب یہی ہوگا کہ آپ نجی اغراض حاصل کرنے کا آسان طریقہ اختیار کر رہے ہیں، حکومت میں کوئی عہدہ چاہتے ہیں، زینہ بہ زینہ اور چڑھنا چاہتے ہیں، ترقی چاہتے ہیں یا کسی ذریعہ معاش کی تلاش میں ہیں۔

پسماندہ ممالک میں دیہی علاقوں کے لئے عمل کوش عہدیداروں کا تقرر اس صورت حال کو روک

دیتا ہے جس کے تحت شہر بہت بڑھ جاتے ہیں اور دیہی عوام کا جم غفیر شہروں کی طرف بھاگنے لگتا ہے۔ آزادی کے اولین دنوں میں مقامی اداروں کی تشکیل اور ایسے عہدیداروں کا تقرر، جنہیں اپنے علاقوں کو کو بیدار کرنے کے لئے حتی المقدور کوشش کرنے کے اختیارات ہوں، نہایت ضروری ہے۔ علاقوں کو زندگی بخشنا اور ان میں شعور کی ترقی کے عمل کو تیز تر کرنا، ایسی ضرورتیں ہیں جن سے گریز کسی ایسے ملک کے لئے ممکن نہیں جو ترقی کرنا چاہتا ہو۔ ورنہ پھر یہ ہوگا کہ حکومت کے اکابر اور جماعت کے عہدیدار رہنما کے گرد جمع ہو جائیں گے، سرکاری ملازمتوں میں بے تحاشہ اضافہ ہو جائے گا اور وہ اس لئے نہیں کہ ترقی ہو رہی ہے اور ماہرین بڑھ رہے ہیں بلکہ اس لئے کہ نئے رشتہ دار اور جماعت کے تازہ کارکن نوکریوں کی تلاش میں ہوتے رہے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ سرکاری مشین کا ایک حصہ بن جائیں۔ ہر شہری کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ دارالحکومت میں پہنچ کر اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولے۔ لوگ دیہاتی علاقوں سے بھاگنے لگتے ہیں۔ دیہاتی عوام کے انبوہ، جن کی نہ تو رہنمائی کرتی ہے اور نہ جن کے پاس تعلیم یا کوئی اور سہارا ہوتا ہے، اپنے ان کھیتوں سے جہاں مزدوروں بہت کم ملتی ہے منہ پھیر لیتے ہیں اور شہروں کی نواحی بستیوں کے بیرونی علاقوں کی جانب نکل کھڑے ہوتے ہیں، اور اس طور پر لمپن پرولتاری کی تعداد میں بے پناہ اضافے کا موجب ہوتے ہیں۔

اب ایک نئے قومی بحران کا وقت کچھ زیادہ دور نہیں ہوتا۔ ہماری رائے میں اس سے بچنے کے لئے ایک بالکل مختلف حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ ملک کے اندرونی اور عقبی حصے کے ساتھ سب سے زیادہ امتیازی سلوک کیا جانا چاہئے مزید برآں آخری حربے کے طور پر، حکومت کو دارالحکومت کو چھوڑ کر کسی اور جگہ حکومت کا مرکز بنانے میں بھی کوئی عذر نہیں ہونا چاہئے۔ دارالحکومت کی برتری کو ختم کر دینا چاہئے اور بے سہارا عوام کو یہ جتانا چاہئے کہ ہم نے ان کے لئے کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے برازیل کی حکومت نے برازیلیاں کا نیا شہر بسانے کی کوشش کی۔ ریوڈی جیزوکا بے جان شہر برادیلی عوام کے لئے ایک تہمت تھا۔ لیکن بدقسمتی سے برازیلیا بھی اسی قبیل کا ایک نیا اور دارالحکومت ثابت ہوا، اور اتنا ہی شرمناک جتنا کہ پہلا تھا۔ آج اس کوشش کا واحد فائدہ محض یہ ہے کہ ایک سڑک جنگلوں میں سے ہوتی ہوئی وہاں تک جا پہنچی ہے۔

ایسا کوئی سنجیدہ استدلال نہیں ہے جو نئے دارالحکومت کے قیام یا حکومت کو بحیثیت مجموعی سب سے

کم آباد علاقے میں منتقل کرنے کے فیصلے کے خلاف استعمال ہو سکے۔ پسماندہ ممالک کے دارالحکومت کا موجودہ تصور ایک تجارتی تصور ہے جو استعماری دور سے ورثے میں ملا ہے۔ لیکن ہم پسماندہ ممالک کے شہریوں کی دیہاتی عوام کے ساتھ رابطہ کا ہر ممکن موقع تلاش کرنا چاہئے۔ ہمیں ایک قومی حکمت عملی کی تشکیل کرنی چاہئے بہ الفاظ دیگر ایسی حکمت عملی جو عوام کے لئے ہو۔ ہمیں کبھی بھی ان عوام سے رابطہ منقطع نہیں کرنا چاہئے جنہوں نے اپنی آزادی کے لئے اور اپنے وجود کی حقیقی بہتری کے لئے جدوجہد کی ہے۔

مقامی سرکاری ملازموں کا اور ماہرین کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اعداد وشمار اور اشکال کے نیچے دب جائیں بلکہ انہیں عوام کے دل میں جگہ پیدا کرنی چاہئے۔ جب کبھی بھی اندرون ملک کے متعلق کوئی معاملہ پیش ہو تو ان کے رونگٹے کھڑے نہ ہونے چاہئیں۔ ہمین یہ بات برداشت نہ کرنی چاہئے کہ ملک کی جوان لڑکیاں اس سبب سے اپنے شوہروں کو طلاق کی دھمکی دیں کہ وہ کسی گاؤں کے عہدیدار کے طور پر اپنی تقرری کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ ان وجوہ کی بنا پر جماعت کے سیاسی مرکز کو ان فراموش کردہ علاقوں کے ساتھ بہت ہی امتیازی سلوک کرنا چاہئے اور دارالحکومت کی اس مصنوعی زندگی کو جو حقیقی قومی زندگی کے ساتھ جونک کی طرح لپٹی ہوئی ہے، پوری قوم کی بنیادی اور مقدس زندگی میں بہت کم جگہ ملنی چاہئے۔

پسماندہ ممالک میں جماعت کی تنظیم اس طرح کرنی چاہئے کہ یہ محض عوام کے ساتھ رابط قائم کرنے پر ہی قناعت نہ کرے۔ جماعت کو عوام کا براہ راست اظہار ہونا چاہئے۔ جماعت ایسی انتظامیہ نہیں ہوتی جو محض حکومت کے احکام پہنچانے کی ذمہ دار ہو۔ یہ عوام کی طاقتور نمائندہ اور ایسی محافظ ہوتی ہے جسے گمراہ نہ کیا جا سکے۔ جماعت کے اس تصور کو اپنانے کے لئے ہمیں اس رویے سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا جو بے حد مغربی، بے حد بورژوائی اور اس لئے قابل نفرت ہے کہ اس کے مطابق عوام اپنی حکومت چلانے کے نااہل ہوتے ہیں۔ فی الحقیقت تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ عوام انتہائی پیچیدہ مسائل کو بھی سمجھنے کے اہل ہوتے ہیں۔ الجزائری انقلاب نے الجزائر کے دانشوروں کے لئے جو سب سے اہم خدمات انجام دی ہیں وہ یہ ہیں کہ اس نے عوام کے ساتھ ان کا رابطہ قائم کر دیا ہے، اس نے انہیں عوام کی ناقابل بیان حد تک شدید غربت دیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عوام کی عقلی بیداری اور ان کے آگے کی جانب ترقی کرتے ہوئے شعور کا مشاہدہ کرنے کا موقع بھی دیا ہے۔ الجزائری عوام،

فاقہ زدہ ان پڑھ لوگوں کا انبوہ، وہ عورتیں اور مرد جو صدیوں سے انتہائی خوفناک تاریکی میں دھنسے ہوئے تھے، یہ لوگ نہ صرف ٹینکوں، ہوائی جہازوں، آتشی گولوں اور ''نفسیاتی اداروں'' کے خلاف، بلکہ ان سے سے بڑھ کر بدعنوانی اور ''ذہن شوئی'' کے خلاف، غداروں کے خلاف اروجنرل بے لیونی کی ''قومی'' فوج کے خلاف ثابت قدم رہے ہیں۔ یہ لوگ متذبذب اور کمزور افراد کے باوجود، مستقبل کے متوقع آمروں کے باوجود، ثابت قدم رہے ہیں۔ یہ لوگ اس لئے ثابت قدم رہے کہ ان کی ساتھ سالہ جدوجہد نے ان پر ایسے راستے کھول دیئے ہیں جن کا کبھی ان کے خوابوں میں بھی وجود نہ تھا۔ آج پہاڑیوں کے عین بیچ میں کئی گز زمین کے اندر اسلحہ سازی کے کارخانے جاری ہیں۔ آج عوامی جرگے ہر سطح پر کام کر رہے ہیں۔ اور تمام مقامی منصوبہ بندی کمیشن بڑے پیمانے کی جائیدادوں کی تقسیم کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور یوں مستقبل کے الجزائر کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی ایک فرد ہٹ دھری کی وجہ سے کسی مسئلے کو سمجھنے سے انکار کر دے لیکن ایک گردہ یا گاؤں اسے اضطرابی تیزی کے ساتھ سمجھ لیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر کوشش و کاوش سے محض وہی زبان استعمال کی جائے جسے صرف قانون یا اقتصادیات کے گریجویٹ سمجھ سکتے ہوں، تو آپ با آسانی یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کی نگرانی اوپر سے کی جانی چاہئے۔ لیکن اگر آپ روزمرہ کی عام زبان استعمال کریں۔ اور اگر آپ پر انتشار پھیلانے اور عوام سے دور رہنے کی غیر صحت مندانہ خواہش مسلط نہ ہو تو آپ کو احساس ہو جائے گا کہ عوام مفہوم کی ہر سطح اور تجارت کارہ گر سمجھنے میں بہت تیز ہیں۔ اگر آپ ماہرانہ زبان سے کام لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے عوام کو سادہ لوح سمجھ لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایسی زبان استعمال کر کے مقرر عوام کو دھوکہ دینے اور انہیں معاملات سے دور رکھنے کی خواہش پر پردہ ڈال لیتا ہے۔ مبہم زبان کا استعمال ایک ایسے مصنوعی چہرے کے مترادف ہے جس کے پیچھے زبردست لوٹ کھسوٹ کا عمل پوشیدہ ہوتا ہے، اور اس طرح عوام کی جائیداد اور عوام کا اقتدار اعلیٰ، دونوں کو بیک وقت چھین لیا جاتا ہے۔ عوام کے سامنے ہر بات کی وضاحت ہو سکتی ہے بشرطیکہ آپ انہیں واقعی سمجھانا چاہیں، لیکن اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ آپ کو ان کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس شاید وہ ان متعدد محدود ذمہ داری کی کمپنیوں کے کام میں رکاوٹ ڈالیں جن کا مقصد لوگوں کو اور بھی زیادہ غریب بنانا ہے، تو پھر مسئلہ بالکل واضح ہے۔

اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ آپ لوگوں کے عمل دخل کے بغیر ہی ملک چلا سکتے ہیں اور یہ کہ عوام محض اپنی

موجودگی سے ہی بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتے ہیں، خواہ وہ رفتار کو سست کر کے ہو یا اپنی فطری کم فہمی کے باعث رخنہ اندازی کر کے، تو پھر عوام کو دور رکھنے میں مطلق ہچکچانا نہیں چاہئے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب عوام کو ملکی انتظامات میں حصہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ رفتار کو سست نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس اس میں تیزی پیدا کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہم الجزائریوں کو اس جدوجہد کے دوران میں بہت سے مسائل سے نمٹنے کے مواقع میسر آئے ہیں۔ بعض دیہاتی علاقوں میں انقلاب کے سیاسی و فوجی رہنماؤں کو بعض ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جسے انقلابی طور پر حل کرنے کی ضرورت تھی، اب ہم کچھ ایسے واقعات کا جائزہ لیں گے۔

1956-57 کے سال میں فرانسیسی استعماریت نے بعض علاقوں کو ممنوعہ قرار دے دیا تھا اور ان علاقوں کی حدود میں لوگوں کی نقل و حرکت پر سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ لہٰذا کسان آزادانہ طور پر شہروں میں جا کر روزمرہ کے استعمال کی چیزیں نہ خرید سکتے تھے۔ اس زمانے میں کریانہ فروشوں نے بے تحاشا منافع کمایا۔ چائے کافی، تمباکو اور نمک کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ چور بازاری کھلے عام پھلی پھولی۔ وہ کسان جو روپے میں ادائیگی نہ کر سکتے تھے انہوں نے اپنی فصلیں یا بہ الفاظ دیگر اپنی زمینیں رہن رکھ دیں، یا پھر اپنے باپ دادا کی اراضی کے کھیت پر کھیت بھینٹ چڑھا دیئے اور پھر دوسرے دور میں بنیوں کے ملازم ہو گئے۔ جوں ہی سیاسی منتظموں کو اس صورت حال کے خطروں کا احساس ہوا۔ انہوں نے فوراً جوابی اقدام کیا۔ لہٰذا روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی بہم رسانی کے لئے ایک دانشمندانہ طریق کار اپنایا گیا۔ شہر میں مال خریدنے والے کریانہ فروش کو قومی تھوک فروشوں سے مال لینا پڑتا ہے اسے مال کے ساتھ اشیاء کی قیمتوں کی فہرست بھی دیتا۔ جب پرچون فروش واپس گاؤں پہنچتا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کرے اسے سیدھا سیاسی کمشنر کے پاس جانا پڑتا جو اس کی قیمتوں کی فہرست دیکھ کر اور مناسب منافع کی شرح کے بارے میں فیصلہ کر کے ہر چیز کی قیمت فروخت مقرر کر دیتا۔ تاہم پرچون فروشوں نے ایک اور ڈھنگ یہ نکالا۔ کہ وہ تین چار روز کے بعد ہی یہ اعلان کر دیتا کہ اب اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔ اس طرح وہ فی الحقیقت چور بازاری کی تجارت خفیہ طور پر جاری رکھتے۔ اس پر سیاسی اور فوجی حکام کا ردعمل خاصا شدید ہوا۔ سخت سزاؤں کے بارے میں فیصلے کئے گئے۔ جمع شدہ جرمانوں کو گاؤں کے فنڈ میں جمع کر کے رقم کو سماجی کاموں یا عام منفعت کی عوامی تعمیرات میں صرف کیا جاتا۔ بعض اوقات کچھ عرصے

کے لئے دکان بند کر دینے کا فیصلہ کیا جاتا۔ اور اگر چور بازاری کا اعادہ ہوتا تو ایسے کاروبار کو ضبط کر لیا جاتا اور اسے منتخب شدہ انتظامی کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا جو سابقہ مالک کو بھتہ کی ماہانہ رقم ادا کرتی رہتی۔

ان تجربات کو نقطہ آغاز بناتے ہوئے، ٹھوس مثالوں کے ذریعے اقتصادیات کے بنیادی قوانین کا طریقہ عمل عوام پر واضح کیا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ سرمائے کا اجتماع اب محض نظریہ نہیں رہا بلکہ یہ کردار کا ایک حقیقی اور فوری رویہ بن گیا ہے۔ اب عوام کی سمجھ میں آ گیا کہ کسی طرح اگر کوئی شخص ایک بار تجارت میں آ جائے تو وہ امیر بن سکتا ہے اور اپنے منافع اضافہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی کسانوں نے یہ قصے سنائے کہ کس طرح کریانہ فروشوں نے انہیں بے تحاشا سود پر قرضے دیئے اور پھر یہ یاد کیا کہ کس طرح وہ اپنی زمینوں سے بے دخل کئے گئے اور کس طرح وہ مالکوں سے مزدور بن گئے۔ عوام جتنا زیادہ ان باتوں کو سمجھتے جاتے ہیں۔ اتنا ہی زیادہ محتاط ہوتے جاتے ہیں اور انہیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ہر چیز کا انحصار بالاخر انہیں پر ہے، اور ان کی نجات ان کے اپنے اتحاد میں، اپنے مفادات کو پوری طرح سمجھنے اور اپنے دشمنوں کو جاننے میں ہے۔ عوام کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دولت محنت کا ثمر نہیں بلکہ منظم اور محفوظ ڈاکہ زنی کا حاصل ہوتا ہے۔ اب امراء قابل احترام لوگ نہیں رہ جاتے، وہ گوشت، خور جانوروں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے، وہ بھیڑیئے اور گدھ ہوتے ہیں جو عوام کے خون میں لت پت رہتے ہیں۔ ایک اور مقصد کے پیش نظر سیاسی منتظمین نے یہ فیصلہ کیا کہ اب سے کوئی شخص کسی اور کے لئے کام نہیں کرے گا۔ زمین ان کی ہے جو اس میں ہل چلاتے ہیں۔ یہی وہ اصول ہے جو وضاحت کی مدد سے الجزائری انقلاب کا بنیادی قانون بن گیا۔ کسان جو پہلے زرعی مزدوروں کو کام پر لگاتے تھے اب اپنے پرانے ملازموں کو زمین کا ایک حصہ دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

لہٰذا دیکھا جا سکتا ہے کہ فرانس کے متعدد حملوں، فضائی بمباریوں اور کھاد حاصل کرنے میں وقت کے باوجود فی ایکڑ پیداوار میں سہ گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کسانون نے جنہیں کٹائی کے موقع پر اس طرح سے حاصل کی گئی کھیتی کو دیکھنے اور تولنے کا موقع ملا، اب یہ جاننا چاہا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا اور انہیں بہت جلد یہ پتہ چل گیا کہ محنت کا تصور کوئی سیدھا سادا تصور نہیں ہے، غلامی محنت کی ضد ہے اور محنت کے لئے آزادی، ذمہ داری اور شعور لازم ہیں۔

ان دیہاتوں میں جہاں ہم نے ایسے دلچسپ تجربات کامیابی سے کئے ہیں، جہاں ہم نے انقلابی

کاموں کا آغاز کر کے نئے انسان کو ابھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہاں کسانوں پر یہ چیز اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ کام میں جس قدر دانشمندی دکھائی جائے گی، اسی قدر اس سے لذت ملے گی، ہم عوام کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوئے کہ کام محض توانائی صرف کرنے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی محض رگ پٹھوں کے استعمال کا، اور یہ کہ محض رگ پٹھوں کو استعمال کرنے اور پسینہ بہانے کے بجائے اگر ذہن اور دل کو بھی کام میں لایا جائے تو ہر کام زیادہ بہتر طور پر سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان آزاد دیہاتوں میں جو پرانے تجارتی راستوں پر نہیں پڑتے، ہمیں اس پیداوار میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے جو پہلے محض شہروں اور برآمدت کے ممنون تھے۔ ہم نے پیداوار کی تنظیم عوام اور قومی فوج آزادی کی صارفانہ ضروریات پوری کرنے کے لئے کی ہے۔ ہم نے مسور کی پیداوار چار گنا کر دی ہے اور تارکول بنانے کا کام بھی منظّم کر لیا ہے۔ تازہ سبزیاں اور تارکول پہاڑوں کے راستے سے شمال سے جنوب کے بھیجے جاتے ہیں، جب کہ جنوبی علاقے شمال کو گوشت بھیجتے ہیں۔ اس تعاون کا فیصلہ قومی محاذ آزادی نے کیا تھا اور سی نے مواصلات کا سلسلہ بھی قائم کیا۔ ہمارے پاس نہ تو عظیم مغربی یونیورسٹیوں کے ماہرین اور نہ ہی منصوبہ کار۔ لیکن ان آزاد ہونے والے علاقے میں روزانہ راشن اب تک کبھی نہ سنے جانے والے 3200 کلوری کے عدد تک پہنچ گیا۔ لوگوں نے اس آزمائش میں اپنی فتح پر قناعت نہ کی۔ اب انہوں نے اپنے آپ سے نظریاتی سوال پوچھنے شروع کر دیئے۔ مثال کے طور پر ملک کے بعض علاقوں نے جنگ آزادی سے پہلے کبھی سنگترے کی شکل کیوں نہ دیکھی تھی جب کہ ہر سال ہزار ہا ٹن سنترہ برآمد کا ی جاتا تھا! بیشتر الجزائری انگور کے نام سے ہی بے خبر کیوں تھے جب کہ لاکھوں یورپی ان سے لطف اندوز ہوتے تھے؟ آج لوگوں پر اس چیز کا تصور بالکل واضح ہے کہ ان کے پاس کیا ہے۔ آج الجزائری عوام جانتے ہیں کہ وہ اپنے ملک سرزمین اور معدنی دولت کے واحد مالک ہیں۔ اگر آج کچھ افراد کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ قومی محاذ آزادی نے حقوق ملکیت پر کسی غصبیت کو برداشت کرنے سے کھلا انکار کیوں کر دیا ہے اور انہیں یہ پتا نہیں چلتا کہ اس نے اصولوں کو نظر انداز کرنے کی شدت سے مخالفت کیوں کی ہے، تو انہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ الجزائری عوام آج بالغ، ذمہ دار اور اپنے فرائض سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ مختصراً یہ کہ الجزائری عوام آج اپنی جائیداد کے خود مالک ہیں۔

ہم نے اپنے موضوع کی وضاحت کے لئے اگر الجزائر کی مثال لی ہے تو اس سے ہمارا مقصد اپنے

لوگوں کی مدح سرائی نہیں ہے، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ان کے شعور ذات کو بیدار کرنے میں جنگ نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے ممالک کے عوام بھی مختلف طریقوں سے اسی قسم کے نتائج پر پہنچے ہیں۔ آج ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ الجزائر میں قوت بازو کی آزمائش ناگزیر تھی۔ لیکن دیگر ممالک بھی سیاسی سرگرمیوں اور کسی سیاسی جماعت کے توضیحی وتشریحی کاموں کی مدد سے اپنے عوام کو اسی منزل پر لے آئے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ الجزائر کے عوام اپنے مسائل سے عہدہ برآمد ہونے کے اہل ہیں۔ تجربے سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ پس ماندہ ممالک میں اس بات کی اہمیت نہیں ہے کہ تین سو افراد ایک منصوبے پر متفق ہو کر اسے کامیاب بنانے کا تہیہ کرلیں۔ اہم بات یہ ہے کہ تمام کے عوام ایک ہی منصوبے پر اتفاق کریں چاہے انہیں اس پر دوگنا بلکہ تین گنا وقت بھی کیوں نہ صرف کرنا پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کی جو وضاحت کرنے میں صرف ہوتا ہے اور جو مزدوروں سے انسانوں والا برتاؤ کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے، اس کی کسر منصوبے کی تعمیل کے دوران نکل جاتی ہے۔ لوگوں کو یہ ضرور معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کیوں اور کس طرف جارہے ہیں۔ سیاست دان کو یہ حقیقت کبھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ جب تک لوگوں کا شعور غیر مکمل، متبدیانہ اور دھندلا ہے اس وقت تک مستقبل غیر یقینی رہتا ہے۔ ہم افریقی سیاست دانوں کو اپنے عوام کی صورت حال کا بہت واضح تصور ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تصورات کی یہ وضاحت مکمل طور پر جدلیاتی ہونی چاہئے۔ عوام اچانک ایک دم ہی بیدار نہ ہوں گے۔ قومی تعمیر میں عوام کا کام ایک دم ہی ہر سمت پر محیط نہیں ہوگا۔ اول اس لئے کہ آمد ورفت ومواصلات کے ذرائع نے حال ہی میں ترقی کرنی شروع کی ہے۔ دوئم اس لئے کہ اب وقت کا پیمانہ محض موجودہ لمحے یا اگلی فصل تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اب وہ باقی تمام دنیا کا پیمانہ ہوگا۔ پھر اس لئے بھی کہ استعماری دور نے عوام کے ذہن میں مایوسی کی جو جڑیں بہت گہری دبادی تھیں۔ وہ ابھی تک تہہ میں ہی موجود ہیں۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ ان کمزوریوں پر، جو ایک ملک پر کسی دوسرے ملک کے مادی اور روحانی قبضے کی میراث ہوتی ہیں، فتح پانا ایک ایسی ضرورت ہے جسے کوئی حکومت بھی نظر انداز نہیں کرسکتی۔ آیئے ہم استعماری حکومت کے زیر اثر ہونے والے کام کا جائزہ لیں۔ نوآبادکار ہمیشہ یہ شکایت کرتا رہا کہ مقامی باشندے کاہل ہوتے ہیں۔ بعض ایسے ملکوں میں جو آزاد ہوچکے ہیں حکمران طبقہ آج بھی یہی شکایت کرتا نظر آتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ نوآبادکار چاہتا تھا۔ کہ مقامی باشندہ جوش وخروش کا مظارہ کرے۔ ایک قسم کی

گمراہی پھیلا کر جو حقیقت کو نظروں سے اوجھل کر دینے کا ایک نہایت لطیف پیرایہ ہوتا ہے، نو آبادکار نے غلام کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ زمین جس پر وہ کام کرتا ہے اس کی اپنی ہے اور جن کانوں میں اس نے اپنی صحت برباد کی ہے ان کا مالک بھی وہ خود ہے۔ نو آبادکار نے عجیب وغریب طور پر بات بھلا دی تھی کہ وہ غلاموں کی جان سے کھیل کر امیر بن رہا ہے۔ درحقیقت نو آبادکار مقامی باشندوں کو یہ کہہ رہا تھا کہ ''اپنے آپ کو مار لو تا کہ میں امیر بن سکوں۔'' آج ہمیں ایک مختلف رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہمیں عوام سے یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ''اپنے آپ کو مار لو تا کہ ملک مالدار ہو سکے۔'' اگر ہم قومی آمدنی بڑھانا چاہتے ہیں اور ایسی چیزوں کو درآمد کم کرنا چاہتے ہیں جو نہ صرف بے فائدہ بلکہ نقصان دہ بھی ہیں اور اگر ہم زراعتی پیداوار زیادہ اور جہالت کم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس امر کی وضاحت کرنا ہوگی کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو یہ ضرور معلوم ہونا چاہئے کہ کیا شئے ہے جو داؤں پر لگی ہوئی ہے۔ ملکی تجارت کو عوامی تجارت ہونا چاہئے۔ لہٰذا نچلی سطح پر ایسے مراکز تشکیل کرنے کی ضرورت ہوگی جنہیں مکمل معلومات ہوں۔ اکثر و بیشتر ہم قومی تنظیمیں بلند سطح پر اور ہمیشہ دارالحکومت کے اندر ہی قائم کرنے پر قناعت کرتے ہیں مثلاً اتحاد خواتین، مجلس جوانان قوم اور مزدور اتحاد کی انجمن وغیرہ۔ اگر آپ اس امر کی تحقیق کرنے کی تکلیف گوارہ کریں کہ دارالحکومت میں دفاتر کے پیچھے کیا ہے اور اگر آپ ان اندرونی کمروں میں جائیں جہاں رپورٹوں کو ہونا چاہئے تو آپ خالی کمرے، خالی صفحات اور خالی خولی ڈھونگ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ ہر کام کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہونی چاہئے۔ ایسے جلسے ہونے چاہئیں جو مواد اور زندگی مہیا کرتے رہیں۔ عوام کو اکٹھے ہونے، بحث ومباحثہ کرنے، تجاویز پیش کرنے اور ہدایات حاصل کرنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ شہریوں کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ بولیں، اظہار رائے کریں اور نئے نئے خیالات پیش کریں۔ مختلف شاخوں اور کمیٹیوں کے اجلاس کو مذہبی اجتماعی کی حیثیت حاصل ہونی چاہئے۔ یہ انسان کو بولنے اور سننے کے بہتر مواقع عطا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ہر اجلاس میں ذہن اپنی شمولیت کے لئے برتر استعداد حاصل کرتا ہے اور آنکھیں انسانی وقار کی مطابقت سے نئے نئے مناظر دریافت کر لیتی ہیں۔

پس ماندہ ممالک میں نوجوانوں کی اکثریت حکومت کے لئے مخصوص مسائل پیدا کرتی ہے جنہیں پوری وضاحت سے حل کرنا ضروری ہے۔ شہروں کے نوجوان جو بے کار اور اکثر ان پڑھ ہوتے ہیں، مختلف قسم کے تخریبی اثرات کے شکار ہو جاتے ہیں۔ پس ماندہ ممالک کے نوجوانوں کو ہی صنعتی ممالک

سب سے زیادہ تفریح مہیا کرتے ہیں عام حالات میں کسی خاص معاشرے کی ذہنی اور مادی سطح میں اوران تفریحات میں جو وہ معاشرہ اپنے لئے تخلیق کرتا ہے ایک خاص قسم کی یکسانیت ہوتی ہے۔ لیکن پس ماندہ ممالک میں نوجوانوں کے پاس اپنا فالتو وقت گزارنے کے لئے ایسے مشاغل ہوتے ہیں جو سرمایہ دار ملکوں کے نوجوانوں کے لئے بنے ہیں، مثلاً جاسوسی ناول، لاٹری، جنسی تصویریں، فحش ادب، جو سولہ سال سے کم عمر والوں کے لئے ممنوع ہوتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر شراب۔ مغرب میں گھریلو ماحول، تعلیم کے اثرات اور مزدور طبقے کا نسبتاً بلند معیار زندگی یہ سب چیزیں ان مشاغل کے نقصان دہ اثرات کے خلاف کسی حد تک ایک مضبوط دفاع ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن افریقی ملکوں میں جہاں ذہنی نشوونما ناہموار ہے، جہاں دو دنیاؤں کے خوفناک تصادم نے پرانی روایات کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے اور ادراک کی کائنات کا احاطہ نگاہ سے باہر پھینک دیا ہے، نوجوان افریقیوں کی اثر پذیری اور طرز احساس ان متعدد حملوں کے رحم وکرم پر ہے جو مخصوص نوع کی مغربی تہذیب ان پر کر رہی ہے۔ افریقہ میں گھریلو ماحول اکثر وہ استحکام اور وہ یکسانیت پیش نہیں کر سکتا جو ایسے حملوں کو برداشت کر سکے۔

اس سلسلے میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ تطہیر کرنے اور استحکام بخشنے کا کام سرانجام دے۔ لیکن پس ماندہ ممالک کے نوجوانوں کے قائدین کے کردار کے مماثل سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ روح کو مضبوط کرنے، جسم کو توانا کرنے اور کھلاڑی کی سی صلاحیتیں پیدا کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں ان کو ان تصورات سے بچ کر رہنا چاہئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پس ماندہ ممالک کے نوجوان بیکار ہوتے ہیں جن کے لئے کام مہیا کرنا ضروری ہے، لہٰذا نوجوانوں کے قائد کو عملی مقاصد کی خاطر وزارت محنت سے منسلک ہونا چاہئے۔ پس ماندہ ممالک کی ایک بنیادی ضرورت محنت ہے۔ یہ وزارت منصوبہ بندی کی وزارت کے تعاون کے ساتھ، جو ایسے ممالک کی، ایک اور اہم ضرورت ہے، کام کرتی ہے۔ افریقہ کے نوجوانوں کو سٹیڈیم میں نہیں بلکہ کھیتوں میں اور اسکولوں میں بھیجنا چاہئے۔ شہر کے درمیان نمائشی سٹیڈیم کی تعمیر کے بجائے نوجوانوں کو کھیتوں کے درمیان ایک قطعہ زمین دیا جانا چاہئے جس کی وہ نشوونما کریں، زیر کاشت لائیں اور اسے قوم کے حوالے کر دیں۔ کھیلوں کا سرمایہ دارانہ تصور اس تصور سے بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ جو پس ماندہ ممالک میں ہونا چاہئے۔ افریقی سیاست دانوں کو محض کھلاڑی پیدا کرنے میں مشغول نہیں رہنا چاہئے، بلکہ مکمل طور پر ایسے باشعور انسان پیدا کرنے چاہئیں جو کھیل بھی سکتے ہوں۔

اگر کھیلوں کو قومی زندگی سے بہ الفاظ دیگر قومی تعمیر سے ہم آہنگ نہیں کیا جاتا اور اگر آپ محض کھلاڑی پیدا کرتے رہتے ہیں اور باشعور انسان پیدا نہیں کرتے تو آپ جلد ہی یہ دیکھیں گے کہ کھیلیں ایک قسم کا پیشہ اور تجارت بن کر تباہ ہو رہی ہیں۔ کھیلوں کو شہری بورژوا کی وقت گذاری یا تفریح کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارے لئے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہم یہ لمحے یہ سمجھ سکیں کہ ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں نہ تو غیر معمولی لوگ پیدا کرنے ہیں اور نہ ہی ہیرو بنانے ہیں جو رہنما کی ایک اور قسم ہوتے ہیں۔ ہمیں عوام کی سطح بلند کرنی چاہئے، ان کے ذہن کی نشو ونما کرنی چاہئے، انہیں نئے خیالات دینے چاہئیں اور انہیں انسانوں میں تبدیل کرنا چاہئے۔

ہمیں تو بس ایک ہی خیال ستاتا رہتا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ باقی تمام افریقی سیاستدانوں کو بھی یہی خیال ستائے کہ آج مکمل معلومات کی اور ایسے کام کی اشد ضرورت ہے، جو شعور کی روشنی میں کیا جائے اور جو ہمارے تاریخی ذہنی دھندلکوں سے آزاد ہو۔ کسی پس ماندہ ملک میں ذمہ دار عہدہ سنبھالنے کا مطلب یہ جاننا ہے کہ بالآخر ہر چیز کا انحصار عوام کی تعلیم پر ہے، ذہنی فکر کی سطح بلند کرنے پر ہے اور اس بات پر ہے جسے ہم فوری طور ''سیاسی تعلیم'' کا نام دیتے ہیں۔

دراصل ہم ایک مجرمانہ سطحیت سے کام لیتے ہوئے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ عوام کو سیاسی طور پر تعلیم یافتہ کرنے کا مطلب محض یہ ہے کہ انہیں وقتاً فوقتاً ایک طویل پر جوش تقریر سنا دی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر رہنما یا اس کا کوئی نائب شاندار لہجے میں انہیں روز کے خاص واقعات سنا دے تو وہ عوام کو سیاسی تعلیم دینے کے عظیم فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ سیاسی تعلیم کا مطلب عوام کے ذہن کو کھولنا، انہیں بیدار کرنا اور ان میں شعور کو پیدا کرنا ہے، بہ الفاظ دیگر جیسا کہ سیزرے نے کہا کہ یہ کام ''روحوں کو ایجاد کرنے'' کے مترادف ہے۔ عوام کی سیاسی تعلیم کا مطلب نہ تو سیاسی تقریر ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ بے جگری اور جوش کے ساتھ عوام کو یہ سکھایا جائے کہ ہر بات کا انحصار انہیں پر ہے، اگر ہم جامد ہیں تو ان کے باعث اور اگر ہم آگے بڑھ رہے ہیں تو انہیں کے سبب... تقدیر کا کوئی وجود نہیں اور ایسا کوئی بڑا آدمی نہیں جو ہر چیز کا بار اپنے سر لے لے۔ تقدیر لوگ خود ہیں اور اگر کہیں کوئی طلسمی ہاتھ ہے تو وہ عوام کا اپنا ہاتھ ہے۔ ہم یہ مکرر کہتے ہیں کہ ان سب باتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے، لوگوں کو صحیح معنی میں زندہ انسان بنانے کے لئے انتہا سے زیادہ عدم مرکزیت ہونی چاہئے۔ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر

کی طرف حرکت ایک معین اصول ہونا چاہئے، محض رسمی طور پر نہیں بلکہ صحیح معنوں میں اس اصول کا احترام ہی نجات کا ضامن ہوسکتا ہے۔ نیچے سے ہی طاقت اوپر جاتی ہے اور چوٹی کو وہ حرکی قوت ملتی ہے جس کے باعث جدلیاتی طور پر یہ ممکن ہو پاتا ہے کہ وہ آگے کی جانب لپکے۔ ہم الجزائری ایک بار پھر ان حقائق کو سمجھنے میں تیز نکلے کیونکہ کسی بھی تسلیم شدہ ریاست کی سربراہ حکومت کے کسی رکن کو نجات کا ایسا کام سرانجام دینے کا موقع کبھی میسر نہیں آیا۔ الجزائر میں یہ عوام الناس ہی ہیں جو لڑ رہے ہیں اور عوام الناس یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی روز مرہ کی جدوجہد کے بغیر جو سخت بھی ہے اور دلیرانہ بھی، چوٹی کے رہنما شکست کھا جائیں گے اور اس طرح وہ جو نیچے میں یہ جانتے ہیں کہ سربراہی اور رہنمائی کے بغیر عوام الناس غیر متحد اور منتشر ہو جائیں گے۔ چوٹی کے رہنماؤں کو اپنی قدر اور اپنی قوت صرف لڑنے والے لوگوں کے وجود سے حاصل ہوتی ہے۔ حقیقی معنوں میں یہ عوام ہی ہیں جو آزادانہ طور پر اپنے سربراہ تخلیق کرتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا ہے کہ سربراہ عوام کا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔

عوام کو معلوم ہونا چاہئے کہ حکومت اور جماعت ان کی خدمت کے لئے ہیں۔ مستحق عوام، بہ الفاظ دیگر ایسے عوام جو اپنے وقار سے باخبر ہوں، وہ ہوتے ہیں جو یہ حقائق کبھی نہیں بھولتے۔ استعماری قبضے کے دوران میں لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ انہیں اپنی جانیں اس لئے قربان کرنی چاہئیں کہ ان کا وقار قائم رہ سکے۔ لیکن افریقی عوام کو جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے وقار کو محض قابض قوت سے ہی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ افریقی عوام جلد ہی سمجھ لیا کہ وقار اور اقتدار اعلیٰ ایک دوسرے کے مترادف ہیں اور حقیقت میں وقار سے رہنے والے آزاد لوگ اقتدار اعلیٰ کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ افریقی عوام ذہنی طور پر ناپختہ یا کمزور ہیں بے معنی بات ہے۔ حکومت یا جماعت کو وہ لوگ مل جاتے ہیں جن کی وہ مستحق ہو، اور لوگوں کو بھی جلد یا بہ دیر اپنے استحقاق کے مطابق حکومت مل جاتی ہے۔

بعض علاقوں میں عملی تجربات اس نقطہ نظر کی تصدیق کرتے ہیں۔ بعض اوقات جلسوں میں ایسا ہوتا ہے کہ پرجوش کارکن عمومی اور غیر استدلالی کلیے استعمال کرتے ہیں۔ اختصار کی یہ نوعیت، جس میں بے ساختگی کو اور اختلافات کو بے جا سہل پسندی سے ختم کرنے کی کوشش، دونوں خطرناک طور پر مل جاتے ہیں اور بالآخر دانشورانہ وضاحتوں کی شکست کا باعث ہوتے ہیں، بالعموم فتحیاب ہو جاتی ہے۔ جب ہمیں کسی پرجوش کارکن میں ذمہ داریوں سے یہ فرار دکھائی دے تو اسے محض یہ کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ تم غلطی پر

ہو۔ہمیں اسے ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار کرنا ہوگا اور اس بات میں اس کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی کہ وہ اپنا سلسلہ استدلال جاری رکھے گا تا کہ اس قسم کی بے جا سہل پسندی کی اصل نوعیت اس پر ظاہر ہو سکے جو بعض اوقات نہایت نفرت انگیز، انسانی اور بالاخر بے ثمر ثابت ہوتی ہے۔

کوئی شخص بھی خواہ وہ رہنما ہو یا کارکن حقیقت کو چھپا نہیں سکتا۔ مقامی رجحانات میں حقیقت کی تلاش اجتماعی مسئلہ ہوتی ہے۔بعض لوگ تجربے سے مالا مال اور اپنے خیالات کی وضاحت میں تیز ہوتے ہیں اور ماضی میں زیادہ ذہنی رابطے قائم کر چکے ہوتے ہیں۔اس کے باوجود انہیں عوام کو نظر انداز کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہر فیصلے کی کامیابی کا انحصار تمام عوام کی مشترکہ اور شعوری کوشش پر ہوتا ہے۔ اس صورت حال سے کوئی بھی صاف بچ کر نہیں نکل سکتا۔ ہر شخص کو یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا یا اذیت دی جائے گی اور آزاد قوم کے پورے ڈھانچے میں ہر شخص بھوکا رہے گا اور ہر شخص قیمتوں کے گرنے سے مصیبت میں مبتلا ہوگا۔ اجتماعی جدوجہد کے لئے نچلی سطح پر اجتماعی ذمہ داری اور بالائی سطح پر مجلس نمائندگان کی ذمہ داری ہوگی۔ بلاشبہ اجتماعی فلاح و بہبود کی جنگ میں ہر شخص کو شامل کرنا ہوگا۔ کسی شخص کا ہاتھ مکمل طور پر صاف نہیں ہوتا۔ اس صورت حال میں نہ تو کوئی معصوم ہوتا ہے اور نہ تماشائی۔ ہم سب کے ہاتھ آلودہ ہوتے ہیں۔ ہم سب انہیں اپنے ملک کی دلدلوں اور اپنی خوفناک خالی الذہنی میں آلودہ کرتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہر تماشائی یا تو بزدل ہوتا ہے یا غدار۔

تحریک کے سربراہوں کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے پیچھے چلائیں۔ فرمانبرداری کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنے نصب العین کی تفہیم اور اس کا مکمل شعور ہو۔ مختصراً یہ کہ ایک دانشمندانہ حیثیت خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی کیوں نہ ہو لازمی ہے۔ ہمیں عوام کو سحر زدہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی انہیں جذبات میں یا الجھنوں میں مبتلا کرنا چاہئے۔ صرف وہ پس ماندہ ممالک ہی، جن کی سربراہی عوام سے جنم لینے والی انقلابی شخصیات کر رہی ہیں، عوام کو منظر تاریخ پر آنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم ایک بار پھر یہی کہیں گے کہ قومی بورژوا اور امتیازی طبقے کی نمود کی پوری قوت اور شدت سے مخالف بے حد ضروری ہے۔ لوگوں کو سیاسی تعلیم دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شہری کے سامنے قوم کی کلی حیثیت کو حقیقت کے طور پر واضح کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ پوری قومی تاریخ کو ہر شہری کے ذاتی تجربے کا حصہ بنایا جائے۔ افریقی مصنفوں کی دوسری کانگرس کا نام اپنے پیغام میں صدر سیکوطورے نے بجا طور پر یہ کہا کہ:۔

''خیالات کی دنیا میں انسان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ دنیا کا ذہن ہے، مگر حقیقی دنیا میں، جہاں ہر فعل روحانی اور مادی وجود پر اثر انداز ہوتا ہے، ہمیشہ دنیا ہی نوع انسانی کا ذہن ہوتی ہے، کیونکہ اسی سطح پر آپ کو فکری اکائیوں کا اور قوتوں کا حاصل جمع نظر آئے گا اور ترقی واصلاح کی حرکی قوتیں نظر آئیں گی اور یہیں توانائیاں مجتمع اور انسان کی ذہنی اقدار اکٹھا ہوتی ہیں۔''

چونکہ انفرادی تجربہ قومی تجربہ ہوتا ہے اور چونکہ یہ قومی وجود کی زنجیر کی کڑی ہوتا ہے، اس لئے انفرادی، محدود وسمٹا ہوا نہیں رہتا اور قومی اور بالآخر آفاقی حقیقت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس طرح مسلح جدوجہد کے دور میں ہر لڑنے والے نے قوم کی تقدیر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی، اسی طور پر قومی تعمیر کے دور میں بھی ہر شہری کو اپنی حقیقی روزمرہ زندگی میں پوری قوم کے ساتھ منسلک ہو جانا چاہئے تا کہ وہ قوم کی مسلسل جدلیاتی حقیقت کو متشکل کر سکے اور انسانی عزم کو پوری تکمیل کے ساتھ اس دنیا میں کامیاب بنا سکے۔ اگر کسی پل کی تعمیر اس کے بنانے والوں کی آگہی کو فروغ نہیں دے سکتی تو پھر اس پل کی تعمیر نہیں کرنی چاہئے اور شہریوں کو تیر کر یا کشتیوں کے ذریعے ہی دریا پار کرتے رہنا چاہئے۔ پل کو آسمان پر سے نہیں ''ٹپکنا'' چاہئے۔ اسے سماجی منظر پر الوہی قوتوں کے ذریعے رونما نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کے برعکس اس کو شہریوں کے قوت بازو اور ذہن سے جنم لینا چاہئے، اس کام میں یقیناً انجینیئروں اور ماہرین تعمیرات کی، لیکن مقامی جماعتی رہنماؤں کو وہاں ہمہ وقت موجود رہنا چاہئے تا کہ عام لوگوں کا ذہنی بنجر پن نئے نئے طریق کار سے روشناس ہو سکے اور اس لئے بھی کہ پل کی تعمیر کا کلیتاً اور بہ اعتبار اجزا سمجھا جا سکے اور شہری اس کی ذمہ داری قبول کر سکیں۔ اسی طور اور محض اسی طور پر ہر کام ممکن ہو سکتا ہے۔

حکومت کو جو اپنے آپ کو قومی حکومت کہتی ہے، قوم کی بحیثیت کل ذمہ داری قبول کرنی چاہئے اور چونکہ پس ماندہ ملک میں نوجوان ایک انتہائی اہم حلقے کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لئے نوجوانوں کے شعور کی سطح ضرور بلند کی جانی چاہئے کہ انہیں روشنی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قوم کے نوجوانوں میں وضاحت کا کام کیا جائے اور اگر نوجوانوں کے قومی اتحاد کی انجمن انہیں قوم کے ساتھ مربوط کرنے کا کام سرانجام دے تو ان غلطیوں سے بچا جا سکتا ہے جنہوں نے لاطینی امریکہ کی جمہوریتوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا یا یوں کہئے کہ تباہ کر دیا ہے۔ فوج ہمیشہ ایک جنگی مدرسہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر یہ سماجی اور سیاسی تعلیم گاہ ہوتی ہے۔ ایک بالغ قوم کا مجاہد محض کرائے کا سپاہی نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا شہری ہوتا ہے جو ہتھیاروں کی

مدد سے قوم کا دفاع کرتا ہے۔ اسی باعث بنیادی اہمیت کی بات یہ ہے کہ ہر سپاہی کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ قوم کی خدمت کر رہا ہے نہ کہ اپنے اپنے کمانڈار کی، خواہ اس افسر کا وقار کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ ہمیں قومی شعور کی سطح بلند کرنے، قبائلیت کو ختم اور قوم کو متحد کرنے کے لئے قومی فوج اور شہری حکام سے یکساں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ پس ماندہ ممالک میں مردوں اور عورتوں کو بیدار کرنے کے لئے ہر کوشش بروئے کار لانی چاہئے۔ جاگیردارانہ روایت کو قائم رکھنے کے خلاف بھی مدافعت ضروری ہے جس کے تحت عورت پر مرد کی برتری ثابت ہوتی ہے۔ عورت کو بھی وہی مرتبہ ملنا چاہئے جو مرد کو حاصل ہے اور یہ مرتبہ محض آئین کی دفعات میں نہیں ملنا چاہئے بلکہ روزمرہ زندگی میں، کارخانوں میں، مدرسوں میں اور پارلیمنٹ میں بھی ملنا چاہئے۔ اگر مغربی ممالک میں مردوں کو فوجی بیرکوں میں بند کیا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سب سے عمدہ طریق کار ہے۔ بھرتی ہونے والوں کے لئے ضروری نہیں کہ انہیں فوجی ہی بنایا جائے۔ قومی ملازمت فوجی بھی ہوسکتی ہے اور شہری بھی، اور بہرصورت بہتر یہ ہے کہ ہر اہل شہری کسی لمحے بھی قومی یا سماجی آزادی کی حفاظت کے لئے لڑنے والے دستوں میں اپنی جگہ لے سکتا ہو۔

یہ ممکن ہونا چاہئے کہ عوامی بھلائی کے لئے وسیع پیمانے کے کسی بھی کام میں بھرتی شدہ آدمیوں کو استعمال کیا جا سکے۔ اندرونی علاقوں کو متحرک کرنے اور شہریوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے ملک کی ضرورت سے آگاہ کرنے کا یہ ایک شاندار طریقہ ہے۔ اس امر کی احتیاط رکھنی چاہئے کہ فوج ایک خودمختار جماعت نہ بن جائے اور اپنے آپ کو بے کار اور بغیر کسی خاص نصب العین کے پا کر سیاست میں ہاتھ پیر نہ مارنے لگے اور حکومت کے لئے خطرہ نہ بن جائے۔ دیوان خانوں کی زینت بننے والے فوجی جرنیل، حکومت کے مختلف شعبوں میں گھوم پھر کر بالآخر اپنا منشور پیش کرنے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اس خطرے سے بچنے کا واحد طریقہ فوج کو سیاسی تعلیم دینا یا بہ الفاظ دیگر اسے قومی ملکیت بنانا ہے۔ اسی طرح سے ایک اور ضروری کام فوجی رضا کاروں میں اضافہ ہے۔ جنگ کی صورت میں پوری کی پوری قوم لڑتی اور جدوجہد کرتی ہے۔ اس میں پیشہ ور فوجیوں کو شامل نہیں کرنا چاہئے اور مستقل فوجی افسروں کی تعداد بھی کم سے کم ہونی چاہئے۔ اول تو یہ اس لئے کہ افسران کا انتخاب اکثر یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ طبقے سے کیا جاتا ہے، وہ طبقہ جو کہ کسی اور جگہ کہیں زیادہ کارآمد ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر انجینئر فوجی افسر ہونے سے ہزار گنا زیادہ ملکی خدمات کے لئے اہم ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ طبقاتی امتیاز کے رجحانات سے دور رہنا

ضروری ہے۔ ہم گذشتہ صفحات میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح قوم پرستی کا شاندار نغمہ جس نے لوگوں کو اپنے جابر حکمرانوں کے خلاف صف آرا کر دیا تھا، اعلان آزادی کے دن ہی رکتا ہے، ٹوٹتا ہے اور بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔ قوم پرسی بذاتہی نہ تو سیاسی منشور ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی منصوبہ۔ اگر آپ واقعی اپنے ملک کو رجعت سے بچانا چاہتے ہیں، یا جمود اور بے یقینی سے نجات دلانا چاہتے ہیں تو قومی شعور سے سیاسی اور سماجی شعور کی جانب تیزی سے قدم بڑھانا ضروری ہے۔ قوم کے وجود کا تعین محض اسی منصوبے میں ہوتا ہے جسے انقلابی رہنما تیار کرتے ہیں اور جسے پورے جذبے اور شعور کے ساتھ پوری قوم اپناتی ہے۔ قومی جدوجہد کو پس ماندہ ممالک کے عوامی پس منظر کے ساتھ مسلسل مطابقت پیدا کرتے رہنا چاہئے۔ مردوں اور عورتوں کے جسموں اور ذہنوں میں بھوک کے خلاف، جہالت کے خلاف، غربت کے خلاف اور ناسمجھی کے خلاف جنگ کا جذبہ اور شعور ہمیشہ بیدار رہنا چاہئے۔ دنیا کے عوام کی کوششوں اور ان برائیوں پر قابو پانے کے عزم کو، جنہوں نے انہیں صدیوں تک ماضی کی ذہنی کامیابیوں سے دور رکھا، پس ماندہ ممالک کے عوام کی کوششوں اور عزائم پر مرتسم کرنا چاہئے۔ پس ماندہ انسانیت کی سطح پر ایک قسم کی مشترکہ کوشش اور ایک طرف کی مشترکہ تقدیر کا وجود ہوتا ہے۔ تیسری دنیا کو جن خبروں سے دلچسپی ہوتی ہے ان کا تعلق نہ تو شاہ باؤدوئن کی شادی سے ہے نہ اطالوی حکمران طبقے کے معاشقوں سے۔ ہم جن چیزوں کے بارے میں سننا چاہتے ہیں وہ ارجنٹائن یا برما کے لوگوں کے وہ تجربات ہیں جو انہوں نے اپنی جہالت یا اپنے رہنماؤں کے آمرانہ رجحانات پر قابو پانے کے لئے کئے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیں قوت بخشتی ہمیں سکھاتی اور ہماری استعداد دس گنا زیادہ بڑھاتی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسی حکومت کے لئے ایک منصوبہ لازمی ہے، جو حقیقتاً اپنے عوام کو سیاسی اور سماجی طور پر آزادی دینا چاہتی ہے۔ اس کے لئے ایک اقتصادی منصوبہ بھی لازمی ہے، دولت کی تقسیم اور سماجی تعلقات کے لئے منشور بھی ضروری ہے۔ دراصل انسان اور انسانیت کے مستقبل کا کوئی تصور ضرور ہونا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ محض لفاظی پر مبنی کوئی کلیہ اور سابقہ قابض قوت کے ساتھ کوئی خفیہ سازش منصوبے کی جگہ نہیں لے سکتی۔ نئے عوام جو پہلے بے خبر تھے لیکن جن کا ذہن بڑی تیزی سے روشن سے روشن تر ہوتا جا رہا ہے اس قسم کے منصوبے کے لئے شدید مطالبات کریں گے۔ عام عقیدے کے برعکس افریقی عوام اور بلاشبہ تمام پس ماندہ عوام بہت جلد سماجی اور سیاسی شعور پیدا کر لیتے ہیں۔ جو چیز خطرے کا باعث ہوسکتی ہے وہ ان کا قوم پرستی کے دور سے پہلے ہی سماجی شعور حاصل کر لینا

ہے۔ایسی صورت میں ہمیں پس ماندہ ممالک میں سماجی انصاف کے شدید مطالبات سنائی دیتے ہیں جو متضاد طور پر اکثر اوقات قدیم قبائلیت سے متعلق ہوتے ہیں۔پس ماندہ عوام کا رویہ بھوکی مخلوق کا سا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ جو افریقہ میں عیش وعشرت کی زندگی گذارتے ہیں، ان کا انجام قریب ہے۔ان کی حکومت اپنا وجود غیر معین عرسے تک جاری نہ رکھ سکے گی۔بورژوا جو محض قوم پرستی کو ہی لوگوں کے سامنے خوراک کے طور پر پیش کرتا ہے۔اپنے مقصد میں ناکام ہو کر ناخوشگوار حادثات کے ایک پورے سلسلے کا شکار ہو جاتا ہے۔لیکن اگر قوم پرستی کی وضاحت نہ کی گئی، اگر اسے فوری طور پر سماجی اور سیاسی ضروریات کے شعور میں بہ الفاظ دیگر انسان دوستی میں تبدیل کر کے وقیع اور ہمہ گیر بنایا گیا تو یہی قوم پرستی ہمیں تاریکیوں میں لے جائے گی۔پس ماندہ ممالک کو بورژوا رہنما قومی شعور کو بنجر رسم پرستی میں مقید کر دیتا ہے۔قومی شعور کو ایک وجود اور ایک ہیبت اسی وقت مل سکتی ہے جب ایک وسیع پیمانے پر عورتوں اور مردوں کو کسی بصیرت افروز اور بار آور کام پر لگایا جائے۔اس وقت حکومت کا محل اور قومی پرچم قوم کی علامت نہیں رہ جاتے۔قوم چمک دار اور خالی خول سے کنارہ کش ہو کر ملک میں پناہ لیتی ہے، جہاں اسے زندگی اور حرکت نصیب ہوتی ہے۔زندہ قومی اظہار عوام کے متحرک شعور کا نام ہے اور وہ تمام عورتوں اور مردوں کا بصیرت افروز عمل ہوتا ہے۔اجتماعی تقدیر کی تعمیر تاریخی سطح پر ذمہ داری قبول کرنے کا نام ہے۔ ورنہ پھر انتشار، ظلم، قبائلی جماعتوں اور وفاقیت کی نمود لازم ہے۔قومی حکومت اگر واقعی قومی بننا چاہتی ہے تو اسے عوام کی اور عوام کے لئے ہونا چاہئے یعنی بے یارومددگار کی اور بے یارومددگار کے لئے ہونا چاہئے۔ کوئی رہنما خواہ وہ کتنا ہی قابل قدر کیوں نہ ہو عوام کی مرضی کا بدل نہیں ہوسکتا۔اپنے آپ کو بین الاقوامی وقار کے مسائل میں الجھانے سے پیشتر قومی حکومت کو سب سے پہلے اپنے عوام کو ان کا وقار لوٹنا ہوگا، ان کے ذہنوں کو انسانی اقدار سے بھرنا اور آنکھوں کو ان قدروں سے منور کرنا ہوگا اور ان سامنے ایک انسانی مستقبل پیش کرنا ہوگا۔اس لئے کہ اب ملک میں ایسے لوگ بستے ہیں باشعور ہیں اور جن کے ہاتھوں میں زمام اقتدار ہے۔

کچھ قومی تہذیب کے بارے میں

''افریقی انقلاب میں حصہ لینے کے لئے کوئی انقلابی گیت لکھ دینا ہی کافی نہیں ہے۔آپ کو عوام

کے ساتھ مل کر انقلاب کو ایک شکل دینی ہوگی۔ اور اگر آپ عوام کے ساتھ انقلاب کو صورت بخشیں تو گیت خود بخود پیدا ہوں گے۔

حقیقی عمل کے حصول کے لئے آپ کو خود افریقہ اور اس کی فکر کا جاندار حصہ بننا ہوگا۔ آپ کو اس عوامی توانائی کو ایک عنصر بننا ہوگا جو مکمل طور پر افریقہ کی آزادی، ترقی اور خوشحالی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ وہ فن کار اور دانشور جو عوام سے متعلق نہیں ہے اور جو افریقہ اور مصیبت زدہ انسانیت کی عظیم جدوجہد میں عوام کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس کے لئے اس جدوجہد سے باہر کوئی جھگ نہیں۔'' سیکو طورے (20)

ہر نسل کو چاہیئے کہ وہ ایک نسبتاً مبہم صورت حال میں سے اپنا مقصد تلاش کرے اور یا تو اسے پورا کرے یا پھر اس سے وفا کرے۔ پس ماندہ ممالک میں سابقہ نسلوں نے دونوں ہی کام سر انجام دیئے، انہوں نے استعماریت کی کاٹ کو روکنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی آج کی پختہ جدوجہد کے فروغ میں بھی مدد دی۔ اس گھڑی جب کہ ہم پوری جدوجہد کے درمیان میں ہیں، ہمیں اپنی اس عادت سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیئے جس کے تحت ہم اپنے بزرگوں کے اعمال کو کم حیثیت سمجھتے ہیں اور ان کی خموشی اور انفعالیت کا جائزہ لیتے ہوئے ناسمجھ بن جاتے ہیں۔ ان ہتھیاروں کے ساتھ جو اس وقت ان کے پاس تھے وہ جتنا لڑ سکتے تھے لڑے اور اگر ان کی جدوجہد کی بازگشت بین الاقوامی سیاست کے میدان میں سنائی نہیں دیتی تو ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں شجاعت کی کمی تھی بلکہ یہ ہے، کہ ہمارے زمانے میں بین الاقوامی صورت حاصل بنیادی طور پر تبدیل ہوگئی ہے۔ یہ کہنے کے لئے کہ ''بس اب کافی ہو چکا'' ایک سے زیادہ مقامی باشندوں کی ضرورت تھی اور آج جب کہ اپنی فتح میں یقین رکھ کر مظاہرے اور بغاوتیں کر رہے ہیں تو اس سے کے وجود کی حمایت کرتے ہیں، ممکن ہے وہ تعجب خیز ہو۔ لیکن وہ لوگ جو اس مبالغہ کی حد تک بڑھے ہوئے ولولے کی مذمت کرتے ہیں وہ تعجب خیز حد تک اس امر کو فراموش کر جاتے ہیں کہ ان کی اپنی نفسیات اور ان کی اپنی ذات فرانسیسی یا جرمن تہذیب کی پناہ میں ہے جو اپنے وجود کا مکمل ثبوت دے چکی ہے اور جس کا مدمقابل کوئی نہیں ہے۔

میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ عملی سطح پر ازٹیک تہذیب کا گزشتہ وجود آج کے میکسیکن کسان کی خوراک میں کوئی زیادہ تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں عظیم الشان سونگھائی تہذیب کے تمام

ثبوت بھی اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتے کہ آج کے سونگھائی عوام بھوکے اور ان پڑھ ہیں، وہ خالی سر اور ویران آنکھیں لیے ہوئے آسمان اور سطح آب کے درمیان پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بار ہا کہا جا چکا ہے کہ اس قومی ثقافت کی والہانہ تلاش کا جو استعماری سے پہلے موجود تھی، حقیقی جواز قومی دانشور کی مغربیہ سے دور رہنے کی خواہش میں ہے جس سے انہیں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اس میں پھنس نہ جائیں۔ انہیں یہ احساس ہے کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے اور اس طور وہ اپنے عوام کے کام نہ آسکیں گے۔ اس لئے یہ لوگ سروں میں خروش اور دلوں میں غصہ لئے بے جھجک اپنے عوام کے قدیم ترین اور ماقبل استعمار زندگی بخش سوتوں سے از سر نو رابطہ استوار کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

آیئے آگے بڑھیں۔ غالباً اور ولولہ انگیز تحقیق اور اس غصے کو ایک خفیہ امید زندہ رکھتی ہے یا کم از کم اس کی نگرانی کرتی ہے۔ یہ خفیہ امید آج کے مصائب، آج کی اپنے آپ سے نفرت، آج کی دست برداری اور ترک خواہشات سے ماورا چند نہایت حسین اور شاندار ادوار کی دریافت کر لینے کی امید ہے جن کا وجود ہمیں اپنی نظروں میں بھی بحال کر دے گا اور دوسروں کی نظروں میں بھی۔ میں نے کہا ہے میں اس مسئلے کا اور زیادہ گہرائی سے جائزہ لینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ غالباً لاشعوری طور پر ان قومی دانشوروں نے جو آج کی بربریت کی تاریخ کے سامنے ششدر کھڑے نہ رہ سکتے تھے، یہ فیصلہ کیا کہ وہ اور زیادہ پیچھے جائیں اور زیادہ گہرائیوں میں اتریں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ انہوں نے بے پناہ مسرت کے ساتھ یہ محسوس کیا کہ ماضی میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے شرمسار ہو جائے، بلکہ اس کے برعکس اس میں انہیں وقار، شان وشوکت اور تقدس نظر آیا۔ ماضی کی قومی تہذیب کے تقاضے محض یہ نہیں کرتے کہ قوم کو بحال کر دیں اور مستقبل میں ایک قومی تہذیب کا سبب بنیں۔ نفسیاتی وجذباتی توازن کے سلسلے میں بھی یہ تقاضے مقامی باشندے میں ایک نہایت اہم تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ غالباً ہم نے یہ اچھی طرح واضح نہیں کیا کہ استعماریت محض مقبوضہ ملک کے حال اور مستقبل پر تسلط جمانے پر ہی قناعت نہیں کرتی۔ استعماریت صرف عوام کو اپنی گرفت میں لے کر اور مقامی باشندوں کے ذہن کو صورت اور معنیٰ سے خالی کر کے ہی مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ ایک طرح کی غیر صحت مندانہ منطق سے کام لیتے ہوئے یہ مظلوم عوام کے ماضی کے پیچھے بھی پڑ جاتی ہے اور اسے مسخ کر کے بدہیئت اور تباہ کر دیتی ہے۔ ماقبل استعمار کی تاریخ کو کم حیثیت اور بے قدر بنانے کا کام آج ایک جدلیاتی اہمیت کا حامل ہے۔

جب ہم ان کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں جو تہذیبی بعد پیدا کرنے کے سلسلے میں استعماری دور کا خاصا تھیں، تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ کوئی شے بھی محض اتفاقی نہیں اور استعماری حکومت انجام کار جو مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی وہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ مقامی باشندہ یقین کر لے کہ استعمار اس کے اندھیروں کو کو کرنے کے لئے آیا تھا۔ استعمار نے مقامی باشندوں کو شعوری طور پر یہ تاثر دیا کہ اگر نوآبادکار چلے گئے تو وہ ایک بار پھر بربریت، پستی اور حیوانیت کی جانب لوٹ جائیں گے۔

لاشعوری سطح پر استعماریت یہ کوشش نہیں کرتی کہ مقامی باشندہ اسے ایک شفیق اور محبت کرنے والی ماں سمجھے جو اپنے بچے کو ناسازگار ماحول سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ ایک ایسی ماں جو بنیادی طور پر بگڑے ہوئے بچے کو خودکشی کے مواقع پیدا کرنے اور بیہودہ جبلتوں کو کھلی چھٹی دینے سے مسلسل روک کر رکھتی ہے۔ استعماری ماں اپنے بچے آپ سے، اپنی خودی سے، اپنے جسم سے اور اپنی حیاتیات سے محفوظ کرتی ہے اور اس دکھ سے جو دراصل اس کی زندگی کا جوہر ہے

ایسی صورت حال میں مقامی دانشور کا مطالبہ محض تفریح نہیں ہوتا بلکہ یہ کسی مربوط پروگرام کا لازمی جز ہوتا ہے۔ مقامی دانشور جو اپنی قومی معیشت کی حفاظت کے لئے ہتھیار اٹھا لیتا ہے جو اس حیثیت کے لئے ثبوت بھی فراہم کرنا چاہتا ہے، اور جو اپنے جسم کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو عریاں کر دینے کے لئے بھی تیار ہوتا ہے، وہ اپنے عوام کا دل چیرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس مطالعہ کی محض قومی حیثیت نہیں ہوتی۔ قومی دانشور جو استعماری غلط بیانی کے خلاف جنگ کرنے کا تہیہ کر چکا ہے، پورے براعظم کے میدان میں لڑتا ہے۔ ماضی کو اس کی قدر و قیمت مل جاتی ہے۔ تہذیب جسے ماضی سے نکال کر اس کی پوری شان و شوکت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، لازمی نہیں کہ اس کے اپنے ملک کی ہی ہو۔ استعماریت جس نے کبھی اپنی کوششوں کے بارے میں لطیف پرایہ بیان کے استعمال کی زحمت گوارا نہیں کی، نیگرو کو ہمیشہ وحشی قرار دیتی رہی اور استعماریت کے لئے نیگرو نہ تو انگولی تھا اور نہ ہی نائجیریائی۔ اس کے لئے وہ محض ''نیگرو'' تھا۔ استعماریت کے لئے یہ وسیع براعظم وحشیوں کا اڈہ، توہمات اور تعصّبات کی آماجگاہ، مقدر کا ذلیل، عذاتِ الٰہی سے پست تر آدم خوروں کی بستی، مختصراً یہ کہ ''نیگرو'' کا ملک ہے۔ استعمار کی مذمت پورے براعظم پر محیط ہے۔ استعمار کے اس دعویٰ کا تعلق پورے افریقی براعظم سے ہے کہ ماقبل استعمار کی تاریخ انسانیت کی تاریک ترین رات کی تاریخ ہے۔ مقامی

باشندے کی اپنے آپ کو بحال کرنے اور استعماریت کے پنجوں سے بچنے کی کوشش بھی منطقی طور پر استعماریت کے نقطہ نظر کا ہی حاصل ہے۔ مقامی دانشور جو مغربی تہذیب کے حدود سے کہیں آگے نکل گیا ہے اور جس کے ذہن میں ایک اور تہذیب کے وجود کے اعلان کا سودا سما گیا ہے، وہ کبھی بھی انگولا یا دہومی کے نام پر یہ اعلان نہیں کرتا۔ جس تہذیب کی توثیق کی جاتی ہے وہ افریقی تہذیب ہے۔ نیگرو، کہ اگر سفید فام اس پر قابض نہ ہوتے تو اس قدر نیگرو بھی نہ ہوتا، جب یہ ثابت کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے کہ اس کی بھی ایک تہذیب ہے اور اسے بھی مہذب آدمی کی طرح رہنے کا حق ہے تو پھر اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ تاریخ نے اس کے لئے ایک راہ معین کی ہے اور اب اسے یہ ثابت کرنا چاہئے کہ نیگرو تہذیب کا وجود ہے۔

اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ نسلی فکر یا کم ازکم اس فکر کی جانب لے جانے والی ابتدائی تحریک کی ذمہ داری سب سے زیادہ ان یورپیوں پر عائد ہوتی ہے اور عائد ہوگی جو دوسری تہذیبوں کی عدم موجودگی کے باعث پیدا ہو جانے والے خلا کو فوراً سفید فام تہذیب سے پر کرنے کی مسلسل سعی کرتے ہیں۔ چونکہ استعماریت ایک ایک کر کے قومی تہذیبوں کو وجود سے انکار کرنے میں وقت ضائع کرنے کی بابت کبھی نہیں سوچتی اس لئے استعمار زدہ لوگوں کا جواب بھی اپنی وسعت کے اعتبار سے واضح طور پر پورے براعظم پر محیط ہوتا ہے۔ افریقہ میں گذشتہ بیس سال کا مقامی ادب قومی ادب نہیں بلکہ نیگرو ادب ہے۔ مثال کے طور پر ''نیگرو وازم'' کا تصور اگر منطقی طور پر نہیں تو جذباتی طور پر اس توہین کی نفی ہے جو سفید فام انسان نے پوری انسانیت کے ساتھ روا رکھی۔ سفید فاموں کی نفرت کے خلاف نیگرو وازم کے تیزی سے پھیلتے تصور نے بعض حلقوں میں خود کو ایک ایسے خیال کی صورت میں ظاہر کیا ہے جو ''حکم امتناعی'' اور ''اخراج دین'' کے تصورات کی نفی کر سکتا ہے۔ چونکہ نیوگنی یا کینیا کے دانشوروں نے خود کو حاکموں کی مجموعی نفرت اور معاشرتی جلاوطنی کی صورت حال میں پایا لہٰذا ان کا ردعمل ایک دوسرے کی مدح سرائی میں ظاہر ہوا۔ یورپی تہذیب کی غیر مشروط توثیق نے افریقی تہذیب کی غیر مشروط توثیق کو جنم دیا۔ بحیثیت مجموعی ''نیگرو وازم'' کے شاعر نو عمر افریقہ کے مقابلے میں معمر یورپ کے تصور کے مخالفت کرتے ہیں، نغمہ سرائی کے مقابلے میں اکتا دینے والے استدلال کی مخالفت کرتے ہیں، تیزی سے آگے بڑھنے والی فطرت کے مقابلے میں منطق کے تشدد کے مخالف ہیں۔ ایک جانب سختی، رسوم و آداب اور تشکک ہیں تو دوسری طرف بے تکلفی، زندہ دلی، آزادی.....اور ہاں کیوں نہیں.....عیش پسندی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی

غیر ذمہ دار بھی۔

نیگروازم کے شاعر براعظم کی حدود میں ہی نہیں رکیں گے۔ امریکہ کی سفید فام آوازیں بھی پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس نغمے میں شریک ہو جائیں گی۔ ''سیاہ دنیا'' روشنی دیکھے گی اور گھانا سے بوسیا، سینگال سے بیرا گو ویاپ، سوڈان سے ہمپاٹے اور شاکا گو سے سینٹ کلیر ڈریک مشترکہ روابط کے وجود اور مشترک محرکات پر اصرار کرنے سے نہیں جھجکیں گے۔

عرب دنیا کی مثال بھی یہاں پیش کی جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عرب علاقوں کی اکثریت استعماری تسلط میں رہی ہے۔ استعماریت نے ان علاقوں میں بھی مقامی آبادی کے ذہن میں یہی تصور ٹھونسنے کی کوشش کی ہے کہ استعماریت کی آمد سے پہلے ان کی تاریخ پر وحشت و بربریت مسلط تھی۔ قومی آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ایک تہذیبی صورت حال بھی شامل رہی ہے جسے اسلام کی بیداری کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ ولولہ جس کے ساتھ معاصر عرب مصنفین عوام کو اپنی تاریخ کے عظیم اوراق یاد دلاتے ہیں، قابض قوت کی دروغ گوئی کا جواب ہے۔ عربی ادب کے عظیم نام اور عرب تمدن کا عظیم ماضی اسی طرح پوری جذباتی شدت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے جس طرح افریقی تمدن کا ماضی عرب رہنماؤں نے اسی مشہور دارالاسلام کی جانب واپس جانے کی کوشش کی ہے جو بارہویں صدی سے چودھویں صدی تک بڑی تابناکی سے منور تھا۔

آج سیاسی سطح پر عرب لیگ ماضی کی میراث کو پھر سے اپنانے اور معراج تک پہنچانے کے عزم کو ٹھوس صورت دے رہی ہے۔ آج عرب کے علماء اور عرب کے شاعر سرحدوں کے آر پار ایک دوسرے سے مخاطب ہیں اور ایک نئی عرب تہذیب اور نیا عرب تمدن تخلیق کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ لوگ عربیت کے نام پر مجتمع ہو رہے ہیں اور فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ تاہم عرب دنیا میں ہر جگہ، استعماری تسلط کے باوجود قومی احساس نے ایک ایسی زندہ دلی برقرار رکھی ہے جو افریقہ میں نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی افراد کا اجتماع کے ساتھ وہ بے ساختہ رابطہ جو افریقی تحریک کا خاصا ہے، عرب لیگ میں نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس متناقص طور پر، ہر شخص اپنی ہی قوم کی کامرانیوں کی تعریف میں راگ الاپنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں تہذیبی عمل اس عمومیت سے آزاد ہے جو افریقی دنیا کی خاصیت ہے۔ لیکن عرب اپنے مقاصد کے حصول میں ہمیشہ الگ کھڑے نہیں رہتے۔ زندہ تہذیب قومی نہیں بلکہ عرب

ہے۔ ابھی ان کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ قومی تہذیب کا تحفظ ہو۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ قومی امتیازات کے پیش نظر کوئی تحریک ہو، ابھی مسئلہ یہ ہے کہ قابض قوت کی مجموعی نفرت کے سامنے افریقی یا عرب تہذیب کا تحفظ کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ افریقی دنیا میں اور اسی طرح سے عرب دنیا میں بھی استعمار زدہ ملکوں میں مہذب انسان کے دعوے ہمہ گیر ہیں۔ افریقی پورے براعظم کے لئے اور عرب ساری دنیا کے لئے دعویدار ہیں۔

وہ تاریخی ضرورت جس کے باعث افریقی تہذیب کے لوگ اپنے دعوؤں کو نسلی حیثیت دیتے ہیں اور قومی تہذیب سے زیادہ افریقی تہذیب کی بات کرتے ہیں۔ انہیں تاریک راستوں پر لے جائے گی۔ آیئے مثال کے طور پر افریقی تہذیبی مجلس کو لیں۔ یہ مجلس افریقی دانشوروں نے تشکیل کی تھی جو ایک دوسرے کو جاننا اور اپنے تجربات اور اپنے تحقیقی کام کے نتائج کا موازنہ کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس مجلس کا مقصد افریقی تہذیب کے وجود کی تصدیق کرنا، مختلف اقوام کی سطح پر اس تہذیب کا جائزہ لینا اور ان سب قومی تہذیبوں کی اندرونی محرک قوتوں کو ظاہر کرنا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس مجلس نے ایک اور ضرورت بھی پوری کی یعنی یورپی تہذیبی مجلس کے شانہ بہ شانہ زندہ رہنے کی ضرورت جو خود کو بین الاقوامی تہذیبی مجلس میں متشکل کرنا چاہتی تھی۔ اس فیصلے کی تہہ میں یہ خواہش بھی شامل تھی کہ پوری طرح مسلح ہو کر بین الاقوامی سطح پر جہاں تمام دنیا کی تہذیبوں کا اجتماع ہوتا ہے، ایک ایسی تہذیب کو ثابت کیا جائے جو افریقی براعظم کے قلب سے پھوٹ رہی ہے۔ اب یہ تمام مختلف کام سرانجام دینے میں یہ مجلس جلد ہی اپنی نااہلی کا اظہار کرے گی اور خود کو محض نمائشی مظاہروں تک ہی محدود کر لے گی اور مجلس کے اراکین کا عام رویہ محض اس بات تک محدود ہو کر رہ جائے گا کہ یورپ کے رہنے والوں پر یہ ثابت کیا جائے کہ افریقی تہذیب کے نام کی شئے کا بھی وجود ہے اور یوں یہ مجلس خودسر اور خود پسند یورپیوں کے خیالات کی مخالفت کرنے کی حد تک رہ جائے گی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ایسا رجحان بالکل فطری ہے اور اس کا جواز ہمیں مغربی تہذیب کے پھیلائے ہوئے جھوٹ میں ملتا ہے۔ لیکن نیگروازم کے نظریئے کی وضاحت کے ساتھ اس مجلس کے مقاصد کا تنزل اور بھی نمایاں ہو جائے گا۔ افریقی مجلس سیاہ فام دنیا کی تہذیبی مجلس بن جائے گی اور امریکی براعظموں پر پھیلے ہوئے ہزارہا سیاہ فام لوگوں کو بھی خود میں شامل کر لے گی۔

نیگرو جو ریاست ہائے متحدہ اور وسطی یا لاطینی امریکہ میں رہتے ہیں، درحقیقت خود کو کسی تہذیب

کو کھ سے منسلک کر لینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر افریقیوں سے مختلف نہیں ہے۔ امریکہ کے سفید فاموں نے بھی ان کے ساتھ افریقہ پر حکومت کرنے والے سفید فاموں سے مختلف برتاؤ نہیں کیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سفید فام تمام نیگروؤں کو ایک ہی جھولی میں ڈالنے کے عادی ہیں۔ افریقی تہذیبی مجلس کی پہلی کانگریس کے دوران میں جو 1956 میں پیرس میں منعقد ہوئی۔ امریکی نیگروؤں نے بھی خود بخود اپنے مسائل کو اسی نقطہ نظر سے دیکھا جس سے کہ ان کے افریقی بھائی دیکھ رہے تھے۔ مہذب افریقیوں نے افریقی تمدن کے موضوع پر بولتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ ملک کے اندر لوگوں کو بھی ایک قابل عزت حاصل ہونا چاہئے جو پہلے غلام تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ امریکہ کے نیگروؤں کو یہ احساس ہو گیا کہ انہیں جن مسائل کا سامنا ہے وہ مسائل وہ نہیں ہیں جن سے افریقی نیگرو نبرد آزما ہیں۔ شکاگو کے نیگروؤں کی نائجیریا یا ٹانگانیکا کے نیگروؤں سے مماثلت محض سفید فاموں سے تعلق کے حوالے سے قائم ہے۔ لیکن ایک بار مسائل کے تقابل ہونے اور اندرونی احساسات کے تسکین پانے کے بعد امریکی نیگروؤں کو علم ہو گیا کہ ان کے معروضی مسائل بنیادی طور پر جدا تھے۔ شہری آزادی کی تحریک، جس کے ذریعے امریکہ کے سفید فاموں اور سیاہ فاموں دونوں ہی سے نسلی امتیازات کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے، اصولوں اور مقاصد کے اعتبار سے، قابل نفرت پرتگالی استعماریت کے خلاف انگولی عوام کی دلیرانہ جنگ کے ساتھ، بہت کم یکسانیت رکھی ہے۔ لہٰذا افریقی تہذیبی مجلس کی دوسری کانگریس میں امریکی نیگروؤں نے سیام فام تہذیب والوں کے لئے ایک امریکی تشکیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس طرح نیگروازم کو اس صورت حال میں جو انسانوں کے تاریخی کردار کی تشکیل کے بارے میں محاسبہ کرتی ہے، اپنی پہلی معذوری کا احساس ہو جاتا ہے۔ نیگرو اور افریقی نیگرو تہذیب مختلف اکائیوں میں بٹ جاتی ہے اور وہ اس لئے کہ ان لوگوں کو جو ان تہذیبوں کو مجتمع کرنا چاہتے تھے یہ احساس ہو گیا کہ تہذیب۔ سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر قومی تہذیب ہوتی ہے اور یہ کہ وہ مسائل جنھوں نے رچرڈ رائٹ اور لینگسٹن ہیوز کو متنبہ کیا بنیادی طور پر ہی ان مسائل سے مختلف تھے جن سے لیوپولڈ سینگھور اور جو موکنیاٹا دوچار تھے۔ اسی طرح بعض عرب ریاستیں بھی، گو وہ عرب نشاۃ ثانیہ کے شاندار راگ کا الاپ کر چکی ہیں، یہ محسوس کر لیتی ہیں کہ ان کی جغرافیائی حیثیت اور اپنے علاقے کے اقتصادی تعلقات اس ماضی سے بھی زیادہ مضبوط ہیں جس کو وہ دوبارہ زندہ کرنا چاہتی ہیں۔ لہٰذا آج ہم عربوں کو نامیاتی طور پر ایسے

علاقوں سے ایک بار پھر منسلک دیکھتے ہیں جو تہذیبی اعتبار سے بحیرہ روم کو نواح کے علاقے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ریاستوں پر موجودہ حالات کا دباؤ ہے اور تجارت کی نئی راہیں کھلی ہیں جب کہ سابقہ تجارتی روابط جو عرب تاریخ کے عظیم دور میں موجود تھے اب ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ بعض عرب ممالک کی سیاسی حکومتیں اپنے سیاسی نظریات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے مابین تہذیبی میل جول بے معنی ہو گیا ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات استعمارزدہ ملکوں کا تہذیبی مسئلہ گہرے شکوک پیدا کرنے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ استعماریت کے دعوؤں کے مطابق نیگرو تہذیب کا عدم وجود اور عربوں کی پیدائشی بربریت منطقی طور پر ان تہذیبی مظاہرے کے عروج کے جانب لے جائے گی جو محض قومی نہیں بلکہ براعظمی اور بے حد نسلی ہیں۔ افریقہ میں تہذیبی لوگوں کی تحریک نیگرو افریقی تہذیب یا عرب مسلم تہذیب کی تحریک ہے۔ یہ خاص طور پر قومی تہذیب کی تحریک نہیں ہے۔ تہذیب دن بدن عصری واقعات سے قطع تعلق کرتی جاتی ہے۔ اسے اپنی پناہ اس آتشدان کے پیچھے نظر آتی ہے جو تند جذبات سے دہک رہا ہے اور وہاں سے یہ حقیقت پسندانہ راہوں سے گزرتے ہوئے اپنا راستہ بناتی ہے اور یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے یہ سود مند ہم آہنگ اور مستحکم ہو سکتی ہے۔

گو مقامی دانشور کا عمل تاریخی لحاظ سے محدود ہے، پھر بھی حقیقت یہی رہتی ہے کہ وہ سیاست دان کے اعمال کو برقرار رکھنے اور جائز قرار دینے میں بہت اہم حصہ لیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مقامی دانشور کا رویہ بعض اوقات ایک عقیدے یا مذہب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

لیکن اگر ہم واقعی اس رویے کا صحیح تجزیہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم دیکھیں کہ دانشور کا یہ رویہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس خطرے کے احساس میں مبتلا ہو گیا ہے کہ کہیں وہ عوام سے اپنے رابطے کی آخری کڑی بھی ختم نہ کر دے اور ان سے کٹ کر کہیں دور نہ نکل جائے۔ قومی تہذیب میں یہ واضح اعتقاد در حقیقت کسی ایسی محفوظ جگہ کی طرف جہاں وہ لنگر انداز ہو سکے ایک تند اور ناامیدانہ موڑ ہے۔ سفید فام کی تہذیبی برتری سے بچاؤ کے لئے اور اپنی نجات کی ضمانت حاصل کرنے کے لئے مقامی باشندے کو اپنی ان جانی جڑوں کی جانب لوٹنے اور ہر قیمت پر خود کو اپنے وحشی عوام میں گم کر دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کٹتا جا رہا ہے۔ گویا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسے تضادات کا شکار ہے

جن پر فتح پانا مشکل ہے لہٰذا مقامی باشندہ خود کو اس دلدل سے دور کھینچ لیتا ہے جو شاید اسے نگل لے، اور یوں ہر چیز قبول کر لیتا ہے اور ہر شے کو صحیح سمجھنے اور تسلیم کر لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے خواہ اسے جسم و روح کو گنوا دینے کا نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ مقامی باشندے سمجھتا ہے کہ وہ ہر چیز کا اور ہر آنے والے کے لئے جوابدہ ہے۔ وہ نہ صرف اپنے عوام کے ماضی کا محافظ بنتا ہے بلکہ وہ خود انہیں میں شمار کئے جانے کے لئے تیار ہے اور اس لئے وہ اپنے ماضی کی بزدلی پر ہنسنے کی بھی اہلیت رکھتا ہے۔

تاہم کٹ کر الگ ہونا، جو غالباً تکلیف دہ اور مشکل بھی ہے، بہرصورت لازمی ہے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو نفسیاتی طور پر شدید جذباتی زخم پیدا ہو جائیں گے اور نتیجہ ایسے افراد ہوں گے، جن کا نہ کوئی لنگر ہوگا، نہ کوئی افق... جن میں نہ کوئی کیفیت ہوگی نہ زندگی اور نہ جڑیں۔ گویا بے حس روحیں۔ کسی مقامی کو یہ اعلان کرتے ہوئے سننا بھی معمول کے مطابق بات ہوگی کہ ''میں سینگال اور فرانسیسی کے طور پر بول رہا ہوں'' یا ''میں الجزائری اور فرانسیسی کی حیثیت سے بول رہا ہوں۔'' وہ دانشور جو بیک وقت عرب اور فرانسیسی یا نائجیریاتی اور انگلیسی ہے جب دو قومیتیں اختیار کرنے کی ضرورت سے دوچار ہوتا ہے تو وہ، اگر وہ اپنی ذات سے صادق ہے تو ان دو صورتوں میں سے ایک کی نفی کرتا ہے۔ لیکن چونکہ بسا اوقات دانشوران دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے، تو وہ تاریخی جبریت کے وہ تمام عناصر جمع کر لیتے ہیں جن سے وہ بنے ہیں اور پھر بنیادی ''آفاقی نقطہ نظر'' اپنا لیتے ہیں۔

یہ اس لئے ہوتا ہے کہ مقامی دانشور بڑی حرص کے ساتھ مغربی تہذیب پر پل پڑتا ہے۔ گود لئے ہوئے بچے کی طرح جو خاندان کے سانچے کے بارے میں اپنی تفتیش اس وقت ختم کرتا ہے جب اس کی سائیکی میں کم از کم تحفظات کا کوئی مرکز واضح طور پر قائم ہو جائے، مقامی باشندہ یورپی ثقافت کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ صرف رابیلے، دیدرو، شیکسپیر اور ایڈگر ایلن پو کے نام سے متعارف ہونے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ انہیں اپنے ذہن پر حتی الامکان شدت کے ساتھ مسلط کر لیتا ہے۔

ویسے وہ خاتون اکیلی بھی نہ تھی\
پاس اس کے محترم شوہر بھی تھا\
جس کو یہ معلوم تھا،\
کسے کارنیئے اور راسین کا

والٹیر اور روسو

وکٹر ہیوگو اور موسے

والیری اور ژید کا

اور بہت سے اور لوگوں کا

حوالہ دیتے ہیں۔

لیکن اس وقت جب سیاسی جماعتیں عوام کو قومی آزادی کے نام پر بیدار کر رہی ہیں، مقامی دانشور بعض اوقات ان کتسابات کو ٹھوکر بھی مار دیتا ہے، جب اسے اچانک یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ چیزیں اسے اپنی ہی سرزمین پر اجنبی بنا رہی ہیں۔ ترک کر دینے کا دعویٰ ترک کر دینے ک عمل سے ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ دانشور، جو تہذیب کے واسطے سے مغربی تمدن میں چھن چکا ہے، جو یورپی تہذیب کے جسم کا ایک حصہ بن جانے کا انتظام کر چکا ہے، یا بہ الفاظ دیگر جس نے اپنی تہذیب کو کسی دوسری تہذیب سے بدل لیا ہے، ایک دن یہ محسوس کرلے گا کہ اب وہ حقیقی اور فطری طبع نظر آنے کے لئے تہذیبی کوکھ سے منسلک ہونا چاہتا ہے، وہ تہذیب ایسے منفرد اشخاص کو پیش نہیں کر سکتی جنہیں قابض قوت کے تمدن میں نظر آنے والے منفرد اشخاص کے مقابلے میں رکھا جا سکے جو تعداد میں زیادہ بھی ہیں اور پر وقار بھی.... بلاشبہ تاریخ وقتاً فوقتاً افریقی ماضی کے مختلف ادوار کا جائزہ لیتی رہے گی، گو یہ تاریخ مغربی لوگ اپنے مقاصد کے لئے لکھیں گے۔ لیکن موجودہ صورت حال میں، اپنے ملک کے روبرو، اور اس پورے براعظم کے حالیہ واقعات کو معروضی اور واضح طور پر دیکھتے ہوئے جسے وہ اپنانا چاہتا ہے، ہمارا دانشور یہاں کا خلا، تنزل اور بربریت کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے، وہ اب یہ محسوس کرتا ہے کہ مجھے سفید فام تہذیب سے دور ہٹ جانا چاہئے۔ اپنی تہذیب کہیں اور، کسی اور جگہ تلاش کرنی چاہئے۔ اگر مقامی دانشور اس شان اور وسعت کی تہذیب کا بدل تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ جس کا مظاہرہ قابض قوت کر چکی ہے تو وہ اکثر جذباتی رجحانات کی جانب مراجعت کرے گا اور ایسی ذہنی کیفیت پیدا کرلے گا جس پر غیر معمولی حسیت اور اثر پذیری مسلط ہو۔ حقیقت سے فرار کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی اس ذہنی کیفیت اور کردار ہی میں نزاعی مسائل کے بارے میں مفروضے بنا لیتا ہے اور اس طرح اس کے کردار میں جسمانی نوعیت کا ایک تضاد اور انعکاس سامنے آتا ہے۔

یہ ان مقامی دانشوروں کے اسلوب کی کافی تشریح ہے جو شعور کے اس در کو جو آزاد ہونے کے مرحلے سے گزر رہا ہے معرض اظہار میں لانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ ایک درشت اسلوب ہے، تمثالات سے بھرپور، کیونکہ تمثال ضرورت کا وہ پل ہے جو لاشعوری توانائی کو قرب و جوار کی چراہگاہوں پر بکھر لینے دیتا ہے۔ یہ بہت توانا اسلوب ہے، زندہ نعمکی سے تابندہ اور ابلتی ہوئی زندگی کا مکمل اظہار... یہ اسلوب رنگوں سے بھرپور، کانسی کی طرح سخت، دھوپ میں پکا ہوا اور بہت تند و تیز اسلوب ہے۔ یہ اسلوب جس نے بعض اوقات مغرب والوں کو بھی حیران کر دیا، کسی طرح بھی نسلی نہیں ہے گو اکثر اس کے برعکس بھی بیانات دیئے گئے ہیں۔ یہ اسلوب دست بدست جدوجہد کا اظہار کرتا ہے اور اس ضرورت کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو خود اپنی ذات کے اس حصے سے آزاد ہونا ہے جو اپنے اندر انحطاط کے بیج لئے ہوئے ہے۔ خواہ جدوجہد تکلیف دہ ہو یا تیز رفتار اور ناگزیر، جسمانی عمل کو نظریات کی جگہ لینی ہوگی۔

اگر شاعری کی دنیا میں یہ تحریک ان دیکھی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے تو بھی حقیقت یہی رہتی ہے کہ اصل دنیا میں دانشور اکثر اندھیری راہوں پر چلتا ہے۔ ایسے وقت میں جب وہ عوام سے اپنے رابطے کی بلندیوں پر ہوتا ہے، خواہ وہ عوام ماضی میں کچھ بھی تھے یا حال میں کچھ بھی ہوں، دانشور حقیقی زندگی کی عام راہوں پر اتر آنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، اور اپنی مہم سے محض ایسے کلیے واپس لاتا ہے جو بے انتہا ناکارہ ہو چکے ہیں۔ وہ رسومات، روایات اور اپنے عوام کی ظاہری شکل وشباہت کے ساتھ بڑی قدر و قیمت وابستہ کرتا ہے لیکن یہ ناگزیر تکلیف دہ تجربہ بالآخر غیر ملکی اشیا و تصورات کی فضول تلاش ثابت ہوتا ہے۔ اب دھوبی مقدس چیز بن جاتی ہے اور پیرس یا اٹلی سے آنے والے جوتے دیسی جوتے کے حق میں ٹھکرا دیئے جاتے ہیں اور قابض قوت کی زبان اچانک لب سوز محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس دور میں اپنے ساتھی ہم وطنوں کو تلاش کر لینے کا مطلب بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ بالارادہ نیگرو بنا جائے۔ تمام نیگروؤں جیسا نیگرو بلکہ ایک اصلی نیگرو، ایک رزیل نیگرو، عین اسی قسم کا نیگرو جیسا کہ سفید فام آپ کو بنانا چاہتے ہیں۔ اپنے عوام کی جانب لوٹ جانے کا مطلب ایک غلیظ مصری بن جانا ہے، امکانی حد تک دیسی ہو جانا اور ناقابل شناخت بن جانا ہے اور ان پروں کو جنہیں پہلے آپ نے بڑھنے دیا تھا، کٹوا دینا ہے۔

مقامی دانشور ان بری عادات کی جو استعماری سے مستعار لی گئی ہیں۔ ایک فہرست ترتیب دینے کی ٹھانتا ہے۔ اور ہر شخص کو عوام کی قدیم، اچھی رسوم یاد دلانے میں بڑی پھرتی دکھاتا ہے اور عوام کے بارے

میں تو وہ یہ طے کر چکا ہے کہ ان میں تمام تر خوبیاں اور صداقتیں مجتمع ہیں۔ اس نئی مراجعت پر نوآبادیاتی علاقوں میں بسنے والے نوآبادکاروں کی جھنجلاہٹ، مقامی باشندوں کے فیصلے کو اور زیادہ مستحکم کر دیتی ہے۔ جب استعماریوں کو، جوان مغرب زدہ لوگوں پر اپنی فتح کی مٹھاس چکھ چکے ہیں، یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی جنہیں وہ محفوظ روحیں سمجھتے تھے، نیگرو کے ساتھ شامل ہوتے جا رہے ہیں تو پورا نظام ہی ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔ ہر مقامی باشندہ جسے جیتا گیا تھا، ہر مقامی باشندہ جس نے حلف اٹھایا تھا، جب اپنے بندھن توڑ کر اپنی طرف واپس چلے جانے کا فیصلہ کرتا ہے، تو وہ نہ صرف استعماری ڈھانچے کی شکست کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس کے ناکارہ پن اور سطحیت کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ ہر مقامی باشندہ جو دوسری سمت چلا جاتا ہے، حکومت اور اس کے طریق کار کی ایک انقلابی مذمت ہے اور اس توہین آمیز صورت حال میں جسے وہ جنم دیتا ہے، مقامی باشندے کو اپنے منتخب کردہ راستوں پر ثابت قدم رہنے کے لئے جواز اور حوصلہ افزائی مل جاتی ہے۔

اگر ہم مقامی ادیبوں کی تحریروں میں ان مختلف ادوار کو تلاش کرنا چاہیں جو اس ارتقاء کی خاصیت ہیں تو ہم اپنے سامنے ایک ایسا منظر دیکھیں گے جس کی تین مختلف سطحیں ہیں۔ پہلے دور میں مقامی دانشور اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ اس نے قابض قوت کی تہذیب کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اس کی تحریریں نقطہ بہ نقطہ قابض ملک کے ادیبوں کی تحریروں کے مطابق ہوتی ہیں۔ اس کا تخلیقی محرک یورپ ہے اور ہم اس کی تحریروں کو بہ آسانی قابض ملک کے مخصوص رجحانات سے منسلک کر سکتے ہیں۔ یہ دور غیر مشروط انجذاب کا دور ہوتا ہے اس دور کے نوآبادیاتی ادب میں ہمیں پارلیشین، علامت پسند، اور سرریلسیٹ ادیب بھی نظر آئیں گے۔

دوسرے دور میں مقامی باشندہ پریشان نظر آتا ہے، وہ یہ یاد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ تخلیقی کام کا یہ دور کم و بیش استغراق کے مطابق ہے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ لیکن چونکہ ابھی مقامی باشندہ اپنے عوام کا ایک حصہ نہیں ہوتا، چونکہ عوام کے ساتھ اس کے محض خارجی تعلقات ہی ہوتے ہیں لہٰذا وہ ان کی زندگی کو یاد کرنے پر ہی قناعت کرتا ہے۔ بچپن کے گزرے ہوئے واقعات اس کی یادوں کی گہرائیوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ مستعار جمالیات اور دیگر آسمانوں کے نیچے دریافت شدہ نظریات زندگی کی روشنی میں پرانے قصے کہانیوں کی نئی تعبیریں ہوتی ہیں۔

بعض اوقات عین جدوجہد کے آغاز سے پہلے یہ ادب مزاح اور تمثیل سے بھرپور نظر آتا ہے۔لیکن اکثر اوقات یہ مشکل اور مایوسی کے دور کا اظہار ہوتا ہے۔اور موت اور شکست کے تجربات کا مظہر... ہم قے کرتے ہیں لیکن اس کے نیچے ہنسی سنی جاسکتی ہے۔

بالآخر تیسرے دور میں، جسے جدوجہد کا دور بھی کہا جاتا ہے، خود کو لوگوں میں اور لوگوں کے ساتھ گم کرنے کی کوشش کے بعد، اب مقامی باشندہ انہیں متحرک کرتا ہے۔بجائے اس کے کہ وہ اپنی نظر میں عوام کی کاہلی کا ایک باعزت مقام دے، اب وہ انہیں بیدار کرنے والا بن جاتا ہے اور اس طرح ایک جنگجو، انقلابی ادب اور قومی ادب کی تشکیل ہوتی ہے۔اس دور میں بہت سے مرد اور عورتیں جنہوں نے کبھی کوئی تخلیقی کام کرنے کی بابت سوچا بھی نہ تھا، اب جب کہ وہ خود کو غیر معمولی حالات میں پاتے ہیں، حب الوطنوں کے خفیہ دستوں کے ساتھ جیل میں یا پھانسی کی سزا کی تعمیل سے پہلے، تو انہیں اپنی قوم سے مخاطب ہونے کی ضرورت، ایسے جملے بنانے کی ضرورت جو لوگوں کے دلوں کی آواز بن جائیں اور ایک نئی عملی صداقت کے داعی بننے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تاہم مقامی دانشور کو جلد یا بہ دیر یہ احساس ہو جائے گا کہ کسی قوم کا ثبوت اس کی تہذیب سے فراہم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے وجود کا ثبوت اس جنگ سے دیا جاتا ہے جو سامراجی قابض قوت کے خلاف لڑی جاتی ہے۔کوئی بھی استعماری نظام اس امر سے اپنا جواز پیدا نہیں کرتا کہ وہ جن علاقوں پر قابض ہے وہ علاقوں اپنی کوئی تہذیب نہیں رکھتے۔آپ اس کے سامنے نسبتاً گمنام تہذیبی خزانے بکھیر کر استعمار شرمندہ نہیں کر سکتے۔اس لمحے جب مقامی دانشور بڑی بے تابی سے کوئی تہذیبی شہ پارہ تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں غیروں سے مستعار لی ہوئی تکنیک اور زبان استعمال کر رہا ہے۔وہ ان ذرائع پر ایک ایسی امتیازی مہر لگانا چاہتا ہے جس کے بارے میں اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مہر لگانا چاہتا ہے جس کے بارے میں اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ قومی مہر ہو لیکن جس سے تعجب خیز طور پر بدیسیت کی بو آتی ہے۔مقامی دانشور جو اپنے تہذیب کارناموں کے راستے اپنے عوام کی جانب واپس لوٹتا ہے درحقیقت ایک غیر ملکی کا سا برتاؤ کرتا ہے۔بسا اوقات یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ہر ممکن طور سے عوام کے قریب ہونا چاہتا ہے، وہ مقامی بولی بولنے سے بھی نہیں جھجکتا۔لیکن اس کے پیش کردہ خیالات اور اس کی مصروفیات، اس حقیقی صورت حال کو جانچنے کے لئے صحیح پیمانہ نہیں ہیں جس سے اس کے ملک

کے مرد اور عورتیں دو چار ہوتے ہیں۔ وہ تہذیب جس کی جانب دانشور مائل ہوتے ہیں اکثر معروجہ رسوم وروایات کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ دانشور اپنے آپ کو لوگوں سے منسلک کرنا چاہتا ہے لیکن محض ان کے ظاہر کی نقل تک رہ جاتا ہے۔ اور یہ ظاہری روایات اس مخفی زندگی کا عکس ہوتی ہیں جو وافر مقدار میں ہمیشہ رواں دواں ہوں ہے۔ وہ انتہائی واضح معروضیت جو کسی قوم کی خصوصیت ہوتی ہے۔ درحقیقت ایک بے جان شئے ہوتی ہے، جسے بالعموم فراموش کر دیا جاتا ہے اور جو ایک بہت بنیادی مواد کی بسا اوقات غیر متوازن تشکیل ہوتی ہے۔ اور یہ مواد مسلسل نیا ہوتا رہتا ہے۔ تہذیب کا نمائندہ، بجائے اس کے کہ وہ اس مواد کی تلاش کرے۔ ان جامد ٹکڑوں سے مسحور ہو جاتا ہے جو چونکہ غیر متحرک ہوتے ہیں اس لئے درحقیقت نفی اور گھسی پٹی جدت کی علامت ہوتے ہیں۔ تہذیب میں کبھی بھی رسومات کی سی وضاحت نہیں ہوتی، اسے سہل پسندی سے نفرت ہے۔ اپنے جوہر کے اعتبار سے وہ رسوم کی ضد ہوتی ہے کہ رسوم ہمیشہ تہذیب کا زوال ہوتی ہیں۔ اپنے آپ کو روایت سے منسلک کرنے کی خواہش یا متروک روایات کو پھر سے زندہ کرنے کوشش کا مطلب محض تاریخ کے دھارے کی ہی مخالفت نہیں بلکہ اپنے عوام کی بھی مخالفت ہے۔ جب عوام ایک بے رحم استعماریت کے خلاف ایک مسلح جدوجہد یا سیاسی جدوجہد یا سیاسی جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں تو روایت کی اہمیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ ماضی میں انفعالی مزاحمت کے جو طریق اختیار کئے گئے تھے اس دور میں قابل مذمت ہو جاتے ہیں۔ پس ماندہ ملک میں جدوجہد کے زمانے میں روایات بنیادی طور پر غیر مستحکم ہوتی ہیں اور مرکزی رجحانات کے اثرات کے تابع ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دانشور اکثر متروک ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہوتا ہے۔ جدوجہد سے گذرتے ہوئے عوام۔ میں لفاظی سے بیزاری بڑھتی جاتی ہے۔ اور وہ لوگ جو ان کی پیروی کی خواہش رکھتے ہیں خود کو عام موقع پرستوں کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ یوں کہیے کہ وہ دیر سے آنے والے لوگ ہیں۔

مثال کے طور پر مجسمہ سازی کے فن میں، وہ مقامی فنکار جو ہر قیمت پر قومی فن کا نمونہ تخلیق کرنا چاہتا ہے، اپنے آپ کو محض رسمی تفصیلات پیش کرنے تک ہی محدود کرلے گا۔ یہ فنکار، جو جدید تکنیکوں کا مکمل طور پر مطالعہ کئے ہوتے ہیں اور جو جدید مصوری اور فن تعمیرات کے مخصوص رجحانات میں حصہ لے چکتے ہیں، غیر ملکی تہذیب سے منہ پھیر کر اس کی نفی کرتے ہیں اور ایک حقیقی قومی تہذیب کی تلاش میں لگ جاتے ہیں، اور یوں قومی فنون کے مستقل اصولوں کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں

کہ وہ فکری سانچے اوران سانچوں کی نشوونما کرنے والی چیزیں، مزید برآں اطلاعات، زبان اورلباس کی نئی تکنیک ، یہ سب چیزیں مل جل کرلوگوں کے اذہان کی از سرِنوتنظیم کرتی ہیں اور وہ مستقل اصول جو استعماری دور میں مختلف تحفظات کے طور پرعمل کرتے تھے۔اب خود شدید تبدیلیوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔

وہ فنکار جو قومی صداقتیں پیش کرنے کا تہیہ کر چکتا ہے، اب متناقص طور پرحقیقی واقعات سے دور ماضی کی جانب چل پڑا ہے۔جس چیز کو وہ انجام کار گلے لگانا چاہتا ہے وہ درحقیقت متروک فکر ہوتی ہے، تصورات کے خول اوراس کی لاشیں، گویاایک ایسا علم، جو قطعی طور پر غیر متحرک ہو چکا ہے۔لیکن قومی دانشور کو جوایک مستند فن پارہ تخلیق کرنے کا خواہش مند ہے، یہ ضرور احساس کرنا چاہئے کہ کسی قوم کی صداقت سب سے بڑھ کراس کی حقیقی زندگی ہی ہوتی ہے۔اسے اس وقت تک کوششیں جاری رکھنی چاہئیں جب تک کہ اسے مختلف عناصر کے آمیزے میں سے وہ عنصر نہیں مل جاتا جو مستقبل کے علوم کی نشاندہی کرے گا۔

آزادی سے پہلے مقامی مصور قومی منظر سے بیگانہ تھا۔اس نے تجریدی فن کو بڑی اہمیت دے رکھی تھی اوراکثر اسے حیات جامد کی عکاسی میں تخصیص حاصل تھی۔آزادی کے بعد عوام کے ساتھ وابستگی کی خواہش میں وہ حقیقت کی انتہائی پرتفصیل نمائندگی تک محدود ہو جائے گا۔ یہ وہ نمائندہ فن ہے جس کی کوئی داخلی لَے نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو پرسکوت اور غیر متحرک ہے، جو زندگی کو نہیں بلکہ موت کو بیدار کرتا ہے۔ باشعور طبقہ جب اس ''داخلی حقیقت'' کو جس کا اظہار نہایت خوبی سے کیا گیا ہے، دیکھتا ہے تو مسحور ہو جاتا ہے۔لیکن ہمیں یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے کہ کیا یہ صداقت کوئی حقیقت صداقت ہے، کیا یہ پہلے سے ہی پٹی ہوئی اور ٹھکرائی ہوئی نہیں ہے اور کیا اس پر یہ دور معترض نہیں ہے جس سے گذر کر عوام تاریخ کی جانب اپنا راستہ بنا رہے ہیں؟

شاعری کے میدان میں بھی ہم انہیں حقائق کو نمایاں کر سکتے ہیں۔ بیرونی اثرات کی مقبولیت کے دور کے بعد جس کی خصوصیت مقفیٰ شاعری ہوتی ہے، ڈھولک کا شعری آہنگ ٹوٹ جاتا ہے۔اب بغاوت کی شاعری پیدا ہوتی ہے۔لیکن یہی شاعری بیانیہ اور تجزیاتی بھی ہوتی ہے۔تاہم شاعر کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ عوام کی حمایت میں دانشمندانہ اوراٹل طریقے سے ہتھیار اٹھالینے کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ڈپسٹر سے ایک حوالہ اوراقتباس دیکھئے:

ویسے وہ خاتون اکیلی بھی نہ تھی
اس کا اک شوہر بھی تھا
وہ جو ہر شئے جانتا تھا
لیکن اصلیت میں وہ، جانتا کچھ بھی نہ تھا
بے دیئے کچھ، آپ کو تہذیب مل سکتی نہیں
آپ اس کو لحم و خوں دیتے ہیں، اور
دوسروں کے واسطے تجتے ہیں اپنی زندگی
اس طرح سب کچھ، کلاسکیت اور رومانیت
اور وہ کچھ جو ہماری روح کا ورثہ ہے
سب مل جائے گا۔ (21)

وہ مقامی شاعر جو قومی فن پارے تخلیق کرنے میں منہمک ہے اور جو اپنے عوام کا نقشہ پیش کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے اپنے مقصد میں اس لئے ناکام رہتا ہے کہ وہ ابھی ایسی بنیادی مراعات دینے کے لئے تیار نہیں ہے جس کا ڈیپسٹر نے ذکر کیا ہے۔ فرانسیسی شاعر دینے شار اس مسئلہ کی تفہیم کرتا ہے اور ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ ''شاعری ایک داخلی جبر اور ایک خارجی انتخاب سے جنم لیتی ہے۔ نظم ان فیصلہ کن اور اصل اقدار کے اجتماع اور تحریک کا نام ہے جو موجودہ حالات کے مطابق کسی ایسے شخص کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں جسے واقعات سامنے لے آئیں۔''

ہاں تو مقامی شاعر کا سب سے پہلا فرض تو واضح طور پر ان عوام کا بغور مشاہدہ کرنا ہے جنہیں اس نے اپنے فن پارے کے موضوع کے طور پر چنا ہے۔ وہ اس وقت تک قطعیت کے ساتھ آگے قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک کہ وہ پہلے صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ ان سے کس قدر بیگانہ ہے۔ ہم نے ہر چیز دوسری جانب سے حاصل کی ہے لیکن دوسری جانب سے ہمیں کوئی چیز اس وقت تک نہیں ملتی جب تک کہ ہم ہزار چکر لگا کر بالاخر ان کی سمت میں جھک نہیں جاتے، جب تک کہ دس ہزار، حیلوں اور ایک لاکھ حربوں سے وہ ہمیں اپنی سمت کھینچ لینے، ہمیں ورغلا لینے اور بالاخر قابو میں کر لینے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ لینے کا مطلب کم و بیش ہر صورت میں اسیری ہے۔

لہٰذا ہمارے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم بار بار کسی بات کا اعلان اور کسی چیز کو رد کر کے خود کو آزاد کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کافی نہیں ہے کہ ہم عوام سے ملنے کے لئے اس ماضی میں شامل ہوں جس سے وہ پہلے ہی نکل چکے ہیں بلکہ ہمیں تو اس گھٹتی ہوتی تحریک میں ان کے ساتھ ہونا چاہیئے جس کو وہ ایک شکل دے رہے ہیں اور جو شروع ہونے کے فوراً بعد ہر شے کے خلاف سوالات اٹھائے گی۔ اس سلسلے میں کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیئے۔ پراسرار تغیرات کا یہی وہ علاقہ ہے جہاں عوام بستے ہیں اور یہیں ہمیں آنا چاہیئے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہماری روحیں صاف وشفاف ہوتی ہیں اور ہمارا ادراک اور ہماری زندگی روشنی پاتی ہے۔

کیتا فودیبا، جو آج کل جمہوریہ گنی کے امور داخلہ کے وزیر ہیں، جب ''افریقی بیلے'' کے ڈائریکٹر تھے تو انہوں نے گنی کے عوام کی جانب سے پیش کردہ حقیقت سے کسی قسم کا فریب نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے ملک کی پرآہنگ تمثالوں کی انقلابی نقطہ نظر سے ایک نئی توضیح کی۔ انہوں نے اس سے بھی آگے ایک اور کام کیا۔ ان کی شعری تخلیقات میں، جو زیادہ مشہور نہیں ہیں، ہمیں جدوجہد کے تاریخی لمحات کو صحیح صورت میں بیان کرنے اور ایسے حدود قائم کرنے کی مستقل خواہش نظر آتی ہے جن میں فکر و عمل کے وہ دائرے قائم ہوں جن کے گرد رائے عامہ اپنی واضح صورت میں نمایاں ہو۔ یہ کیتا فودیبا کی ایک ایسی نظم ہے جو فکر و خیال، رمز شکنی اور جنگ کے لئے ایک حقیقی دعوت ہے۔

افریقی طلوع

(گٹار کی موسیقی)

صبح طلوع ہو رہی تھی۔ چھوٹا سا گاؤں جو آدھی رات تک اپنے ڈھول کی تھاپ پر ناچتا رہا، اب آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ شکستہ حال چرواہے بنسری بجاتے ہوئے اپنے اپنے گلوں کو چراگاہوں کی جانب لے جا رہے تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں اپنے اپنے مٹکے اٹھائے ایک ایک کر کے ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی سے گزر کر چشمے پر پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ پیر صاحب کے صحن میں بچوں کا ایک ٹولہ بڑی مدھم آواز آیات قرآنی کا ورد کر رہا تھا۔

(گٹار کی موسیقی)

صبح طلوع ہو رہی تھی، صبح۔ رات اور دن کے درمیان کش مکش۔ لیکن رات تھک چکی تھی اور اب

مزید جنگ نہ کرسکتی تھی اس لئے آہستہ آہستہ ختم ہوگئی۔ سورج کی شعاعیں، ان کی فتح کی پیش رو، اب بھی افق پر منڈلا رہی تھیں، زرد رو اور شرمیلی، جب کہ آخری ستارے کھلتے ہوئے شعلہ رو پھولوں کی طرح آہستہ آہستہ، دبے پاؤں، بادلوں کے جھنڈ کے پیچھے جا چکے تھے۔

(گٹار کی موسیقی)

صبح طلوع ہو رہی تھی۔ اور قرمزی نشیب و فراز والے وسیع کھیتوں کے اس جانب جھک کر زمین کھودتے ہوئے ایک انسان کا سایہ نظر آ رہا تھا، کسان نعمان کا سایہ۔ ہر مرتبہ جب وہ اپنا پھاوڑا ابلند کرتا تو خوفزدہ جانور اڑ کر تیزی سے لیبا یعنی عظیم دریائے نا بجیر، کے پرسکون کناروں کی تلاش میں نکل جاتے۔ اس کا سلیٹی سوتی پاجامہ شبنم سے نم آلود، دونوں جانب سے گھاس سے ساتھ رگڑ کھا رہا تھا۔ پسینے میں شرابور، دم لئے بغیر وہ ہر وقت پھاوڑے پر جھکا کام کرتا رہتا، کیونکہ بیج اگلی بارش آنے سے پہلے ہی بویا جانا ضروری تھا۔

(کورا کی موسیقی)

صبح طلوع ہو رہی تھی، اب بھی طلوع ہو رہی تھی۔ چڑیاں پتوں کے گرد چکر لگا لگا کر صبح کا اعلان کر رہی تھیں۔ کھیتوں کی طرف جاتی ہوئی گیلی پگڈنڈی پر ایک بچہ اپنا چھوٹا ترکش اپنے گلے میں ڈالے چڑھتے ہوئے سانس کے ساتھ نعمان کی جانب بھاگ رہا تھا۔ ''نعمان بھائی، گاؤں کا چودھری تمہیں چوپال کے پیڑ کے نیچے بلا رہا ہے۔''

(کورا کی موسیقی)

کسان سویرے سویرے یہ پیغام سن کر کافی حیران ہوا، اس نے پھاوڑا نیچے رکھ دیا اور گاؤں کی جانب چل پڑا جو اب چڑھتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں چمک رہا تھا۔ گاؤں کے بزرگ پہلے ہی سے پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے اور اب زیادہ ہی پروقار لگ رہے تھے۔ ان کے ساتھ وردی پہنے علاقے کا سپاہی متانت سے بیٹھا اطمینان کے ساتھ حقہ پی رہا تھا۔

(کورا کی موسیقی)

نعمان چٹائی پر بیٹھ گیا۔ چودھری کا نمائندہ لوگوں کو بزرگوں کا حکم سنانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ''گورے صاحبوں نے علاقے کے سپاہی کو ہر گاؤں میں سے ایک ایسا آدمی بلانے کو بھیجا ہے جو جوان کے

ملک میں جا کر جنگ کرے۔ پنچوں نے آپس میں مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم وہ نوجوان بھیجیں گے جو ہماری نسل کی بہترین نمائندگی کر سکے۔ اور وہاں جا کر گوروں کو اس جرات مندی کا ثبوت دے جو ہمیشہ یہاں کی خصوصیت رہی ہے۔"

(گٹار کی موسیقی)

اس طرح نعمان کو سرکاری طور پر چن لیا گیا کہ ہر شام گاؤں کی لڑکیاں گیتوں کے بولوں میں اس کے شاندار جسم اور گھٹے ہوئے بازوؤں کی تعریفیں کرتی تھیں۔ نعمان کی نوجوان بیوی نیک دل قادیہ نے یہ خبر سنی تو جذبات سے بے قابو ہو گئی۔ اس نے اچانک گیہوں پیسنا بند کر دیا، چکی اٹھا کر کوٹھری میں رکھ دی اور کچھ کہے بغیر خود کو اپنے جھونپڑے میں بند کر کے لگاتار ہچکیوں کے ساتھ اپنی بدقسمتی پر رونے لگی۔ موت نے اس کے اس سابق شوہر کو بھی اس سے چھین لیا تھا اور اب اسے یقین نہ آتا تھا کہ گورے نعمان کو بھی اس چھڑا رہے ہیں، اس نعمان کو جو اس کی تمام نئی امنگوں کا مرکز تھا۔

(گٹار کی موسیقی)

اگلے روز اس کے آنسوؤں اور اس کی آہوں کے باوجود، گاؤں کے پورے زور سے بجنے والے جنگی ڈھول نے گاؤں کی چھوٹی سی بندرگاہ تک نعمان کا ساتھ دیا جہاں سے وہ اس کشتی پر سوار ہو گیا، جو علاقائی مرکز کی طرف جا رہی تھی۔ رات کو معمول کے مطابق بازار میں رقص کرنے کی بجائے گاؤں کی لڑکیاں نعمان کے دالان کی خبر گیری کے لئے وہاں جمع ہو گئیں اور صبح ہونے تک آگ کے گرد گھیرا ڈال کر اپنی اپنی کہانیاں سناتی رہیں۔

(گٹار کی موسیقی)

کئی ماہ گذر گئے مگر گاؤں میں نعمان کے متعلق کوئی خبر نہ پہنچی۔ قادیہ اس قدر پریشان ہوئی کہ وہ پڑوس کے گاؤں کے چالاک پیر کے پاس گئی۔ گاؤں کے بزرگوں نے بھی اس مسئلے پر خفیہ طور پر مل کر مشورہ کیا لیکن کچھ طے نہ پایا۔

(کورا کی موسیقی)

بالآخر ایک دن قادیہ کے پتے پر گاؤں میں نعمان کا خط پہنچا۔ وہ یہ جاننے کے لئے کہ اس کے شوہر پر کیا بیت رہی ہے اس قدر بے تاب تھی کہ اس رات گھنٹوں کی پر تکان مسافت طے کر کے علاقائی مرکز

پہنچی جہاں ایک منشی نے اسے وہ خط پڑھ کر سنایا۔

نعمان شمالی افریقہ میں تھا۔ وہ خیریت سے تھا اور اس نے فصل کے بارے میں، تہواروں کے بارے میں، دریا کے بارے میں، رقص کے بارمیں، چوپال کے پیڑ کے بارے میں غرض کہ تمام گاؤں کے بارے میں پوچھا تھا۔

(بلافو کی موسیقی)

اس رات گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے قادیہ کو یہ اعزاز بخشا کہ اسے گاؤں کی بزرگ ترین عورت کے صحن میں آنے اور ان کی رات بھر جاری رہنے والی باتوں میں شریک ہونے کی اجازت دی۔ گاؤں کے چودھری نے نعمان کی خیریت کی خبر سے خوش ہو کر گردونواح کے تمام فقیروں کی شاندار ضیافت کی۔

(بلافو کی موسیقی)

لیکن اگلی مرتبہ صرف ایک چٹھی ہی آئی جس میں تحریر تھا کہ جرمنوں نے نعمان کو قید کر لیا ہے۔ اس خبر سے گاؤں والے بے انتہا متفکر ہوئے۔ پنچوں کا اجلاس ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ نعمان کو ڈوگا رقص کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ کرگس کا مقدس رقص تھا جس کی اجازت محض اس شخص کو دی جاتی جس نے کوئی اہم کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ یہ رقص مالی شہنشاہوں کا رقص تھا جس کا ہر قدم مالی نسل کی تاریخ کی ایک منزل کی علامت ہے۔ قادیہ کو اس امر سے بہت تشفی ہوئی کہ اس کے شوہر کو ملک کے معزز ہیرو کا مرتبہ بخشا گیا ہے۔

(گٹار کی موسیقی)

وقت گزرتا گیا۔ سال کے بعد سال، نعمان اب بھی جرمنی میں ہی تھا۔ اس نے مزید کوئی اطلاع نہ بھیجی۔

(گٹار کی موسیقی)

ایک حسین صبح گاؤں کے چودھری کو ڈاکر سے یہ اطلاع ملی کہ نعمان جلد ہی گھر پر لوٹ آئے گا۔ ایک بار پھر ڈھول کی تھاپ بلند ہوئی۔ گاؤں کی لڑکیوں نے اس کی واپسی کے نئے گیت بنائے کیونکہ بوڑھوں نے جو ڈوگا رقص کے شیدائی تھے اب نسل کے اس مشہور رقص کا کوئی ذکر نہ کیا۔

(ڈھول کی تھاپ)

لیکن ایک ماہ بعد نعمان کے ایک گہرے دوست دفعدار موسیٰ نے قادیہ کو ایک المناک خط لکھا۔ ''صبح طلوع ہو رہی تھی۔ ہم ٹیاروئے سرمیر میں تھے۔ ہمارے اور ڈاکر کے گورے حاکموں کے درمیان ایک بڑی جھڑپ کے دوران میں نعمان کو ایک گولی لگی۔ وہ سینگال کے سرزمین پر پڑا سو رہا ہے۔''

(گٹار کی موسیقی)

ہاں، صبح طلوع ہو رہی تھی۔ سورج کی پہلی شاعوں نے ابھی بمشکل ہی سمندر کی سطح کو چھوا تھا اور سمندر میں ہلکی ہلکی جھاگ بھری اٹھ رہی تھیں۔ کھجور کے درخت ہوا سے ہل ہل کر بڑی آہستگی سے اپنی ٹہنیاں سمندر کے اوپر جھکا رہے تھے، گویا صبح کے واقعے سے غمناک ہو گئے ہوں۔ کوؤں کے شور مچاتے ہوئے جھنڈ اپنی کائیں کائیں سے پڑوس کو اس المیے کی خبر سنانے آئے تھے۔ جس نے ٹیاروئے کی صبح کو خوں آلود کر دیا تھا۔ اور جلتے ہوئے نیلے آسمان میں، عین نعمان کی لاش کے اوپر ایک بڑا کرگس تیزی سے چکر لگا رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو ''نعمان تم نے وہ رقص نہیں کیا جو میرے نام سے منسوب ہے۔ لیکن دوسرے وہ رقص کریں گے۔''

(کورا کی موسیقی)

اگر میں نے حوالہ دینے کے لئے اس طویل نظم کا انتخاب کیا ہے تو اس کی وجہ اس نظم کی غیر متنازع تدریسی اہمیت ہے۔ اس میں ہر چیز واضح ہے۔ یہ ایک مختصر اور امید افزا تفسیر ہے۔ اس نظم کو سمجھنا محض ذہنی ارتقا ہی نہیں بلکہ یہ ایک سیاسی ارتقا بھی ہے۔ اس نظم کو سمجھنے کا مطلب اس کردار کو سمجھنا ہے جو اس میں ادا کیا گیا ہے، اپنی ترقی کو پہچاننا ہے اور اپنے ہتھیاروں کو تیز کرنا ہے۔ ایک بھی استعمار زدہ شخص ایسا نہ ہو گا جو اس نظم میں دیئے گئے پیغام کو نہ سمجھ سکے۔ نعمان، یورپ کے میدان جنگ کا ہیرو، نعمان جواب تک کے لئے مادر وطن کی قوت اور دوام کا ضامن ہے، اس نعمان پر فوجی عین اس وقت گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں جب وہ اپنے آبائی وطن میں واپس پہنچتا ہے۔ یہ 1945 کا سیتیف ہے، یہ فرتے لافرانس ہے، یہ سائیگون ہے، ڈاکر اور لاگوس ہے۔ وہ تمام حبشی اور وہ تمام کالے جو فرانسیسی یا برطانوی تہذیب کی آزادی کی حفاظت کے لئے برسرِ پیکار ہوئے۔ کیتا فودبیا کی اس نظم میں خود کو پہچانتے ہیں۔

لیکن کیتا فودبیا کی نظریں اس سے بھی آگے ہیں۔ استعمار زدہ ملکوں میں، مقامی باشندوں کو میدان جنگ میں استعمال کر چکنے کے بعد، استعماریت انہیں آزادی کی تحریکیں دبانے کے لئے تربیت یافتہ

سپاہیوں کے طور پر کام میں لاتی ہے۔نوآبادیوں میں سابق فوجیوں کی انجمنیں سخت قوم دشمن عناصر میں شمار ہوتی ہیں۔شاعر کیتا فودیبا جمہوریہ گنی کے وزیر امور داخلہ کو یہ تربیت دے رہا تھا کہ کس طرح فرانسیسی استعمار کے تخریبی منصوبوں کا توڑ کیا جائے،نوآبادگنی کی ریاست کو ختم کرنے کے لئے فرانسیسی خفیہ محکمہ دوسرے ذرائع کے ساتھ ساتھ سابق فوجیوں کو بھی استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وہ استعمار زدہ شخص جو اپنے عوام کے لئے لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے، اسے چاہئے کہ ماضی کو مستقبل کی راہیں کھولنے کے لئے، دعوت عمل کے طور پر اور رجائی انداز میں استعمال کرے۔لیکن امید کو یقین میں بدلنے کے لئے اور ایک صورت میں ڈھالنے کے لئے اسے باعمل ہوکر خود کو جسم و روح سمیت قومی جدوجہد میں جھونک دینا چاہئے۔آپ دنیا کی ہر چیز کے بارے میں بات کر سکتے ہیں لیکن جب آپ انسانی زندگی کے اس یکتا پہلو کے بارے میں گفتگو کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں جس کا اظہار نئے افق پیدا کرنے، اپنے ملک میں روشنی پھیلانے، اور اپنے ساتھ اپنے عوام کو بھی اپنے قدموں پر کھڑا کرنے کی صورت میں ہوتا ہے تو آپ کو یقیناً جسمانی پر تعاون کرنا ہوگا۔

مقامی تہذیب کے حامل انسان کے ذمہ داری محض اپنی قومی تہذیب کی ہی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ وہ قوم کی کلیت کا آفاقی طور پر بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔تہذیب بہر صورت قومی زندگی کا محض ایک پہلو ہے۔ مقامی تہذیب کے حامل انسان کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس سطح کا انتخاب کرے جس پر وہ جدوجہد کرنا چاہتا ہے یا اس حلقے کا انتخاب کرے جہاں سے وہ قوم کے لئے محاذ قائم کرنا چاہتا ہے۔قومی تہذیب کے لئے جنگ کا اعلیٰ ترین مفہوم قوم کی آزادی کے لئے جنگ ہے۔یہی وہ ٹھوس بنیادی پتھر ہے جو تہذیبی عمارت کی تعمیر کو ممکن بنا سکتا ہے۔تہذیب کے لئے جنگ عوام جدوجہد سے علیحدہ ہوکر نہیں ہوتی۔مثال کے طور پر وہ تمام مرد جو نہتے ہاتھوں الجزائر میں فرانسیسی استعماریت کے خلاف لڑ رہے ہیں، کسی بھی الجزائر کی تہذیب سے ناآشنا نہیں ہیں۔جنگ کے جاری رہنے کے ساتھ، جیلوں میں، پھانسی کے تختے پر یا ان فرانسیسی چوکیوں میں جن پر قبضہ کرلیا جاتا ہے یا جو تباہ کردی جاتی ہیں، الجزائری تہذیب ہیئت اور مواد حاصل کرتی جاتی ہے۔

لہٰذا ہمیں عوام کے ماضی کو کھودنے اور ایسے مربوط عناصر کی تلاش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہئے جو مقامی تہذیب کو جھٹلانے اور نقصان پہنچانے والی استعماری کوششوں کا تریاق بن سکیں۔ بلکہ ہمیں بھی

مستقبل کی تعمیر کے لئے، اور اس زمین کو تیار کرنے کے لئے جہاں پہلے ہی سے مضبوط پودے سر نکال رہے ہیں، اسی آہنگ کے ساتھ کام کرنا اور لڑنا چاہئے جو عوام میں موجزن ہے۔ قومی تہذیب کسی لوک کہانی کا نام نہیں ہے اور نہ ہی وہ ''عوامیت'' کا کوئی تجریدی اصول ہے جس کے مطابق لوگوں کی حقیقی فطرت جانی جاسکتی ہے۔ تہذیب بے سبب افعال کی بے جان تلچھٹ سے نہیں بنتی یعنی ان افعال سے جن کا تعلق عوام میں ہمہ وقت موجود حقیقت سے بہت کم ہوتا ہے۔ قومی تہذیب فکری سطح پر عوام کی ان کوششوں کے مجموعے کا نام ہے جو وہ ان اعمال کو بیان کرنے، حق بجانب قرار دینے، اور ان کی تعریف کرنے کے لئے کرتے ہیں، جن کی مدد سے کوئی قوم خود کو تخلیق کرتی اور اپنے وجود کو قائم رکھتی ہے۔ لہٰذا پس ماندہ ممالک میں قومی تہذیب کو آزادی کی عوامی کی ان کوششوں کے مجموعے کا نام ہے جو وہ ان اعمال کو بیان کرنے، حق بجانب قرار دینے، اور ان کی تعریف کرنے کے لئے کرتے ہیں، جن کی مدد سے کوئی قوم خود کو تخلیق کرتی اور اپنے وجود کو قائم رکھتی ہے۔ لہٰذا پس ماندہ ممالک میں قومی تہذیب کو آزادی کی عوامی جدوجہد کے عین قلب میں جگہ حاصل کرنی چاہئے۔ افریقی تہذیب کے داعیوں کو جو افریقی اور نیگرو تہذیب کے نام لڑ رہے ہیں اور جنہوں نے اس تہذیب کے اتحاد کے نام پر متعدد مجالس منعقد کی ہیں، اب یہ احساس کر لینا چاہئے کہ ان کی کوششیں محض پرانے سکوں اور پتھروں کے مقبروں کے موازنے تک ہی محدود ہیں۔

سینیگال اور گنی کی قومی تہذیبوں کی تقدیر ایک نہیں ہے۔ البتہ سینگال اور گینی اقوام کی تقدیر میں یکسانیت یہ ہے کہ ان دونوں پر ایک ہی فرانسیسی استعماریت کا قبضہ ہے۔ اگر خواہش یہ ہے کہ سینیگال اور گنی کی قومی تہذیبوں میں مماثلت ہونی چاہئے تو دونوں اقوام کے حکمرانوں کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنے مسائل کو ایک ہی نقطہ نظر دیکھیں، خواہ یہ مسائل آزادی کی جدوجہد کے ہوں یا مزدور اتحادیت اور اقتصادی دشواریوں کے۔ درحقیقت ان مسائل میں بھی مکمل یکسانیت نظر نہیں آتی اور وہ اس لئے کہ عوام اور حکمران ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ کوئی دو تہذیبی ایسی نہیں ہوسکتیں جن میں مکمل یکسانیت ہو۔ اس بات پر یقین کرنا کہ سیاہ فام تہذیب کو تخلیق کرنا ممکن ہے اس امر کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے کہ نیگرو غائب ہو جاتے ہیں اور اب وہ لوگ بھی جو انہیں وجود میں لائے تھے اپنی تہذیبی اور اقتصادی برتری کو ختم ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

لیکن اس سیاہ فام تہذیب نام کی کوئی شئے کبھی وجود میں نہیں آسکتی یوں کہ کوئی ایک سیاست دان ایسا نہیں ہے جو یہ محسوس کرتا ہو کہ اس کے دل میں سیاہ فام جمہوریت تشکیل دینے کی طلب ہے۔ مسئلہ اس حیثیت کو پہچاننے کا ہے جو یہ لوگ عوام کو دینا چاہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سماجی تعلقات سے آگاہی حاصل کی جائے جو یہ لوگ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس تصور کو جانا جائے جو یہ انسانیت کے مستقبل کے بارے میں رکھتے ہیں۔ اہمیت بس اسی بات کی ہے باقی سب کچھ مبہم ولایعنی ہے۔

1959 میں افریقی تہذیب کے داعی روم میں جمع ہوئے اور ہمہ وقت ایجاد کی باتیں کرتے رہے۔ ان میں ایک شخص جیکس رابے ماتجارا بھی تھا جس کی آواز تہذیبی اتحاد کی تعریف میں سب سے بلند تھی۔ یہ شخص آج کل مڈغاسکر کی حکومت میں ایک وزیر ہے، اس حیثیت میں اس نے اپنی حکومت کے ساتھ مل کر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں الجزائری عوام کی مخالفت کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر رابے ماتجارا بدتہی دیانتدار ہوتا تو حکومت سے مستعفی ہو کر ان لوگوں کی مذمت کرتا جو مڈغاسکر کے عوام کے عزائم کے نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مڈغاسکر کے نوے ہزار شہیدوں نے رابے ماتجارا کو یہ اختیار نہیں دیا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں الجزائری عوام کی خواہشات کی مخالفت کرے۔

افریقی نیگرو تہذیب گیتوں، نظموں یا لوک کہانیوں سے پیدا ہونے کے بجائے عوامی جدوجہد سے اپنا مواد حاصل کرے گی۔ سینگھور جو افریقی تہذیبی مجلس کا رکن بھی ہے اور افریقی تہذیبی مجلس کا رکن بھی ہے اور افریقی تہذیب کے مسائل کے بارے میں ہمارے ساتھ مل کر کام بھی کر چکا ہے اب وہ اپنے وفد کو الجزائر کے بارے میں فرانسیسی تجاویز کی حمایت دینے سے بھی نہیں گھبراتا۔ افریقی نیگرو تہذیب اور افریقہ کے تہذیبی اتحاد سے وابستگی، بنیادی طور پر، آزادی کے لئے عوامی جدوجہد کی غیر مشروط حمایت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کوئی شخص اس وقت تک حقیقی طور پر افریقی تہذیب کے پھیلاؤ کا خواہش مند نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ایسے حالات کی تشکیل کی حمایت نہیں کرتا جو اس تہذیب کے وجود کے لئے ضروری ہیں، یعنی پورے براعظم کی آزادی۔

میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ تہذیب کے بارے میں تقریر بازی یا اعلان بازی ہمیں اپنے بنیادی فرائض سے غافل نہیں کر سکتی۔ قومی سرزمین کی آزادی، استعمار کی ہر صورت کے خلاف مسلسل جدوجہد،

اور بالائی سطح پر ستائش باہمی کے دلفریب دائرے میں داخل ہونے سے صاف انکار، یہی ہمارے فرائض ہیں۔

قومی تہذیب اور جدوجہد آزادی کی باہمی بنیادیں

استعماریت مکمل اور ہر شے پر مسلط ہونے کے باعث ہر تفریق کو مٹا دیتی ہے اور مفتوحہ لوگوں کی تہذیبی زندگی کو منتشر کرنے میں شاندار کامیابی حاصل کرتی ہے۔ قومی حقیقت سے انکار، قابض حکومت کے نافذ کردہ نئے قانونی رشتے، استعماری، معاشرت کے ذریعے مقامی باشندوں اور ان کے رسوم و رواج کی مضافاتی علاقوں میں جلاوطنی، غاصیت، اور مردوں اور عورتوں کی بالالتزام غلامی، ان تمام چیزوں کی مدد سے تہذیب کی تباہی کا امکان پیدا کیا جاتا ہے۔

تین سال پہلے میں نے پہلی کانگریس میں یہ واضح کیا تھا کہ استعماری صورت حال میں بہت جلد ہی تحریک کی جگہ استعماری قوت کے رجحانات کی ٹھوس صورتیں لے لیتی ہیں۔ حد بندیوں اور نشانات کے ذریعے تہذیب علاقہ مختص کر لیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ متعدد حفاظتی اقدامات بنیادی نوعیت کے ہوتے ہیں اور کئی وجوہات کی بنا پر ان کا موازنہ عام خود حفاظتی جبلت سے کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے لئے اس دور میں دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جابر قوت خود کو مجبور قوم اور اس کی تہذیب کی عدم موجودگی کا قائل نہیں کر پاتی۔ اس بات کے لئے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ استعمار زدہ شخص اپنی تہذیب کی کمتری کو، جواب اس کے کردار کا جبلی سانچہ بن چکی ہے تسلیم کر لے، اپنی ''قوم'' کی بے حقیقی کو مان لے، اور بالاخر خود اپنے حیاتیاتی ڈھانچے کی نا ممکن اور بے رابط حیثیت سے آگاہ ہو جائے۔

اس صورت حال کے مقابلے میں مقامی باشندوں کا ردعمل یکساں نہیں ہوتا۔ ایک جانب عوام کا انبوہ مربوط روایات پر قائم رہتا ہے جو استعماری صورت حال سے بالکل مختلف ہوتی ہیں اور دستکاری کا اسلوب جامد ہو کر رسمیت اور یکسانیت کا شکار ہو جاتا ہے، مگر دوسری جانب دانشور مجنونانہ انداز میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ قابض قوت کی تہذیب اپنانے میں لگ جاتا ہے اور خود اپنی قومی تہذیب پر معاندانہ تنقید کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتا یا پھر اس تہذیب کے دعوؤں کے یکجا کرنے اور ان کی پیش کش میں لگ جاتا ہے جو جذباتی ہونے کے باوجود بڑی تیزی سے غیر تخلیقی اور بنجر ہوتی جاتی ہے۔

یہ دو ردعمل اس لحاظ سے یکساں نوعیت کے حامل ہیں کہ بالاخر دونوں ہی لاینحل تضادات کی جانب

لے جاتے ہیں۔ مقامی باشندہ خواہ قومی تہذیب سے غداری کرتا ہو، یا اسے مواد و ہیئت مہیا کرتا ہو بہر صورت بے اثر ہی رہتا ہے اور وہ محض اس لئے کہ استعماری صورت حال کا تجزیہ واضح خطوط پر نہیں کیا گیا۔ استعماری صورت حال کم وبیش ہر شعبے میں قومی تہذیب کی راہیں مسدود کر دیتی ہے۔ استعماری تسلط کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے نئی تہذیبی راہیں، یا قومی تہذیب میں کس قسم کی تبدیلی، نہ تو ممکن ہے اور نہ کبھی ہوسکتی ہے۔ ادھر ادھر تہذیبی تحرک کو بیدار کرنے اور اس کے موضاعات میں، اس کی ہیئتوں میں، اور اس کی لے اور آہنگ میں، نئی روح پھونکنے کی دلیرانہ کوششیں کی جاتی ہیں۔ آگے کی جانب ایسی زقندوں کا فوری، واضح، اور ظاہری فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ تاہم اگر ہم اس کے نتائج کو دور تک دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس طرح قومی شعور سے گرد جھاڑنے، جبر کو للکارنے اور آزادی کے لئے جدوجہد کا آغاز کرنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔

استعماری تسلط کے دوران میں قومی تہذیب کی بازی لگی ہوتی ہے جس کی تیاری کے لئے بڑے منظم طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ بہت جلد یہ تہذیب خفیہ صورت اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ خفیہ تہذیب کا یہ تصور بہت جلد قابض قوت کے ردعمل میں ظاہر ہوجاتا ہے جو روایت سے وابستگی کو قوم کی روح سے وفاداری اور استعمار کی اطاعت کے منافی سمجھتی ہے۔ اب اس تہذیب کی ہیئتوں کی پیروی کرنے پر اصرار جو کہ پہلے ہی مردود قرار دی جاچکی ہے، قوم پرستی کے مترادف ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا مظہر اٹھانے کا کوئی سلسلہ ہوتا ہے اور نہ ہی رابطوں کی از سرنو وضاحت۔ تہذیب کی سخت سطح پر ہی توجہ مرکوز کی جاتی ہے، جو زیادہ سے زیادہ بے جان، بے حس اور کھوکھلی ہوتی جاتی ہے۔

جب استحصال کی ایک یا دو صدیاں گذر جاتی ہیں تو قومی تہذیب کے ذخیرے میں حقیقی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ تب یہ تہذیب محض چند خود اختیاری عادات کا مجموعہ، چند روائتی ملبوسات اور چند پامال اداروں تک محدود رہ جاتی ہے۔ اس باقی ماندہ تہذیب میں بہت کم حرکت نظر آتی ہے۔ نہ تو اس میں کوئی حقیقی تخلیقی جذبہ رہ جاتا ہے اور نہ ہی رواں دواں زندگی۔ عوام کی غربت، قومی استحصال اور تہذیب کی پرت۔ قوم کی اصل حقیقت کا پژمردہ ہونا اور قومی تہذیب کا کرب مرگ باہم منحصر اور مربوط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومی آزادی کی جدوجہد کے دوران میں ان تعلقات کے ارتقاء پر نظر رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ مقامی باشندے کی تہذیب کی نفی، کسی بھی تہذیبی مظہر کی مذمت، خواہ وہ عملی ہو یا جذباتی، اور تنظیم کی تمام تخصیصی

شاخوں کو تنظیمی حدود سے باہر رکھنا یہ سب وہ چیزیں ہیں جو مقامی باشندے کے جارحانہ رویوں کی پرورش کرنے میں مدد ثابت ہوتی ہیں۔لیکن یہ رویے انعکاسی قسم کے ہوتے ہیں۔ان میں باہمی امتیازات نہیں ہوتے اور یہ انتشاری اور غیر مئوثر ہوتے ہیں۔ان میں باہمی امتیازات نہیں ہوتے اور یہ انتشاری اور غیر مئوثر ہوتے ہیں۔استعماری استحصال، غربت اور مقامی قحط، مقامی باشندوں کو اور زیادہ نمایاں اور منظّم بغاوت کی طرف لے جاتا ہے۔ایک نمایاں اور فیصلہ کن تصادم کی ضرورت بتدریج اور دھیمے دھیمے تشکیل پاتی ہے اور عوام کی بہت بڑی اکثریت کو اس کا احساس ہونے لگتا ہے۔وہ کھنچاؤ جن کا اب تک وجود ہی نہ تھا سامنے آجاتے ہیں۔بین الاقوام واقعات، استعماری سلطنتوں کے پورے طبقے کا زوال، اور استعماری نظام کی جڑوں میں پائے جانے والے تضادات، مقامی باشندوں کی قوت مقابلہ کو مستحکم اور مضبوط کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ قومی شعور کو آگے بڑھاتے ہیں اور اسے مستحکم کرتے ہیں۔

یہ نئے دریافت ہونے والے کھنچاؤ جو استعماریت کی اصل فطرت میں ہر مرحلے پر موجود رہتے ہیں، ثقافتی سطح پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر ادب میں تخلیقی کام نسبتاً زیادہ ہونے لگتا ہے۔مقامی باشندوں کا پیدا کیا ہوا ادب مسلط قوت کے خلاف ایک ہلکا جواب ہونے کے بجائے تخصیص حاصل کر لیتا ہے اور خود ارادیت اور آزادی کے عزائم کا اظہار بن جاتا ہے۔پڑھا لکھا طبقہ جو جبر کے دوران میں بنیادی طور پر محض ایک صارف طبقہ ہی تھا اب خود پیدا کرنے والا طبقہ بن جاتا ہے۔یہ ادب پہلے تو المیہ اور شاعرانہ انداز تک ہی محدود رہتا ہے لیکن بعد ازاں ناولوں، افسانوں اور انشائیوں پر بھی طبع آزمائی کی جاتی ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک طرح کی اندرونی تنظیم یا قانون اظہار موجود ہے جس کا حکم یہ ہے کہ شاعرانہ انداز اسی نسبت سے کم ہوتا جائے جس نسبت کے جدوجہد آزادی کے طریقے اور مقاصد زیادہ واضح ہوتے جائیں۔موضوعات مکمل طور پر بدل جاتے ہیں۔درحقیقت اب ہمیں تلخ اور مایوس کن الزام تراشی کم سے کم نظر آنے لگتی ہے اور وہ جارحانہ، گونجتی ہوئی آراشتہ تحریریں بھی کم نظر آتی ہیں جو بحیثیت مجموعی مسلط قوت کو ہی طاقت بخشتی تھیں۔پچھلے وقتوں میں استعماریوں نے اظہار کے ان اسالیب کی حوصلہ افزائی کی تھی اور ان کا وجود ممکن بنایا تھا۔زہرناک ملامت، مایوس کن حالات اور جذبات کے بیان کو جو ان اسالیب اظہار کے ذریعے اخراج پاتے تھے، قابض قوت نے محض ایک تزکیہ نفس کے عمل کے طور پر ہضم کر لیا تھا۔ایک خاص معنی میں ایسے تزکیہ نفس کے عمل کو ابھارنے کا مطلب یہ ہے کہ اس

عمل کی ڈرامائی صورت حال کو سامنے نہ آنے دیا جائے اور یوں فضا کو صاف وشفاف رکھا جائے۔

لیکن ایسی صورت حال محض عبوری ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام میں قومی شعور کی ترقی مقامی دانشور کے ادبی اظہار میں تبدیلی پیدا کرتی ہے اسے جامعیت عطا کرتی ہے۔ عوام کا مسلسل اتحاد دانشور کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی احتجاجی فریادوں سے آگے بڑھے۔ فریاد پہلے تو فرد جرم عائد کرتی ہے اور پھر درخواست کرتی ہے۔ اس کے برعکس بعد کے دور میں درخواست کے بجائے احکامات کے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ قومی شعور کا ظہور مروجہ ادبی اسالیب اور موضوعات کو بھی ختم کر دے گا اور اس کے ساتھ ہی نئے عوام کو بھی جنم دے گا۔ ابتدا میں تو مقامی دانشور اپنے فن پارے محض جابروں کے لئے تخلیق کرتے تھے، خواہ ان کا مقصد انہیں مسحور کرنا ہو یا پھر نسلی بنیادوں پر یا موضوعی انداز میں ان کی مذمت ہو۔ لیکن اب وہ تبدریج خود اپنے عوام سے خطاب کرنے کی عادت ڈالتے ہیں۔

محض اسی لمحے سے ہی ہم قومی ادب کی بات شروع کر سکتے ہیں۔ اب ادبی تخلیق کی سطح پر ایسے موضات کا انتخاب اور وضاحت ہوتی ہے جنہیں خصوصیت کے ساتھ قومی گردانا جا سکتا ہے۔ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ اسے جنگ کا ادب کہا جائے کیونکہ یہ سارے عوام کو قومی وجود کی خاطر جنگ کے لئے ابھارتا ہے۔ یہ واقعی جنگ کا ادب ہوتا ہے کیونکہ یہ قومی شعور کی تشکیل کرتا ہے، اسے صورت وخطوط عطا کرتا ہے اور اس کے سامنے نئے اور غیر محدود افق روشن کر دیتا ہے۔ بلا شک یہ جنگ کا ادب ہوتا ہے کہ یہ ایک ذمہ داری قبول کرتا ہے اور اس لئے بھی زمانی ومکانی حدود میں عزم حریت کا اظہار ہے۔

ایک دوسری سطح پر، قصہ گوئی کی روایت لوک کہانیاں، داستانیں اور گیت، جو پہلے متعین شدہ فن پاروں کی حیثیت میں الگ رکھ دیئے گئے تھے اب تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ داستان گو جو پہلے بے جان قصے سنایا کرتے تھے اب انہیں زندہ سامنے لاتے ہیں اور ان میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کرتے ہیں۔ اب قصہ کی کش مکش کو جدید حالات کے مطابق ڈھالنے اور ان کی جدوجہد کو جدید بنانے اور اس کے ساتھ ساتھ مرکزی کرداروں اور استعمال ہونے والے ہتھیاروں کے نام بھی جدید کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ تلمیح کا انداز اب زیادہ استعمال ہونے لگتا ہے۔ اس کلیے کی جگہ کہ ''مدت گزری ایک دفعہ کا ذکر ہے'' اب یہ کلیہ لے لیتا ہے کہ ''ہم جس چیز کا ذکر کریں گے وہ کسی اور جگہ وقوع پذیر ہوئی تھی لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ آج بھی اور یہاں بھی وقوع پذیر ہوئی ہو اور یہ کل بھی وقوع پذیر ہو سکتی ہے'' اس سلسلے میں الجزائر کی

مثال اہم ہے۔ 53-1952 کے بعد، ان داستان گویوں نے جو پہلے بے حد رسمی تھے اور جنہیں سننا خاصا مشکل کام تھا، اپنے داستان گوئی کے روایتی طریقوں کو اور اپنی کہانیوں کے مواد کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ ان کے ناظرین جو پہلے منتشر تھے اب مجتمع ہو گئے۔ رزمیہ نظم اپنی مخصوص صورتوں کے ساتھ، پھر سے ابھر آئی اور اب تفریح کی ایک مستند صورت اختیار کر گئی اور ایک بار پھر تہذیبی قدر کی حامل ہوئی۔ اور جب استعماریت نے 1955 میں منظّم طور پر داستان گویوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا تھا تو یہ کوئی غلط اقدام نہیں تھا۔

نئی تحریک کے ساتھ عوام کا رابطہ زندگی کے نئے آہنگ اور فراموش شدہ جسمانی تناؤ کو جنم دیتا ہے اور تخیل کو تیز کر دیتا ہے۔ ہر مرتبہ جب داستان گو لوگوں کو ایک تازہ قصہ سناتا ہے تو وہ ایک نئی تائید حاصل کرتا ہے۔ ایک نئے قسم کے انسان کا وجود لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ اب یہ نہیں ہوتا کہ حال کو مخصوص حدود میں رکھا جائے، بلکہ چاروں طرف پھیلا دیا جاتا ہے تاکہ حال کو مخصوص حدود میں رکھا جائے، بلکہ چاروں طرف پھیلا دیا جاتا ہے تاکہ سب لوگ اسے دیکھ سکیں۔ داستان گو ایک بار پھر اپنے تخیل کو بے لگام کر دیتا ہے اور نئی اختراعات سے ایک فن پارے کی تخلیق کرتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے کردار جو اس قسم کی تبدیلیوں کو قبول نہیں کر سکتے مثلاً ڈاکو یا کم وبیش سماج دشمن لفنگے، ایک بار پھر نئے سرے سے ڈھالے جاتے ہیں۔ استعمارزدہ ملک میں تخیل کا ظہور اور گیتوں اور رزمیہ داستانوں کا تخلیقی جذبہ اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔ داستان گو متوقع عوام کے سامنے اپنے اندازے کے مطابق نئے نئے فنی نمونے پیش کرتا جاتا ہے اور بظاہر تنہا لیکن عوام کے تعاون کے ساتھ یہ تلاش جاری رکھتا ہے، بہ الفاظ دیگر فن کے قومی نمونے تلاش کرنے کے لئے اپنا راستہ بناتا رہتا ہے۔ طربیہ سوانگ یا تو غائب ہو جاتے ہیں یا پھر اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔ جہاں تک ڈرامہ کا تعلق ہے اب اسے پریشان خیال دانشور اور اس کے اذیت میں مبتلا ضمیر کی سطح پر نہیں رکھا جاتا۔ مایوس کن اور باغیانہ خصوصیت کھونے کے بعد ڈراما عوامی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے اور جاری شدہ عمل کا یا عمل کی تیاری کا مظہر بن جاتا ہے۔

جہاں تک دست کاریوں کا تعلق ہے اظہار کی وہ صورتیں جو پہلے محض فن کی تلچھٹ تھیں، گویا ایک سکتے کی حالت میں زندہ ہوں، اب متحرک ہونے لگتی ہیں۔ مثال کے طور پر لکڑی کے کام میں، جس میں پہلے لاکھوں کی تعداد میں محض چند چہرے اور رجحانات ہی پیش کئے جاتے ہیں، اب ان میں تفریق و

امتیازات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اظہار سے عاری اور بے انتہا منقش مصنوعی چہروں میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بازو جسم سے اٹھتے ہوئے نکلے آتے ہیں گویا عمل کا اظہار ہو رہا ہو اور اب ایسی صورت حال پیش کی جاتی ہے جس میں دو تین یا پانچ مورتیاں ہوں۔ غیر پیشہ ور فنکاروں اور نقادوں کے طوفانی تھپیڑوں کے سامنے روائتی مکاتیب فکر بھی تخلیقی کوششوں پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تہذیبی زندگی کے دائرے میں اس نئی قوت پر بالعموم غور نہیں کیا جاتا تاہم قومی مساعی میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ ایسے چہرے اور جسم بنا کر جو زندگی سے بھرپور ہوں، اور بہت سی مورتیوں کو ایک ہی سطح پر اکٹھا کرنے کا موضوع منتخب کر کے، فنکار منظم تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے

اگر ہم قومی شعور کی بیداری کے اثرات کا کوزہ گری اور ظروف سازی میں مطالعہ کریں تو بھی مشاہدات سامنے آئیں گے۔ دستکار کے کام میں ہیئت پرستی ختم ہوتی نظر آئے گی۔ صراحیاں، مرتبان اور طشتریاں پہلے تو غیر محسوس طور پر اور پھر تقریباً وحشیانہ طور پر تبدیل کر دی جاتی ہیں۔ رنگ جو پہلے گنتی کے ہوتے تھے اور جو ایک روایاتی ہم آہنگی کے تابع تھے اب تعداد بڑھ جاتے ہیں اور اٹھتے ہوئے کے اثرات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ بعض بادامی اور نیلے رنگ جو ایک خاص تہذیبی دائرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ممنوع نظر آتے تھے اب کسی بدنامی کے بغیر اپنے آپ کو منواتے ہیں۔ اسی طرح انسانی چہرے کا انداز بھی، جو ماہرین عمرانیات کے نزدیک واضح طور پر خاص علاقوں کے لئے مخصوص ہے، اچانک مکمل طور پر اضافی ہو جاتا ہے۔ قابض ملک سے آنے والے علم الانسان کے ماہر اور دوسرے ماہرین ان تبدیلیوں کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔ کڑے فن کارانہ قوانین اور استعماری نظام میں پرورش پانے والی تہذیبی زندگی کے نام پر ایسی تبدیلیوں اور فوری طور پر دیسی معاشرے کی روایات کے مدد کو پہنچے ہیں۔ اب استعمار مقامی اسالیب کا محافظ بن جاتا ہے۔ ہمیں اس کی ایک مثال اچھی طرح سے یاد ہے اور یہ مثال اس لئے بھی خاص اہمیت حاصل کر گئی کہ اس میں استعماریت کی حقیقی فطرت کو دخل نہ تھا۔ یہ مثال دوسرے جنگ عظیم کے بعد پیدا شدہ جاز کے نئے انداز..... مثلاً بی بوپ کے واضح صورت میں آنے پر سفید فام ماہرین کے ردعمل کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی نظر میں جاز کو محض مایوسی کا اظہار ہی ہونا چاہئے، ایک ایسے بوڑھے نیگرو کی پرشکست یاد ماضی، جو اپنی نسل کی لعنت شراب کے پانچ پیالوں میں جکڑا ہوا اور سفید فام کی نسلی نفرت کا مرکز ہے۔ جونہی نیگرو اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے اور باقی دنیا کو بھی مختلف طور سے دیکھتا ہے، جونہیں وہ اپنی

امید کو جنم دیتا ہے اور نسل پرست کائنات کو پیچھے دھکیل دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا طبل واضح طور پر بجنے لگے گا اور اس کی آواز کم گلو گیر ہو جائے گی۔ جاز کے نئے اسالیب محض اقتصادی مقابلے کی تخلیق نہیں ہیں۔ ہمیں بغیر کسی شے کے ان میں ریاست ہائے متحدہ کی جنوبی دنیا کی سست رفتار لیکن یقینی شکست کے اثرات دیکھنے چاہئیں۔ اور یہ کوئی یوطوپیائی بات نہیں ہے کہ پچاس سال کے اندر اندر بدنصیب نیگرو کے جاز کی آخری ہچکیاں لے کر بند ہو جانے والی آواز کو محض سفید فاموں کی سند حاصل ہو گی جو اس قسم کی آواز کو نیگرویت کا اظہار سمجھتے ہیں اور جو اسے ایک خاص نوعیت کے تعلق کی علامت سمجھتے ہوئے اس سے وفاداری برتتے ہیں۔

اسی طرح سے ہم رقص، موسیقی اور روایاتی رسومات وتقریبات میں اوپر کی جانب ابھرنے والا رجحان دیکھ سکتے ہیں اور ان شعبوں میں بھی انہیں تبدیلیوں اور انہیں بے قراریوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ قومی تحریک کے سیاسی یا حربی دور سے کافی پہلے ہی آنکھیں کھلی رکھنے والا مبصر ایک نئی قوت کا اظہار اور عنقریب رونما ہونے والے تصادم کو محسوس کر سکتا ہے۔ اسے اظہار اور موضوعات کی غیر معمولی اور تازہ صورتیں نظر آئیں گی اور وہ ایسی قوت سے لبریز ہوں گی جو دعاؤں کی قوت نہیں بلکہ عوامی اجتماع کی قوت ہے جو کسی واضح مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ قوم کے احساس کو جگانے کے لئے ہر چیز مل جل کر کام کرتی ہے اور استغراقی رویے کو، یا تسلیم شکست کو، غیر حقیقی اور نا قابل قبول بنا دیتی ہے۔ مقامی باشندہ اپنے ادراک کی تشکیل نو کرتا ہے کیونکہ وہ دست کاری، رقص، موسیقی ادب اور داستان گوئی کے مقاصد اور تحرک کو از سر نو تازہ کر دیتا ہے۔ اس کی دنیا اپنا لعنت زدہ کردار چھوڑ دیتی ہے اور ایسے حالات جو ناگزیر تصادم کے لئے لازمی، یکجا کر لئے جاتے ہیں۔

ہم تحریک کو تہذیبی صورتوں میں ابھرتا دیکھ چکے ہیں کہ یہ نئی تحریک اور نئی ہیئتیں قومی شعور کی پختگی سے متعلق ہیں۔ اب یہ تحریک خارجی طور پر اداروں کی صورت میں زیادہ سے زیادہ منعکس ہو گی۔ یہاں سے ایک قومی وجود کی ضرورت پیش آتی ہے خواہ اس کی کوئی بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

ایک عام غلطی جس کو حق بجانب قرار دینا بھی بہت مشکل ہے، یہ ہے کہ استعماری تسلط کے دائرے میں رہتے ہوئے مقامی تہذیب کو اظہار کی صورت عطا کی جائے اور اسے نئی اقدار دی جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک ہی مفروضے پر آ جاتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں متضاد نظر آتا ہے، یعنی یہ حقیقت کہ استعمار زدہ

ملک میں نہایت وحشیانہ اور بے حد و امتیاز قوم پرستی قومی تہذیب کی حفاظت کا سب سے زیادہ ولولہ انگیز اور سب سے زیادہ موثر طریقہ ہے۔ مگر تہذیب تو بنیادی طور پر کسی قوم کا اظہار ہوتی ہے، اس کی پسند کا اظہار، اس کی ممنوعات کا اظہار اور اس کے سانچوں کا اظہار۔ پورے معاشرے کی سطح پر ہی دوسری ممانعتیں، دوسری اقدار اور دوسرے سانچے تشکیل پاتے ہیں۔ قومی تہذیب ان تمام چیزوں کا حاصل جمع ہوتی ہے۔ یہ اس خارجی اور داخلی کشاکش کا نتیجہ ہوتی ہے، جس سے معاشرہ بحثیت مجموعی اور معاشرے کی ہر سطح گزرتی ہے۔ استعماری صورت حال میں تہذیب، جو قوم اور ملک دونوں کی حمایت سے محروم رہتی ہے، گر کر ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے وجود کے لئے قومی آزادی اور ملک کا نشاۃ ثانیہ ضروری ہے۔

تہذیب، اس کی افادیت، اس کی مسلسل تشکیل نو اور اس کی گہری کے لئے ہی قوم بنیاد کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ یہ خود ایک لازمی ضرورت بھی ہے۔ قومی وجود کی جنگ ہی تہذیب کو حرکت میں لاتی اور اس کے لئے تخلیق کے دروازے کھولتی ہے اور بعد ازاں یہی قوم تہذیب کے لئے ضروری حالات اور سانچے کی ضامن بنتی ہے۔ قوم مختلف ناگزیر عناصر کو جو تہذیب کی تخلیق کے لئے ضروری ہیں یکجا کرتی ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جو اسے اعتماد، تاثر، زندگی اور تخلیقی قوت دے سکتے ہیں۔ اس طرح تہذیب کا قومی کردار ہی اسے دوسری تہذیبوں کے سامنے پیش کرے گا۔ اور اسے اس قابل بنائے گا کہ وہ دوسری تہذیبوں کو متاثر کر سکے اور ان میں سرایت کر سکے۔ اس تہذیب سے جس وجود ہی نہ ہو، یہ توقع بے مشکل ہی کی جا سکتی ہے کہ وہ حقیقت پر اثر انداز ہو یا حقیقت کو متاثر کرے۔ لہٰذا سب پہلی ضرورت، خالص حیاتیاتی معنوں میں، تہذیب کو زندگی عطا کرنے کے لئے قوم کی از سر نو بحالی ہے۔

اس طرح ہم نے تہذیب کے پرانے سلسلے کی تباہی دیکھ لی، وہ تباہی جو بنیادی اہمیت کی حامل بن جاتی ہے۔ اور ہم نے قومی آزادی کے لئے فیصلہ کن تصادم سے عین پہلے اظہار کی نئی صورتوں کو پیدا ہوتے اور تخیل کو نیا جنم لیتے بھی دیکھا۔ اب ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ سیاسی یا فوجی اور تہذیب کو نیا جنم لیتے بھی دیکھا۔ اب ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ سیاسی یا فوجی جدوجہد اور تہذیب کے درمیان کیا تعلق ہے؟ کیا تصادم کے دوران تہذیب معلق رہتی ہے؟ کیا قومی جدوجہد تہذیب کا اظہار ہوتی ہے؟ اور آخر میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے لئے جنگ، خواہ وہ تہذیب کے لئے کتنی ہی زرخیز حقیقت کیوں نہ ہو بذات خود تہذیب کی نفی ہے؟ مختصراً یہ کہ آزادی کے لئے جدوجہد تہذیبی صورت حال

ہے یا نہیں؟

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اب استعمار زدہ عوام کی یہ شعوری اور منظّم کوشش کہ اپنی قوم کے اقتدار اعلیٰ کو پھر سے قائم کیا جائے بذاتہی ایک مکمل اور واضح تہذیبی مظہر ہے۔ محض جدوجہد کی کامیابی ہی تہذیب کو اعتماد اور توانائی نہیں بخشتی۔ تہذیب تصادم کے دوران میں سرد خانوں میں نہیں پڑی رہتی۔ جدوجہد خود اپنی نشو ونما اور اپنے داخلی ارتقا کے دوران میں تہذیب کو مختلف راستوں پر بھیجتی ہے اور اس کے لئے بالکل نئی راہیں بھی تلاش کرتی ہے۔ آزادی کے لئے جدوجہد قومی تہذیب کو اس کی پرانی قدریں اور پرانی صورتیں واپس نہیں لوٹاتی، یہ جدوجہد جس کا مقصد ہی انسانوں کے درمیان بنیادی اعتبار سے مختلف تعلقات قائم کرنا ہے، یہ کر ہی نہیں سکتی کہ عوام تہذیب کی ہیئت ومواد کو ویسے کا ویسا ہی رہنے دے۔ تصادم کے بعد نہ صرف استعماریت غائب ہو جاتی ہے بلکہ استعمار زدہ انسان بھی غائب ہو جاتا ہے۔

یہ نئی انسانیت اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی انسان پرستی کے ایک نئے تصور کو پیدا کئے بغیر گذارا نہیں کرسکتی۔ یہ نیا تصور تصادم کے طریقوں اور مقاصد میں ہی موجود ہوتا ہے۔ وہ جدوجہد جو عوام کے ہر طبقے کو حرکت میں لاتی ہے اور جو ان کے مقاصد اور ان کی بے قراری کا اظہار کرتی ہے، جو لوگوں کی مکمل حمایت پر انحصار کرنے سے خوفزدہ نہیں ہوتی، ایسی جدوجہد لازماً فتحیاب ہوگی۔ اس قسم کے تصادم کی اہمیت اس امر میں ہے کہ یہ تہذیب کے مقاصد اور نشو ونما کے لئے ضروری حالات زیادہ سے زیادہ مہیا کرتا ہے۔ جب ان حالات میں آزادی کا حصول ہو جاتا ہے تو وہ تکلیف، وہ تہذیبی تذبذب نظر نہیں آتا جو بعض نو آزاد ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ اس لئے کہ قوم اپنے وجود سے، اور وجود میں آنے کے انداز سے، تہذیب پر ایک بنیادی اثر ڈالتی ہے۔ ایک ایسی قوم جو عوام کے متحدہ عمل سے پیدا ہوتی ہے اور جو حکومتی صورت حال کو بدلتے وقت عوام کی حقیقی خواہشات کا مظہر ہوتی ہے، نہایت جاندار تہذیبی اظہار کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

مقامی باشندے جو اپنے ملک کی تہذیبی صورت حال کے لئے بے چین رہتے ہیں اور جو اسے آفاقی وسعتیں بخشنا چاہتے ہیں، انہیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تمام تر اعتماد محض آزادی کے ایسے ناگزیر اور بلا امتیاز اصول پر قائم نہیں کرنا چاہئے جو لوگوں کے شعور میں رچ بس چکا ہے۔ قوم کی آزادی ایک چیز ہے، جنگ کے لئے عوامی مواد اور طریقے دوسری چیز۔ ہمیں یوں لگتا ہے کہ قومی تہذیب کا مستقبل

اوراس کے خزانے میں ان اقدار کا لازمی جز ہیں جنہوں نے جدوجہد آزادی کی داغ بیل ڈالی۔

اور اب بعض رسم پرستوں کو ختم کرنے کا وقت بھی آ گیا ہے۔ ادھر ادھر سے یہ سننے میں آتا ہے کہ قومی تقاضوں کا دور ایک ایسا دور ہے جسے انسانیت پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ یہ زمانہ تو متحدہ طور پر سرانجام پانے والے عظیم کارناموں کا زمانہ ہے۔ نتیجتاً پس ماندہ قوم پرستوں کو اپنی غلطیاں درست کر لینی چاہئیں۔ تاہم ہمارا کہنا یہ ہے کہ غلطی، جس کے نتائج بے انتہا خطرناک ہوں گے، دراصل قومی دور سے بچ نکلنے کی خواہش ہے۔ اگر تہذیب قومی شعور کا اظہار ہے، تو میں یہ کہنے میں تذبذب سے کام نہ لوں گا کہ جس صورت حال کا ہمیں سامنا ہے اس میں قومی شعور ہی تہذیب کی سب سے واضح شکل ہے۔

شعور ذات اس بات کا نام نہیں ہے کہ آپ دوسروں سے مواصلت کا دروازہ بند کر دیں۔ اس کے برعکس فلسفیانہ فکر ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ یہ مواصلت کی ضمانت ہے۔ قومی شعور، جو قوم پرستی نہیں ہے، وہ واحد چیز ہے جو ہمیں بین الاقوامی وسعت عطا کرتا ہے۔ افریقہ میں قومی تہذیب کے مسئلے نے افریقہ میں ایک خاص وسعت اختیار کر لی ہے۔ افریقہ میں شعور کا جنم افریقی شعور کے جنم کے ساتھ ایک گہرا عصری تعلق رکھتا ہے۔ افریقیوں کی قومی تہذیب کی ذمہ داری افریقی نیگرو تہذیب کی ذمہ داری بھی ہے۔ یہ مشترکہ ذمہ داری کسی مابعد الطبیعاتی اصول کا حصہ نہیں ہے بلکہ ایک سادہ قانون کا احساس ہے جس کے مطابق افریقہ کی ہر آزاد قوم، جہاں استعماریت ابھی تک اپنے پنجے گاڑے بیٹھی ہے، ایک محصور قوم ہے، ایک ایسی قوم جو کمزور اور مسلسل خطرے میں ہے۔

اگر انسان اپنے اعمال سے پہچانا جاتا ہے تو ہم کہیں گے کہ آج دانشور کے لئے سب ضروری کام کا اپنی قوم کی تعمیر ہے۔ اگر یہ تعمیر حقیقی ہے، یعنی اگر یہ لوگوں کے عیاں عزم کی تعبیر کرتی ہے اور افریقہ کے پرعزم عوام کا اظہار ہے تو قوم کی تعمیر لازمی طور پر آفاقی اقدار کی ہمت افزائی اور تلاش کا ساتھ دے گی۔ دوسری اقوام سے الگ رہنا تو دور کی بات ہے، قومی آزادی ہی قوم کو تاریخ کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرنے کے لئے لے جاتی ہے۔ بین الاقوامی شعور کے دل میں ہی زندہ رہتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔ اور یہ دہرا احساس انجام کار ہر تہذیب کا منبع ہے۔

سیاہ فام فنکاروں اور مصنفوں کی دوسری کانگریس میں پڑھا گیا۔

روم 1959

نوآبادیاتی جنگیں اور ذہنی امراض

لیکن جنگ جاری رہتی ہے اور آنے والے کئی برسوں تک ہمیں ان بے شمار اور بعض اوقات ان مٹ زخموں کی مرہم پٹی کرنی ہوگی جو استعمار کی شدید ضربات نے ہمارے عوام پر لگائے ہیں۔ سامراجیت جو آج انسان کی حقیقی آزادی کے خلاف جنگ آزما ہے، اپنے بعد ادھر ادھر تنزل کے نشانات چھوڑ جاتی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ انہیں تلاش کر کے پوری بے رحمی کے ساتھ اپنی روحوں اور اپنے ملک سے باہر نکال دیں۔

اس باب میں ہم ذہنی امراض کے مسئلہ پر بحث کریں گے جو الجزائری عوام کی جنگ آزادی سے پیدا ہو گیا ہے۔

شاید اس کتاب میں نفسی طب کے یہ اشارات بے موقع و بے محل نظر آئیں۔ لیکن اس کے لئے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

اس بات کے ذمہ دار ہم نہیں ہیں کہ اس جنگ میں فکر و عمل میں انتشار برپا کرنے والے نفسی طب کے مظاہر اہمیت اختیار کر گئے ہیں، بالخصوص وہاں جہاں سکون بحال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہیں یا بہ الفاظ دیگر یہ کہ امراض اس آبادی میں بھی نظر آتے ہیں جہاں ''سکون بحال'' ہو چکا ہے۔ حقیق یہ ہے کہ استعماریت اپنی فطرت میں ہی نفسی طب کے ہسپتالوں کے لئے مریض بہم پہنچانے والی زرخیزی کا پہلو رکھتی تھی۔ ہم نے 1954 سے ہی مختلف سائنسی تحریروں میں فرانسیسی اور بین الاقوامی ماہرین نفسی طب کی توجہ ان مشکلات کی طرف مبذول کرائی ہے جو مقامی مریض کو پوری طرح ''صحت مند'' کرنے کی کوششوں یا بہ الفاظ دیگر اسے پورے طور پر استعماری سماجی پس منظر کا ایک حصہ بنانے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہیں۔

چونکہ استعمار دوسرے شخص کی منظّم نفی ہے اور چونکہ وہ خوفناک ارادے کے ساتھ کسی دوسرے شخص پر انسانیت کے تمام خواص کو حرام کر دیتا ہے لہٰذا وہ مقبوضہ عوام کو خود سے یہ سوال دہراتے رہنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ''درحقیقت، میں کون ہوں؟''

وہ دفاعی رویے جو استعمار زدہ شخص اور استعماری نظام کو متشددانہ طور سے یکجا کرنے سے جنم لیتے

ہیں ایک ایسے سانچے میں ڈھل جاتے جو بعدازاں استعمار زدہ شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر ہم صرف ان زخموں کی گہرائی اور تعداد کا مطالعہ کریں اور ان سے باخبر رہیں جو استعماری دور میں گذرنے والے ایک واحد دن میں مقامی باشندے پر لگائے جاتے ہیں، تو یہ ''حساسیت'' آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔ یہ بات بہرصورت یاد رکھنی چاہئے کہ استعمارہ زدہ عوام محض زیر تسلط عوام نہیں ہوتے۔ جرمن تسلط کے دوران میں فرانسیسی انسان ہی رہے، فرانسیسی تسلط کے دوران میں بھی ''جرمن انسان ہی رہے۔ الجزائر میں محض قبضہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ حتمی فیصلہ ہے کہ مجموعی سرزمین سے بڑھ کر کسی اور چیز پر قبضہ نہ کیا جائے۔ وہ قدرتی منظر جو نقاب پوش الجزائری خواتین، کھجور کے درخت اور اونٹوں سے مل کر بنتا ہے فرانسیسیوں کے انسانی وجود کے لئے ''فطری'' پس منظر ہے۔

جاری فطرت اپنی تمام تر ہٹ دھری اور باغیانہ رویوں کے ساتھ، نوآبادیات میں جنگلوں، مچھروں، مقامی باشندوں اور بیماریوں میں ظاہر ہوتی ہے اور استعماریت اس وقت کامیاب ہوتی ہے جب اس وحشی فطرت پر قابو پالیا گیا ہو۔ جنگلوں سے گذرتی ہوئی ریلیں، جوہڑوں کی صفائی اور مقامی باشندوں کی آبادی جن کا کوئی سیاسی اور اقتصادی وجود نہ ہو یہ درحقیقت ایک ہی چیزیں ہیں۔

ایسے استعماری دور میں جب اس کا مقابلہ مسلح مزاحمت سے نہیں ہوتا، نقصان وہ اعصابی مسیحات کا مجموعہ ایک خاص حد سے آگے بڑھ جاتا ہے اور مقامی باشندوں کا دفاعی رویہ شکست کھا جاتا ہے، تو وہ ذہنی امراض کے شفاخانوں کو بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لہٰذا کامیاب استعماریت کے اس پرسکون دور میں باقاعدہ ایک اہم ذہنی مرض جنم لیتا ہے جو کہ جبر کا براہ راست نتیجہ ہے۔

آج وہ جنگ آزادی جو الجزائر کے عوام گذشتہ سات سال سے لڑ رہے ہیں۔ ذہنی امراض کی پیداوار کے لئے نہایت زرخیز زمین بن گئی ہے، وہ اس لئے کہ جہاں تک الجزائریوں کا تعلق ہے ان کے لئے تو یہ جنگ ایک مجموعی جنگ ہی ہے۔ یہاں ہم چند الجزائری مریضوں کا تذکرہ کریں گے جن کا ہم نے علاج کرنے کی کوشش کی تھی اور جن کی مثالیں ہمیں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم کوئی سائنسی کام کرنے کی کوشش نہیں کرتے رہے ہیں۔ ہم نے علم التشخیص امراض کی درجہ بندی اور معالجیات پر تمام گفتگو نظرانداز کی ہے۔ چند تکنیکی اصطلاحیں محض حوالوں کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔ تاہم ہمیں دو نکات پر زور دینا ہوگا۔ اول یہ کہ ایک عام قانون کے طور پر کلینیکل نفسی طب ان بیماریوں کو جو

ہمارے مریضوں میں ظاہر ہوئیں ''ردعمل اختلال ذہنی'' کا نام دیتی ہے۔ یہ نام دیتے وقت اس واقعہ کو اہمیت دی جاتی ہے جس نے مرض کو جنم دیا۔ گو بعض صورتوں میں مرض سے پہلے وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ (یعنی مریض کی نفسیاتی جذباتی اور حیاتیاتی حالت کا بیان) اور مریض کا سماجی پس منظر بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہاں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان میں وہ خیالات جنہوں نے مرض کو جنم دیا بنیادی طور پر خونخوار اور بے رحم فضا ہے، عام طور پر برتے جانے والے غیر انسانی اعمال ہیں اور لوگوں کا یہ پختہ یقین ہے کہ وہ کسی حقیقی مکاشفے میں جکڑے گئے ہیں۔ (23)

سلسلہ الف کا کیس نمبر 2 ایک خاص ''ردعمل ذہنی اختلال'' ہے۔ لیکن سلسلہ ب کے کیس نمبر 1، 2، 3، 4، 5 میں یہ امراض کہیں زیادہ وسیع اسباب کی شہادت دیتے ہیں اور ہم کسی ایک خاصہ واقعہ کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے مرض کو جنم دیا ہے۔ اگر ہم بنا بنایا نام استعمال کرنا چاہیں تو یہ ''ردعملی ذہنی اختلال'' ہیں لیکن یہاں ہمیں جنگ کو خاص اولیت دینی چاہئے، جنگ جو بحیثیت مجموعی بھی استعماری ہے اور اپنے اجزاء کے لحاظ سے بھی دو عظیم جنگوں کے بعد ان سپاہیوں کے جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا اور ان شہریوں کے جن کا اخراج کیا گیا اور جو بمباری کا شکار ہوئے، ذہنی امراض کے بارے میں مطبوعات کی کمی نہیں ہے۔ یہاں نفسی طب کی بعض خصوصیات، جن پر ابھی زور نہیں دیا گیا ہے اس امر کی تصدیق کرتی ہیں، اگر تصدیق کی واقعی ضرورت ہے، کہ یہ استعمار جنگ اس مرض کے سلسلے میں بھی یکتا ہے جس کو کہ یہ جنم یدیتی ہے۔

ایک اور خیال بھی، جس پر پختہ یقین کیا جاتا ہے، ہمارے نزدیک از سرنو جائزہ لئے جانے کا محتاج ہے، وہ ان ''ردعملی امراض'' کے نسبتاً بے ضرر ہونے کے بارے میں ہے۔ یہ درست ہے کہ دوسرے لوگوں نے بعض ثانوی ذہنی اختلال بیان کئے ہیں، لیکن ہمیشہ استثنائی مثالوں کے طور پر ایسی مثالیں جہاں پوری شخصیت ہی یقینی طور پر منتشر ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ یہاں یہ مریضانہ کیفیت متعدی ہیں۔ یہ ایسے ذہنی امراض ہیں جو کئی ماہ تک جاری رہتے ہیں، انا پر بھرپور حملے کرتے ہیں، اور عملاً ہمیشہ اپنی نشانی کے طور پر ایک ایسی کمزوری چھوڑ جاتے ہیں جو بالکل عیاں ہوتی ہے۔ ان تمام شہادتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ہمیں میسر ہیں، یہی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مریضوں کا مستقبل ہمیشہ رہن رہتا ہے۔ ہم اپنے نقطہ نظر کی بہتر وضاحت کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔

کئی برسوں سے آزاد شدہ افریقی ممالک میں سے ایک ملک میں ہمیں ایک ایسے محبّ وطن سے ملنے کا اتفاق ہوا جو مزاحمت میں بھی شامل رہا تھا۔ یہ شخص جو اپنی عمر کی تیسری دہائی میں تھا ہم سے مشورہ کرنے اور مدد لینے کے لئے آیا تھا کیونکہ ہر سال ایک خاص تاریخ کے قریب اسے طویل بے خوابی کے دورے پڑتے تھے جس کے ساتھ پریشانی اور خودکشی کے وہم کا تسلط بھی شامل ہوتا۔ یہ خاص تاریخ وہ تاریخ تھی جب اس نے اپنی تنظیم کی ہدایات پر کسی خاص جگہ بم رکھا تھا جس کے نتیجے میں دس افراد ہلاک ہوگئے تھے۔(24)

اس قومی رضا کار کو، جس نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اپنے پرانے اعمال کو رد کرنے کے بارے میں نہ سوچا تھا، واضح طور پر اس امر کا احساس ہوجاتا ہے کہ اسے قومی آزادی کی قیمت کس طرح ادا کرنی پڑی ہے۔اس قسم کے درمیانی درجے کے کیس انقلابی ڈھانچے میں ذمہ داری کا احساس اٹھاتے ہیں۔

یہاں پر اکٹھے کئے گئے مشاہدات 1954 سے 1959 تک کے عرصے پر محیط ہیں۔بعض مریضوں کا الجزائر میں معائنہ کیا گیا، شفاخانوں میں یا نجی مریضوں کے طور پر۔ دوسرے مریض قومی آزادی کے فوج کے محکمہ صحت کی نگرانی میں رہے۔

سلسلہ الف

یہاں پانچ مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ ایسے الجزائریوں یا یورپ کے باشندوں کے کیس ہیں جن میں بہت واضح پر ''ردعملی قسم کے ذہنی امراض'' کی علامتیں ظاہر ہوئی تھیں۔

کیس نمبر 1: ایک الجزائری باشندہ جو اپنی بیوی کی عصمت دری پر اپنی جنسی قوت کھو دیتا ہے۔

''ب'' ایک چھبیس سالہ مرد ہے۔ وہ قومی محاذ آزادی کی ہیلتھ سروس کی ہدایت پر بے خوابی اور مسلسل دردسر کے علاج کے لئے ہمارے پاس آیا۔اس سابق ٹیکسی ڈرائیور نے اٹھارہ سال کے عمر سے قومی جماعتوں کے لئے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔1955 کے بعد سے وہ قومی محاذ آزادی کی ایک شاخ کا رکن بن گیا۔اس نے متعدد بار سیاسی پمفلٹوں اور سیاسی شخصیتوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے اپنی ٹیکسی کو استعمال کیا۔ جب نہایت وحشیانہ طور پر دبانے اور کچلنے کا عمل شروع ہوا تو قومی محاذ آزادی نے جنگ کو شہری مراکز میں لانے کا فیصلہ کرلیا۔تب ''ب'' نے جماعت کے مجاہدین کو ان مراکز پر

پہنچانے کا کام سنبھال لیا جہاں حملہ کیا جاتا تھا اور اکثر اس نے انہیں واپس لانے کے لئے ان مقامات پر ان کا انتظار بھی کیا۔

تاہم ایک دن شہر کے یورپی حصے کے مرکز میں خاصی شدید لڑائی کے بعد بے شمار گرفتاریوں کی وجہ سے اپنی ٹیکسی چھوڑنا پڑی اور مجاہدین کا یہ ٹولہ بکھر جانے پر مجبور ہو گیا، ''ب'' نے جو دشمن کی صفوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، ایک دوست کے گھر پناہ لی۔ کچھ روز بعد وہ اپنے گھر گئے بغیر ہی، اپنے قائدین کے حکم پر قریب کے مجاہد دستے میں شامل ہو گیا۔

کئی ماہ تک وہ اپنی بیوی اور اپنی ایک سال اور آٹھ ماہ کی بچی کے بارے میں کوئی خبر نہ سن سکا۔ البتہ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ کئی ہفتوں تک پولیس شہر میں تلاشیاں لیتی رہی۔ مجاہدین میں دو سال گذارنے کے بعد اسے اپنی بیوی کی طرف سے پیغام ملا جس میں اس کی بیوی نے کہا تھا کہ وہ اسے بھول جائے کیونکہ وہ بے حرمت ہو چکی ہے اور دوبارہ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بارے میں نہ سوچے۔ وہ بے حد پریشان ہوا اور اس نے اپنے کمانڈر سے خفیہ طور پر گھر جانے کی چھٹی مانگی۔ اسے چھٹی تو نہ ملی البتہ اس کی جگہ قومی محاذ آزادی کے ایک رکن کا بندوبست کیا گیا کہ وہ ''ب'' کی بیوی اور والدین سے رابطہ قائم کرے۔

دو ہفتے بعد ''ب'' کے یونٹ کمانڈر کو تفصیلی رپورٹ ملی۔

اس کی چھوڑی ہوئی ٹیکسی پکڑی گئی جس میں مشین گن کے دو میگزین پائے گئے۔ اس کے فوراً بعد فرانسیسی سپاہی پولیس والوں کو ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچے۔ اس کو گھر سے غائب پا کر وہ اس کی بیوی کو پکڑ کر لے گئے اور ایک ہفتے سے زیادہ مدت تک اسے حراست میں رکھا۔

اس سے اس کے شوہر کے ساتھیوں کے بارے میں باز پرس کی گئی اور دو دن تک اسے بری طرح پیٹا جاتا رہا۔ لیکن تیسرے روز ایک فرانسیسی سپاہی نے (اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ سپاہی تھا یا کوئی افسر، باقی لوگوں کو باہر بھیج دیا اور اس کی عصمت دری کی۔ کچھ دیر ایک اور سپاہی نے، لیکن اس بار سب کی موجودگی میں، اس کی یہ کہتے ہوئے عصمت دری کی کہ ''اگر کبھی تمہیں تمہارا ناپاک شوہر مل جائے تو اسے یہ بتانا نہ بھولنا کہ ہم نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے'' وہ ایک ہفتہ اور وہیں رہی لیکن اس سے مزید پوچھ گچھ نہ کی گئی۔ اس کے بعد اسے اس کے گھر واپس بھیج دیا گیا۔ جب اس نے اپنی ماں کو یہ ساری کہانی سنائی تو

ماں نے اسے کہا کہ وہ ''ب'' کو سب کچھ بتادے۔ لہٰذا جونہی اس کا اپنے شوہر سے رابطہ قائم ہوا تو اس نے اپنی بے حرمتی کا اقرار کرلیا۔ جب پہلا دھچکہ گذر چکا اور پھر اس وجہ سے بھی کہ اس کا ہر لمحہ مصروفیت میں گذرتا تھا، ''ب'' اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔ کئی ماہ تک وہ ایسی متعدد الجزائری عورتوں کے قصے سنتا رہا جن کی عصمت دری کی گئی یا جنہیں اذیت پہنچائی گئی اور اسے ان عصمت دریدہ عورتوں کے شوہروں سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا، لہٰذا اس کی نجی بدقسمتی اور ایک زخم خوردہ شوہر کا احساس حرمت پس منظر میں دبا رہا۔

1958 میں اسے ملک سے باہر کسی کام کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جب دوبارہ یونٹ میں شامل ہونے کا وقت آیا تو بے خیالی اور بے خوابی کے بعض دوروں نے اس کے ساتھیوں اور قائدین کو اس کے بارےمیں پریشان کردیا۔ اس کی روانگی ملتوی کردی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ طبی معائنہ کرائے۔ اس وقت ہم اس سے پہلی بار ملے۔ اسے فوری طور پر سمجھنا بہت آسان تھا۔ ایک متحرک چہرہ غالباً کچھ زیادہ ہی متحرک۔ مسکراہٹ ضرورت سے زیادہ ہی پھیلی ہوئی بظاہر صحت مند ''میں درحقیقت بالکل ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک۔ اب میں بہتر محسوس کررہا ہوں۔ بس مجھے ایک آدھ ٹانک دے دیجئے اور کچھ وٹامن اور مین اپنے آپ کو ذرا طاقتور محسوس کرلوں گا'' مگر ایک بنیادی پریشانی اس کی ظاہری سطح میں شگاف کرنے کے لئے ابھری۔ اسے فوراً ہسپتال بھیج دیا گیا۔

دوسرے دن کے بعد سے رجائیت کا پردہ پھٹتا چلا گیا اور اس کے پیچھے ہمیں ایک فکرمند اور مایوس شخص نظر آیا جس کی بھوک غائب ہوچکی تھی اور جو اب بستر سے لگ چکا تھا۔ وہ سیاسی گفتگو سے احتراز اور ہر اس چیز سے جس کا تعلق قومی جدوجہد سے ہو دلچسپی کے فقدان کا نمایاں اظہار کرتا تھا ایسی تمام خبریں سننے سے پرہیز کرتا تھا جن کا تعلق آزادی کی جنگ سے ہو۔ اس کی مشکلات کو سمجھنا ایک طویل مدت کا متقاضی تھا تاہم چندروز بعد ہم اس کی کہانی کو ترتیب دینے کے قابل ہوگئے۔

باہر قیام کے دوران میں اس نے ایک جنسی سلسلہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ سوچ کر کہ شاید اس کی وجہ تھکاوٹ ہو، جو جبری مارچ اور کم خوراک کھانے کا فطری نتیجہ ہوتی ہے، اس نے دو ہفتے بعد پھر کوشش کی۔ مگر پھر ناکامی کا سامنا ہوا۔ ایک دوست سے ذکر کیا، جس نے اسے وٹامن بے 12 کھانے کا مشورہ دیا۔ یہ گولیاں کھائیں ایک بار پھر کوشش کی لیکن ایک بار پھر ناکامی ہوئی۔ مزید برآں

اسے جنسی فعل سے چند ثانیے پیشتر اپنی ننھی بچی کی تصویر پھاڑ دینے کی ناقابل مزاحمت خواہش پیدا ہوئی۔ ایسی علامتی آشنائی کی موجودگی میں ہم یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ مریض میں تزویج محرمات کی لاشعوری خواہش موجود ہے۔ تاہم تعدد ملاقاتوں اور ایک خواب نے، جس میں مریض نے ایک چھوٹی سی بلی کو، نہایت مکروہ بدبو کے ساتھ تیزی سے سڑتے ہوئے دیکھا، ہمیں ایک بالکل دوسرا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک دن اس نے ہم سے اپنی ننھی بچی کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا ''اس لڑکی میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے'' اس کے بعد سے اس کی بے خوابی بہت ہی نمایاں ہوگئی اور اعصاب کو آرام دینے والی دوا کی بہت بڑی بڑی خوراکوں کے باوجود ایک پریشان کن ہیجان کی حالت قائم رہی جس نے ادارے کو بھی کسی حد تک فکرمند کر دیا۔ تب اس نے پہلی مرتبہ ہم سے اپنی بیوی کے بارے میں ذکر کیا۔ ہنستے ہوئے اس نے کہا ''اس نے فرانسیسی کا مزہ چکھا ہے'' اسی لمحے ہم نے اس کی پوری کہانی ترتیب دے لی۔ واقعات کے تانے بانے سے پورا نمونہ تیار ہو گیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہر جنسی کوشش سے پہلے وہ اپنی بیوی کے بارے میں سوچتا تھا۔ ہمیں اس کی تمام باتیں بنیادی دلچسپی کی حامل نظر آئیں۔

''میں نے اس لڑکی سے شادی کی حالانکہ مجھے اپنی بنت عم سے محبت تھی۔ لیکن میری بنت عم کے والدین نے اس کے لئے کسی اور کے ساتھ رشتے کا بندوبست کر لیا تھا۔ لہٰذا میرے والدین نے میرے لئے جو پہلی لڑکی تلاش کی میں نے اسے قبول کر لیا۔ وہ اچھی تھی لیکن مجھے اس سے محبت نہ تھی۔ میں ہمیشہ اپنے آپ سے کہا کرتا تھا ''تم ابھی جوان ہو۔ کچھ دیر انتظار کرو۔ جب تمہیں مناسب لڑکی مل جائے تو اسے طلاق دے کر اپنی پسند کی شادی کر لینا'' آپ نے دیکھا میں اپنی بیوی سے کچھ زیادہ وابستہ نہ تھا۔ اور ان ہنگاموں کی وجہ سے میں اس اور بھی دور ہوتا گیا اور بالاخر یہ ہوا کہ میں گھر آ کر کھانا کھاتا اور اس سے ابت چیت کئے بغیر ہی سو جاتا۔

مجاہدین میں رہتے ہوئے جب میں سنا کہ فرانسیسی نے اس کی عصمت دری کر دی ہے تو مجھے پہلے تو اس بدمعاش پر غصہ آیا۔ تب میں نے کہا ''خیر کوئی زیادہ بری بات بھی نہیں ہوئی، وہ قتل تو نہیں ہو گئی۔ وہ پھر سے اپنی زندگی شروع کر سکتی ہے۔'' اور پھر کچھ ہفتوں بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کی عصمت دری اس لئے ہوئی کہ وہ لوگ میری تلاش میں تھے۔ دراصل اس کی خاموشی کی سزا کے طور پر اس کی بے حرمتی کی گئی۔ وہ بڑی آسانی سے تحریک میں شامل کم از کم ایک شخص کا نام بتا سکتی تھی اور اس سے وہ پھیلے ہوئے

پورے جال کی تفتیش کر کے اسے تباہ کر دیتے اور مجھے گرفتار کر لیتے۔ یہ ایک سیدھا سادھا زنا بالجبر نہ تھا کہ چونکہ اور کچھ کرنے کو نہیں لہٰذا یہ کر لیا اور نہ ہی یہ اذیت دہندگی کی بنا پر تھا جس کے مظہر مجھے گاؤں میں نظر آئے ہیں۔ یہ ایک ہٹ دھرم عورت کی عصمت دری تھی جو اپنی شوہر کو بیچنے کی بجائے ہر چیز چھوڑ دینے کے لئے تیار تھی۔ اور وہ شوہر میں تھا۔ اس عورت نے میری زندگی بچائی اور تنظیم کی بھی حفاظت کی۔ میری ہی وجہ سے اس کی بے حرمتی ہوئی۔ اس کے باوجود اس نے مجھے سے یہ نہیں کہا ''دیکھو میں نے تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟'' اس کے برعکس اس نے کہا ''مجھے بھول جاؤ، اپنی زندگی پھر سے شروع کرو کیونکہ میں اب بے حرمت ہو چکی ہوں۔''

اسی لمحے میں نے جنگ کے بعد اپنی بیوی کو اپنا لینے کا فیصلہ کر لیا، کہ میں یہ دیکھا ہے کہ کاشت کاروں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیویوں کی عصمت دری ہوتے دیکھی اور بعد ازاں خود ان کے آنسو پونچھے۔ اس بات نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ تاہم میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ شروع شروع میں یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ لیکن ہمیں بار ہا ان معاملات میں دخل دے کر شہریوں کو مسائل سمجھانے پڑے۔ میں یہ بھی دیکھا کہ شہریوں نے ایسی لڑکیوں کو شادی کا پیغام دیا، جنہیں فرانسیسی سپاہیوں نے بے حرمت کیا تھا اور ان سے انہیں بچہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر میں اپنی بیوی کے مسئلے کا پھر سے جائزہ لیا۔

لہٰذا میں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن میں کہہ نہیں سکتا کہ جب میں اسے دوبارہ دیکھوں گا تو اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کروں گا۔ اور اکثر جب میں اپنی بچی کی تصویر دیکھتا تو میں سوچا کرتا اس کی بھی بے حرمتی کی گی ہے گویا ہر وہ چیز جس کا میری بیوی سے تعلق ہے خراب کر دی گئی ہے۔ اگر وہ اسے اذیت دیتے یا رمار مار کر اس کے سارے دانت نکال دیتے یا بازو توڑ ڈالتے تو مجھے پروانہ ہوتی۔ لیکن یہ چیز.... آپ اس چیز کو کیسے بھول سکت ہیں؟ اور اور پھر اسے مجھے یہ سب بتانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔

تب اس نے مجھے پوچھا کہ کیا خیال میں اس کی ''جنسی ناکامیاں'' اس کی پریشانیوں کے باعث ہیں؟

میں نے جواب دیا ''ہاں، یہ ناممکن نہیں ہے۔''

تب وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا۔

''آپ کے ساتھ بھی یہی ہوتا تو آپ کیا کرتے؟''

''میں کہہ نہیں سکتا''

''کیا آپ اپنی بیوی کو اپنا لیتے؟''

''میرا خیال ہے میں اپنا لیتا....''

''ہاں، یہ بات ہوئی نا، دیکھا آپ نے، آپ کو پورا یقین نہیں ہے...''

اس نے ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور چند لمحوں بعد کمرے سے نکل گیا۔

اس دن کے بعد سے وہ بتدریج سیاسی گفتگو سننے پر زیادہ آمادہ نظر آنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ دردِ سر اور بھوک کی کمی بھی کافی حد تک کم ہوتی گئی۔

دو ہفتوں بعد وہ اپنی یونٹ کو واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے وہ مجھے کہنے آیا۔ جب آزادی مل جائے گی تو میں اپنی بیوی کو اپنا لوں گا اور تب اگر ہمارے درمیان نہ بنی تو میں دوبارہ الجیریا آکر سے ملوں گا''

کیس نمبر 2: قتل عام سے بچ نکلنے والے شخص میں بلا امتیاز قتل کرنے کی خواہشات کا وجود۔

''س'' ایک ستیتیس سالہ کسان ہے۔ کانسٹین ٹائن کے علاقے کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ لڑائی کے شروع ہی سے اس کا علاقہ الجزائری مجاہدین اور فرانسیسی فوج کے درمیان شدید جنگ کا منظر بنا رہا۔ اس لئے ''س'' کو لاشیں اور زخمی دیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ لیکن وہ ان حالات سے الگ تھلگ رہا۔ البتہ وقتاً فوقتاً سارے الجزائری عوام کی طرح، اس کے گاؤں کے کاشت کار بھی اس راہ سے گزرتے ہوئے الجزائری عوام کی طرح، اس کے گاؤں کے کاشت کار بھی اس راہ سے گزرتے ہوئے الجزائری مجاہدین کی مدد کیا کرتے تھے۔ لیکن 1958 کے آغاز میں ایک صبح اس کے گاؤں کے نزدیک ہی مجاہدین نے ایک خوفناک چھاپہ مارا۔ اور اس کے بعد دشمن فوجیں حرکت میں آ گئیں اور اس گاؤں کے نرغے میں لے لیا جس میں درحقیقت کوئی سپاہی نہیں تھا۔ گاؤں کے تمام مکینوں کو بلایا گیا اور ان سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن کسی نے کچھ نہ بتایا۔ چند گھنٹے بعد ہیلی کوپٹر سے ایک فرانسیسی افسر آیا اور اس نے کہا ''اس گاؤں کے بارے میں میں بہت کچھ سنا گیا ہے، اسے تباہ کر ڈالو سپاہیوں نے گھروں کو آگ لگانی شروع کر دی اور عورتوں کو جو کپڑے لتے سمیٹنے اور کھانے پینے کی کچھ

چیزیں جمع کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بندوق کے کندے مار مار کر باہر دھکیل دیا گیا۔ چند کسان اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگ نکلے۔ افسر نے ان تمام لوگوں کو جو باقی رہ گئے تھے جمع کرنے کا حکم دیا اور انہیں قریب کی ایک نہر کے پاس لایا گیا جہاں قتل عام شروع ہوا۔ گولیوں کی ایک سیدھی باڑ میں ہی انتیس آدمی مار دیئے گئے۔ ''س'' کو دو گولیاں لگیں۔ ایک اس کی بائیں ران اور دوسری دائیں بازو سے گذر گئی، گولی کی ضرب نے اس کے بازو کی ہڈی کو توڑ دیا۔

''س'' بے ہوش ہو گیا اور جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو الجزائری محاذ آزادی کے ایک گروہ میں پایا۔ ہیلتھ سروس نے اس کا علاج کیا اور جس قدر جلد ممکن ہو سکتا تھا اس وہاں سے نکال لے گئی۔ راستے میں اس کا رویہ زیادہ سے زیادہ غیر معمولی ہوتا چلا گیا۔ اس بات نے اس کے محافظ دستے کو مسلسل فکرمند رکھا۔ باوجود اس کے کہ وہ بے بس تھا اور اسے فوجی تربیت مطلق نہ تھی اس نے ایک بندوق طلب کی اور کسی بھی دوسرے شخص کے آگے، خواہ وہ کوئی ہو، چلنے سے انکار کر دیا۔ کسی کے پیچھے چلنا اسے گوارا نہ تھا۔ ایک رات اس کے ہاتھ ایک سپاہی کی بندوق لگ گئی اور اس نے بڑے بے ہنگم طریقے سے سوئے ہوئے سپاہیوں پر گولی چلانے کی کوشش کی۔ اسے بڑی سختی کے ساتھ غیر مسلح کر دیا گیا اور اس کے بعد انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ باندھ دیئے اور اسی حالت میں وہ مرکز پہنچا۔

اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے یہ کہا کہ میں ابھی مرا نہیں ہوں اور میں نے لوگوں کے ساتھ بڑی عمدہ چال چلی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے ہم نے اس قتل کی کہانی بھی ترتیب دے لی جس کا وہ ارتقاب کرنا چاہتا تھا۔ ''س'' فکرمند نہ تھا۔ درحقیقت وہ غیر معمولی اضطراب میں مبتلا تھا جس کے ساتھ شدید ہیجانی دورے، اور چیخ پکار بھی تھی۔ اس نے کوئی خاص توڑ پھوڑ نہ کی مگر بڑ بڑ سے ہر شخص کو اکتا دیتا۔ اس کے ''ہر ایک کو قتل کر دینے'' کے اعلانیہ ارادے کی بنا پر پورے ادارے کو ہمہ وقت خبردار رہنا پڑتا۔ ہسپتال میں اپنے قیام کے دوران میں اس نے بعض اوزاروں کو بطور بندوق استعمال کر کے تقریباً آٹھ مریضوں پر حملہ کیا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی نہ چھوڑا۔ ہم حیران تھے کہ کہیں ہمیں مرگی کی ان چھپی ہوئی صورتوں میں سے ایک کا سامنا تو نہیں جس کی خاصیت وہ مکمل جارحیت ہوتی ہے جو تقریباً ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔

گہری نیند کا علاج آزمایا گیا۔ تیسرے دن کے بعد سے روزانہ کی ملاقات سے ہی یہ ممکن ہو سکا کہ

ہم مرض کی محرک قوتوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ مریض کا ذہنی الجھاؤ بتدریج ماند پڑتا گیا۔ یہاں اس کی گفتگو سے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

''خدا میرے ساتھ ہے ...لیکن وہ ان کے ساتھ یقیناً نہیں ہے جو مر چکے ہیں ...میری قسمت تو کمبخت بہت ہی اچھی ہے....زندگی میں قتل ہونے سے بچنے کے لئے قتل کرنا ہی پڑتا ہے...جب میں سوچتا ہوں کہ اس سارے معاملہ کے بارے میں کے بارے میں مجھ تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا...ہمارے درمیان فرانسیسی ہیں، وہ عربوں کا بھیس بدلے ہوئے ہیں۔ ان سب کو قتل کر دینا چاہئے۔ مجھے ایک مشین گن دو۔ یہ تمام نام نہاد الجزائری درحقیقت فرانسیسی ہیں...اور وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ جونہی میں سونا چاہتا ہوں وہ میرے کمرے میں آ جاتے ہیں۔ لیکن اب مجھے ان کے بارے میں سب کچھ علم ہے۔ ہر ایک مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں اپنی حفاظت کروں گا۔ میں ان سب کو قتل کر ڈالوں گا، ایک ایک کو۔ میں ایک ایک کر کے ان کا گلا کاٹوں گا اور ساتھ ہی تمہارا بھی۔ تم سب مجھے قتل کرنا چاہتے ہو لیکن تمہیں کوئی اور طریقہ کرنا چاہئے۔ میں جب تمہاری طرح ہو جاؤں تو تم سب کو مار ڈالوں گا۔ چھوٹوں کو، بڑوں کو، عورتوں کو، بچوں کو، کتوں کو، پرندوں کو گدھوں کو... ہر ایک مر جائے گا۔ اور تب میں چین کی نیند سو سکوں گا...''

اس نے یہ ساری گفتگو ٹوٹے ٹوٹے فقروں میں کی۔ مریض کا رویہ بدستور جارحانہ، مشکوک اور بے نیازانہ رہا۔

تین ہفتے بعد اس کی اضطرابی کیفیت ختم ہو گئی لیکن ایک خاص قسم کی کم گوئی اور تنہائی اختیار کرنے کے رجحان نے ہمارے اس خوف کے لئے جواز پیدا کر دیا کہ کہیں اس کی بیماری زیادہ خطرناک رخ نہ اختیار کر جائے۔ تاہم ایک ماہ بعد اس نے رخصت طلب کی تا کہ وہ اپنی اپاہجی کے مطابق کوئی کام سیکھ سکے۔ تب اسے قومی محاذ آزادی کے سماجی بہبود کے ادارے کے سپرد کر دیا گیا۔ ہم نے اسے چھ ماہ بعد بالکل ٹھیک حالت میں دیکھا۔

(ج) ایک انیس سالہ سابق طالب علم، الجزائری محاذ آزادی کا ایک سپاہی۔ مرکز میں پہنچنے سے چند ماہ پہلے ہی اس کی بیماری شروع ہو چکی تھی۔ وہ مخصوص شکل و شباہت کا حامل تھا، وہ بہت غمگین نظر آتا تھا، ہاتھ مسلسل گیلے رہتے اور ہونٹ مسلسل خشک۔ اس کا سینہ مسلسل آہیں بھرنے کے باعث ابھرا ہوا تھا۔ شدید بے خوابی کے شکار تھا۔ جب سے بیماری کا آغاز ہوا اس نے خودکشی کی دو کوششیں کی۔ گفتگو کے

دوران میں اس نے سنتے وقت تو ہماتی انداز اختیار کئے رکھا۔بعض اوقات اس کی نظریں چند ثانیوں کے لئے فضا میں کسی نقطے پر مرکوز ہو جاتیں اوراس کا چہرہ چمک اٹھتا۔اس سے دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا جیسے مریض کوئی کھیل دیکھ رہا ہو۔اس کے خیالات الجھے ہوئے تھے۔ایک خاص صورت حال جو نفسی طب میں ''روک'' کے نام سے مشہور ہے، جس میں ایک جملہ یا ایک اشارہ شروع ہوتا ہے اور پھر اچانک بغیر کسی ظاہری وجہ کے رک جاتا ہے۔لیکن ایک خاص عنصر کے سبب ہماری توجہ ایک خاص سمت میں مرکوز ہوئی۔ مریض نے اپنے خون کے بہہ جانے کے بارے میں باتیں کیں، اپنی شریانوں کے بارے میں جو خالی ہو رہی تھیں اور اپنے دل کے بارے میں جس کی ایک ڈھرکن غائب ہو جاتی تھی۔اس نے ہم سے زخم سے خون بند کرنے کی التجا کی اور یہ بھی درخواست کی کہ اسے ''خون چوسنے والی چڑیل'' سے بچایا جائے جو اسپتال کے احاطے کے اندر رہی ہے۔بعض اوقات وہ مزید کچھ نہ بول سکتا تو ہم سے پنسل مانگتا۔تب وہ لکھتا ''میری آواز ختم ہوگئی ہے، میری ساری زندگی ڈوبتی چلی جارہی ہے۔'' ''غیر تشخیص'' کی اس زندہ مثال نے ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کردیا کہ اس کی بیماری کی شدت ایک خطرناک حد پر پہنچ چکی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران میں متعدد بار مریض نے ہم سے ایک ایسی عورت کا تذکرہ کیا جو رات گئے اسے سزا دینے آتی ہے۔ پہلے ہی سے یہ جانتے ہوئے کہ اس کی ماں جسے وہ چاہتا تھا، مر چکی ہے اور کوئی بھی چیز اس کی جدائی کا زخم مندمل نہیں کرسکی۔(جب بھی ماں کا ذکر آتا، اس کی آواز ڈوب جاتی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے) میں نے تفتیش کو تصور مادر کی جانب لگا دیا۔جب میں نے اس سے اس عورت کا حلیہ بیان کرنے کے لئے کہا جو اس پر مسلط تھی بلکہ یوں کہیے کہ تشدد کرتی تھی تو اس نے اعلان کیا کہ وہ کوئی غیر شناسا عورت نہ تھی، وہ اسے اچھی طرح سے جانتا تھا اور اسی نے اسے قتل کیا تھا۔تب ہمارے سامنے یہ تھا، کہ کیا یہ معاملہ ماں کی موت کے بعد پیدا ہونے والے لاشعوری احساس جرم کا ہے، جیسا کہ فرائیڈ نے ''ماتم اور مالیخولیا'' میں بیان کیا ہے۔ہم نے مریض سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس عورت کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے کہا۔اس طرح سے ہم درج ذیل کہانی اخذ کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

میں مجاہدین میں شامل ہونے کے لئے اس شہر سے نکل پڑا جہاں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ چند ماہ بعد مجھے اپنے گھر والوں کے بارے میں اطلاعات ملیں۔میں نے سنا کہ ایک فرانسیسی سپاہی نے میری ماں کو گولی مار کر ہلاک کر ڈالا اور میری بہنوں میں سے دو کو اٹھا کر اپنے کواٹروں میں لے گئے۔اب تک مجھے

کچھ خبر نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کیا بیتی۔ماں کی موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔چند سال پہلے جب میرا باپ مرا تو میں اپنے کنبے میں اکیلا ہی مرد تھا اور میری تمام خواہش ہمیشہ یہی رہی کہ کسی طرح سے کچھ کر کے اپنی ماں اور اپنی بہنوں کے لئے زندگی کو بہتر بنا سکوں۔ایک بار ہم نو آباد کاروں کی ایک اسٹیٹ میں پہنچے جہاں کا سرگرام استعماریت پسند ایجنٹ پہلے ہی دو الجزائری شہریوں کو قتل کر چکا تھا۔ہم رات کے وقت اس کے گھر گئے لیکن وہ موجود نہ تھا۔محض اس کی بیوی گھر پر موجود تھی۔جب اس نے ہمیں دیکھا تو رونا شروع کر دیا اور ہم سے التجائیں کرنے لگی کہ ہم اسے قتل نہ کریں۔اس نے کہا''مجھے معلوم ہے تم میرے شوہر کو تلاش کرنے آتے ہو، لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔میں نے اسے بارہا منع کیا ہے کہ وہ کسی سیاسی سرگرمی میں حصہ نہ لے'' ہم نے اس کے شوہر کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے جب میں نے اس عورت کو دیکھا تو مجھے اپنی ماں کا خیال آ گیا۔وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کے خیالات کسی اور جگہ تھے۔میں حیران تھا کہ ہم نے اسے قتل کیوں نہیں کیا۔تب اچانک اس عورت نے محسوس کیا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔اس نے چلاتے ہوئے مجھے پکڑ لیا''خدارا مجھے قتل نہ کرو....میرے بچے ہیں۔'' دوسرے لمحے وہ مردہ پڑی تھی، میں نے اسے اپنے خنجر سے ہلاک کر ڈالا تھا۔میرے کمانڈر نے مجھے غیر مسلح کر کے چلے جانے کا حکم دیا۔چند روز بعد پلٹن کے کمانڈر نے مجھ سے پوچھ گچھ کی۔میں سمجھتا تھا کہ مجھے گولی ماردی جائے گی لیکن مجھے اس کی خاک پرواہ نہ تھی۔(25) اور تب مجھے کھانا کھانے کے بعد قے ہونی شروع ہوگئی اور نیند بھی خراب ہونے لگی۔اس کے بعد اس عورت نے ہر روز آ کر میرا خون طلب کرنا شروع کر دیا۔لیکن میری ماں کا خون....میری ماں کا خون کہاں گیا؟''

اس روز رات ہونے پر جب مریض سونے کے لئے گیا تو ہر شے کے باوجود اس کے کمرے پر عورتوں نے حملہ کر دیا۔یہ اسی ایک عورت کی مختلف النوع صورتیں تھیں۔ان میں سے ہر ایک کے پیٹ میں ایک کھلا زخم تھا۔وہ خون سے خالی، زرد اور بے حد دبلی تھیں۔وہ نوجوان مریض کے لئے عذاب بن گئیں۔انہوں نے اس سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کا بہا ہوا خون واپس لوٹائے۔اس لمحے بہتے ہوئے پانی کی آواز کمرے میں گونجنے لگی اور یہ آواز اس قدر تیز ہوگئی جیسے کوئی گرجدار آبشار بہہ رہا ہو اور مریض نے دیکھا کہ اس کے کمرے کا لکڑی کا فرش خون میں، اس کے اپنے خون میں تر بتر ہو گیا ہے، جب کہ عورتوں کا رنگ بتدریج بحال اور ان کا زخم مندمل ہو گیا۔مریض پسینے میں تر، شدید تکلیف کے ساتھ جاگ پڑا اور صبح

ہونے تک اعصابی ہیجان کی کیفیت میں مبتلا رہا۔

نوجوان مریض کا کئی ہفتوں تک علاج کیا جاتا رہا جس کے بعد اس کے ڈراؤنے خواب مکمل طور پر غائب ہو گئے۔ تاہم شخصیت میں ایک اہم کمی موجود رہی۔ جب بھی وہ اپنی ماں کے بارے میں سوچنا شروع کرتا تو وہ چاک پیٹ والی عورت خوفناک صورت لئے اس کے سامنے آجاتی۔ شاید یہ بات غیر سائنسی نظر آئے لیکن ہمارا خیال ہے کہ محض وقت ہی اس نوجوان کی منتشر شخصیت میں کچھ بہتری پیدا کر سکتا ہے۔

کیس نمبر 4:۔ ایک یو پی پولیس کا آدمی جو ذہنی اضمحلال کا شکار ہو کر اسپتال میں زیر علاج ہے، اور وہاں اپنے ظلم کے شکار محبّ وطن سے ملتا ہے جو سکتے کے مریض میں مبتلا ہے۔

''الف'' کی عمر اٹھائیس سال ہے، اس کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ کئی سال تک وہ اور اس کی بیوی دونوں زیر علاج رہے لیکن بدقسمتی سے بچہ پیدا کرنے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے افسروں نے اسے اس کے رویوں کے اختلال کے باعث ہمارے پاس بھیج دیا۔

ابتدائی ملاقات میں وہ کافی اچھا نظر آیا۔ مریض بڑی بے ساختگی سے ہمیں اپنی تکلیفیں، بتاتا رہا۔ بیوی اور سسرال والوں کے ساتھ اس کے تعلقات اطمینان بخش تھے۔ اسے تکلیف یہ تھی کہ رات کے وقت اسے چیخیں سنائی دیتیں جو اسے سونے نہ دیتی تھیں۔ اس نے بتایا کہ گذشتہ چند ہفتوں سے سونے سے پیشتر، باوجود اپنی بیوی کے احتجاج کے جو سر گرمی میں جل جاتی (یہ گرمیوں کے دن تھے) وہ کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتا ہے۔ مزید برآں وہ اپنے کانوں میں بھی روئی دے لیتا تا کہ سنائی دینے والی چیخیں مدھم پڑ جائیں۔ بعض اوقات آدھی رات کے وقت بلند آواز سے ریڈیو لگا دیتا یا کوئی موسیقی سننا شروع کرتا تا کہ وہ رات کے شور وغوغے کو نہ سن سکے۔ ہمیں بالتفصیل یہ ساری کہانی سنائی جو اسے ہراساں کئے ہوئے تھی۔

چند ماہ پہلے اس کا تبادلہ متحدہ محاذ آزادی کے خلاف لڑنے والے ایک بریگیڈ میں کر دیا گیا تھا۔ شروع میں اس کے ذمے چند قہوہ خانوں اور دکانوں کی دیکھ بھال تھی لیکن چند ہفتے بعد اس کی ذمہ داری صرف پولیس کے صدر دفتر میں کام کرنا ہی رہ گئی۔ یہاں اس کا واسطہ پوچھ گچھ کرنے سے پڑا جو 'مار پیٹ' کے بغیر کبھی نہیں ہوتی تھی۔ ''بات یہ تھی کہ وہ کبھی بھی کسی بات کا اقرار نہ کرتے تھے۔''

اس نے کہا ''بعض اوقات ہم یہ چاہتے تھے کہ ان سے کہہ دیں کہ اگر تمہیں ہمارا ذرا بھی لحاظ ہے تو جو کچھ جانتے ہو بتا دو بجائے اس کے کہ ہم اس بات پر مجبور ہوں کہ گھنٹوں صرف کر کے ایک لفظ اگلوائیں۔لیکن ان سے بات کرنا دیوار سے کلام کرنے کے مترادف تھا۔ وہ ہر سوال کے جواب میں بس یہ کہتے تھے ''مجھے نہیں معلوم۔'' اگر ہم یہ بھی پوچھتے کہ تمہارا نام کیا ہے؟ یا یہ کہ تم کہاں رہتے ہو؟ تو ان کا جواب یہی ہوتا کہ ''مجھے نہیں معلوم۔'' لہٰذا ظاہر ہے ہمیں سب کچھ کرنا ہی پڑتا۔لیکن وہ چیختے بہت تھے۔ شروع میں تو مجھے اس پر ہنسی آجایا کرتی۔لیکن بعد میں میں کچھ گھبرا گیا۔ آج کل میں کسی کی چیخ کی آواز سن کر آپ کو ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہوں کہ ہم پوچھ گچھ کی کس منزل تک پہنچے ہیں۔ دو گھونسے اور کنپٹی پر کمر کی پٹی ضربات کھانے کے بعد کسی شخص کے بولنے، چیختے اور بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ انہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ہلاک کئے جا رہے ہیں۔لیکن ہمیں انہیں ہلاک کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ہم تو محض اطلاعات اگلوانا چاہتے ہیں۔ جب ہمارا واسطہ ایسے سخت جانوں سے پڑتا ہے تو سب سے پہلے تو ہم انہیں چیخیں مارنے پر مجبور کرتے ہیں اور جلد یا بدیر ہم یہ کرا ہی لیتے ہیں۔ یہ بھی ہماری ایک فتح ہوتی ہے اس کے بعد ہم سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ یہ نہ بھولئے کہ ہم اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن وہ ہمارے لئے کام آسان نہیں ہونے دیتے۔ اب میں اس لئے آیا ہوں کہ مجھے ان کی چیخیں گھر پر بھی سنائی دیتی ہیں۔ خاص طور پر ان لوگوں کی چیخیں جو پولیس کے صدر دفتر ہی میں مر گئے۔ ڈاکٹر صاحب! میں تو اس کام سے اکتا چکا ہوں۔ اگر آپ میرا علاج کر دیں تو میں کوشش کروں گا کہ میرا تبادلہ فرانس کر دیا جائے اگر انہوں نے انکار کر دیا تو میں استعفیٰ دے دوں گا''

اس صورت حال میں میں نے اسے بیماری کی چھٹی لینے کا مشورہ دیا۔ چونکہ مریض نے ہسپتال میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا، میں نے نجی طور پر اس کا علاج کیا۔ ایک روز، اس کا علاج شروع ہونے سے عین پہلے مجھے اپنے شعبے سے ایک ضروری بلاوا آ گیا۔ جب ''الف'' میرے گھر پہنچا تو میری بیوی نے اسے میرا انتظار کرنے کے لئے کہا لیکن اس نے ہسپتال کے میدان میں چہل قدمی کرنے اور دوبارہ واپس آنے کو ترجیح دی۔ چند منٹ بعد جب میں گھر جا رہا تھا تو وہ مجھے راستے میں نظر آیا۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے، بے بسی کے عالم میں پسینے میں ڈوبا تھرتھرا رہا تھا۔ دراصل وہ ہیجانی صورت حال سے دوچار تھا۔ میں نے اسے اپنی کار میں بیٹھایا اور اپنے گھر لے گیا۔صوفے پر لیٹ اس نے مجھے بتایا کہ

وہ ہسپتال میں میرے ایک ایسے مریض سے ملا ہے جس سے پولیس کی بیرکوں میں پوچھ گچھ کی گئی تھی (یہ شخص ایک الجزائری حب الوطن تھا) اور جو ''صدمے کے باعث پیدا ہونے والے سکتے کے مرض'' کے سلسلے میں زیر علاج ہے۔ مجھے تب علم ہوا کہ اس پولیس والے نے میرے مریض کو اذیت دینے میں بڑا سر گرم حصہ لیا تھا۔ میں نے اسے چند سکون بخش گولیاں دیں جن سے ''الف'' کا ہیجان کم ہو گیا۔ جب وہ جا چکا تو میں ہسپتال کے اس وارڈ میں گیا جہاں اس محبّ وطن کی دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ وہاں کے ذمہ دار اشخاص نے تو کوئی خاص بات محسوس نہ کی لیکن وہ مریض غائب تھا۔ بالآخر وہ ہمیں ایک غسل خانہ میں مل گیا، جہاں وہ خودکشی کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اس پولیس والے کو پہچان لیا اور اپنے طور پر یہ سوچا کہ وہ اسے دوبارہ بیرکوں میں لے جانے کے لئے تلاش کرنا آیا ہے۔

بعد میں ''الف'' کئی مرتبہ مجھے ملنے آیا اور اپنی حالت خاصی بہتر ہو جانے پر، بر بنائے صحت فرانس واپس چلے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ جہاں تک الجزائری حب وطن کا تعلق ہے وہاں کے لوگوں کو اسے یہ سمجھانے میں کافی وقت صرف کرنا پڑا کہ یہ سب ایک واہمہ تھا، یہ کہ پولیس والوں کو ہسپتال کے اندر آنے کی اجازت ہی نہیں ہے، یہ کہ وہ تکان کا شکار ہے، اور یہ ہسپتال میں اس لئے ہے کہ اس کی باقاعدہ دیکھ بھال کی جائے۔

کیس نمبر 5:۔ ایک یورپی انسپکٹر جس نے اپنی بیوی اور بچوں کو اذیت دی۔

تیس سالہ (ا) اپنی مرضی سے ہم سے مشورہ لینے آیا۔ وہ ایک پولیس انسپکٹر تھا اور اس نے بتایا کہ کئی ہفتوں سے ''کام نہیں چل رہا تھا۔'' شادی شدہ تھا، تین بچے تھے۔ بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا، دن میں پانچ پیکٹ۔ بھوک مٹ چکی تھی اور اکثر ڈراؤنے خوابوں کی کوئی خاص نمایاں خصوصیت نہ تھی۔ جو چیز اسے سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی۔ وہ بقول اس کے ''دوانگی کا دور'' تھا۔ اول تو اسے یہ سخت ناپسند تھا کہ کوئی اس کی بات کاٹے۔

''ڈاکٹر کیا تم مجھے اس بات کی وجہ بتا سکتے ہو کہ جوں ہی کوئی شخص میری رائے کے خلاف جائے میرا جی اسے مارنے کو چاہتا ہے۔ ملازمت کے دائرے سے باہر بھی میں بلا سبب ان لوگوں کو سیدھا کر دینا چاہتا ہوں جو میری راہ میں راہ میں حائل ہوں۔ مثال کے طور پر میں اخبار خریدنے کے لئے دکان پر جاتا ہوں۔ وہاں بہت سے لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔ میں اپنا اخبار لینے کے لئے ہاتھ

آگے بڑھا تا ہوں (اخبار بیچنے والا میرا دوست ہے) قطار میں سے کوئی شخص مجھے گھورتا ہے اور کہتا ہے ''اپنی باری کا انتظار کرو'' بس پھر میں اسے پیٹنا چاہتا ہوں اور میں خود سے یہ کہتا ہوں ''میرے دوست اگر تم چند گھنٹوں کے لئے میرے ہتھے چڑھ جاؤ تو تم میں یہ تیزی نظر نہ آئے''

مریض کو شور سے نفرت ہے۔ گھر پر وہ ہمہ وقت ہر شخص کو پیٹنے پر تلا رہتا ہے وہ واقعی نہایت بے رحمی سے بچوں کی پٹائی کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے ڈیڑھ سال کے بچے کی بھی۔

لیکن جس چیز نے اسے حقیقتاً خوف زدہ کیا وہ یہ تھی کہ ایک شام کو جب اس کی بیوی نے بچوں کو بہت زیادہ مارنے پر نکتہ چینی کی، (اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''سچ کہتی ہوں، ہر کوئی یہی سمجھے گا کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔'') تو وہ اس پر جھپٹ پڑا، اسے پیٹا اور اپنے آپ سے یہ کہتے ہوئے اسے کرسی سے باندھ دیا کہ ''میں آج ہمیشہ کے لئے اسے یہ سبق سکھا دوں گا کہ اس گھر کا مالک میں ہوں''

خوش قسمتی سے اس کے بچوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ تب اسے اپنے برتاؤ کی شدید نوعیت کا احساس ہوا۔ اس نے بیوی کو کرسی سے کھولا اور اگلے روز کسی ڈاکٹر یا ''ماہر اعصاب'' سے مشورہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بتایا کہ ''پہلے ایسا نہ ہوتا تھا۔'' اس نے کہا کہ اس نے بچوں کو بہت کم سزا دی ہے اور بیوی سے تو کبھی بھی نہ لڑا تھا۔ یہ سلسلہ تو ''موجودہ ہنگاموں کے بعد سے'' شروع ہوا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ'' اس نے کہا ''آج کل ہمیں فوجیوں کی طرح کام کرنا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر گذشتہ ہفتے ہم نے اس طرح کام کیا گویا ہمارا تعلق بھی فوج سے ہو۔ حکومت کے معززین کا کہنا ہے کہ الجزائر میں جنگ نہیں ہو رہی اور قانون کے ہاتھوں کو جس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس کو، نظم وضبط بحال کرنا چاہئے۔ لیکن درحقیقت الجزائر میں جنگ ہو رہی ہے اور جب انہیں ہوش آئے گا تو بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ جو چیز میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے وہ اذیت رسانی ہے۔ آپ کو تو علم ہی نہیں کہ وہ ہے کیا، نہیں نا؟ بعض اوقات تو میں لوگوں کو مسلسل دس دس گھنٹے تک اذیت پہنچاتا ہوں......''

''جب تم اذیت دیتے ہو تو تم پر کیا گذرتی ہے؟''

''شاید آپ کو احساس نہ ہو سکے لیکن یہ بہت ہی بیزار کن ہے..... یہ درست ہے کہ ہم یہ کام باری باری کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کب دوسرے کو یہ کام سونپا جائے۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی لمحے بھی اسے معلومات مل جائیں گی اور یہ احتیاط کرتا ہے کہ جب اس نے بڑے

شاندار طریقے سے اسے پر چالیا ہے تو اب وہ چڑیا دوسرے کے پاس نہ چلی جائے کیونکہ ایسی صورت میں تو کامیابی کا سارا اعزاز اسے ہی مل جائے گا۔ لہٰذا بعض اوقات ہم انہیں دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں اور بعض اوقات نہیں کرتے۔

بعض اوقات ہم انہیں اپنی جیب سے رقم بھی دیتے ہیں تا کہ ان سے کچھ اگلوائیں۔ ہمارا مسئلہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے۔ کیا ہم اس شخص کو بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں؟ اسی پر ہمارا ذاتی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ ہمیں دوسروں کے ساتھ مقابلہ بھی تو کرنا پڑتا ہے۔ بالآخر ہمارے گھونسے بیکار ہو جاتے ہیں۔ تب ہم سینئر گالیوں کو بلاتے ہیں۔ لیکن وہ یا تو اس قدر زور سے مارتے ہیں کہ آدمی ختم ہو جاتا ہے اور یا پھر زیادہ نہیں مارتے اور اس کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوتا۔ دراصل اس طرح کے کام میں کامیابی کے لئے ذہانت سے کام لینا پڑتا ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کب شروع کرنا ہے اور کب ختم کرنا ہے۔ آپ کو اس کا بخوبی اندازہ ہونا چاہئے۔ جب وہ نرم پڑ جائے تو اسے مارے جانا بے کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو خود کام کرنا پڑتا ہے، اسی طور آپ بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کا کام کیسا چل رہا ہے۔ میں ان لوگوں کے خلاف ہوں جو اپنا کام دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں اور ہر گھنٹے بعض محض یہ دیکھنے آجاتے ہیں۔ کہ اب مجرم کس حالت میں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ اسے ہرگز یہ تاثر نہ دیں کہ وہ آپ کے ہاتھوں سے زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔ یوں کہ ایسی حالت میں وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر جان ہی نہیں بچنی ہے تو کچھ بتانے سے کیا فائدہ۔ اس صورت میں اس سے کچھ اگلوانے کی توقع بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی امید قائم رہنی چاہئے، امید ہی وہ چیز ہے جو اسے بلواتی ہے۔

لیکن اس سارے معاملے میں میرے لئے جو چیز سب سے زیادہ پریشانی کا سبب ہے وہ یہ معاملہ ہے جو میں نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا۔ یہ یقینی امر ہے کہ میرے ساتھ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ ڈاکٹر آپ کو مجھے ٹھیک کرنا ہوگا۔''

اس کے افسروں نے اسے بیماری کی رخصت دینے سے انکار کر دیا اور پھر مریض نفسی طب کے ماہر کا سٹرفکیٹ بھی نہ لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا ہم نے علاج شروع کیا جب کہ وہ حسب معمول کام کرتا رہا۔ اس قسم کے بندوبست میں جو خامیاں ہو سکتی ہیں ان کا تصور بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ اس شخص کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی بیماری کی براہ راست وجہ ان کمروں میں جاری رہنے والی پوچھ گچھ کی سرگرمی تھی گو

وہ اس کی تمام تر ذمہ داری ''موجودہ ہنگاموں'' پر ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ چونکہ اذیت رسانی کا کام بند کرنے کے لئے اس کے نزدیک کوئی راہ نہ تھی (اور یہ بات اس کے لئے فضول تھی کیونکہ اس صورت میں اسے استعفیٰ دینا پڑتا تھا) لہٰذا اس نے ادھر ادھر کی باتوں میں بے کار وقت ضائع کرنے کے بجائے اس نے مجھے سے براہ راست یہ درخواست کی کہ ضمیر کی چھبن اور رویوں کی الجھن کے بغیر مکمل سکون قلب کے ساتھ الجزائری محبان وطن کو اذیت کے کام میں میں اس کی مدد کروں۔(26)

سلسلہ ''ب''

یہاں ہم نے بعض ایسے کیس یا کیسوں کے مجموعے جمع کئے ہیں جن میں مرض کو جنم دینے والے واقعات اولاً مکمل جنگ کی وہ فضا جو پورے الجزائر پر چھائی ہوئی ہے۔

کیس نمبر 1:۔ تیرہ اور چودہ سال کے دو الجزائری لڑکوں کے ہاتھوں اپنے یورپی ہمجولی کا قتل۔

ایک قانونی مسئلے میں ہم سے ماہرانہ طبی رائے طلب کی گئی۔ تیرہ اور چودہ سال کے دو الجزائری لڑکوں پر، جو پرائمری مدرسے میں پڑھتے تھے، اپنے مدرسے کے ایک یورپی ساتھی کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ انہوں نے قتل کرنے اقرار کرلیا۔ جرم کی تفصیلات جمع کی گئیں اور تصاویر بھی ریکارڈ میں شامل ہوئیں جن میں ایک لڑکے نے یورپی لڑکے کو پکڑ رکھا تھا اور دوسرا اسے چاقو مارتا دکھایا گیا تھا۔ یہ ننھے مدعا علیہ اقبال جرم سے نہیں پھرے۔ ہماری ان کے ساتھ بڑی طویل گفتگو ہوئی۔ یہاں ہم ان کے بیان سے مخصوص اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

(الف) تیرہ سالہ لڑکا

''ہمارا اس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ تھا۔ ہر جمعرات ہم گاؤں سے اوپر پہاڑی پر جا کر اس کے ساتھ غلیل سے کھیلا کرتے تھے۔ وہ ہمارا بہت اچھا دوست تھا۔ اب وہ اسکول نہ جاتا تھا کیونکہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح معمار بننا چاہتا تھا۔ ایک روز ہم نے اسے مار ڈالنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یورپی بھی تو تمام عربوں کو مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہم بڑے لوگوں کو تو مار نہیں سکتے لیکن ہم اس طرح کے لڑکوں کو تو مار ہی سکتے تھے کیونکہ وہ بھی ہماری ہی عمر کا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم اسے کس طرح ماریں۔ ہم اسے کھائی میں

دھکیل دیتے مگر اس سے تو وہ صرف زخمی ہی ہوتا اس لئے ہم نے گھر سے چاقو لا کر اسے مار ڈالا‘‘

’’لیکن تم نے اسے ہی کیوں چنا؟‘‘

’’کیونکہ وہ ہمارے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ کوئی دوسرا لڑکا ہمارے ساتھ پہاڑی پر نہ جاتا۔‘‘

’’باوجود اس کے کہ وہ تمہارا دوست تھا؟‘‘

’’اچھا تو پھر وہ ہمیں کیوں مار ڈالنا چاہتے ہیں؟ اس کا باپ رضا کار فوج میں ہے اور اس نے کہا تھا کہ ہماری گردنیں کاٹ دینی چاہیں۔‘‘

’’لیکن اس نے تو تمہیں کچھ نہیں کہا تھا؟‘‘

’’اس نے؟ نہیں۔‘‘

’’تمہیں معلوم ہے اب وہ مر چکا ہے‘‘۔

’’ہاں۔‘‘

’’مر جانے کا مطلب کیا ہوتا ہے‘‘

’’جب یہاں ہر چیز ختم ہو جائے اور اگلے جہان میں چلے جائیں۔‘‘

’’کیا تم نے ہی اسے مارا؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’کیا قتل تمہارے لئے باعث پریشانی نہیں؟‘‘

’’نہیں، کیونکہ وہ بھی تو ہمیں مار دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے....‘‘

’’کیا تم جیل جانے کو برا سمجھتے ہو‘‘

’’نہیں۔‘‘

(ب) چودہ سالہ لڑکا

یہ تھا مدعا علیہ اپنے اسکول کے ساتھی سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ابھی سے تقریباً بالغ آدمی نظر آتا تھا اور اپنے بازوؤں کی طاقت، شکل وشباہت اور اپنے جوابات کی نوعیت کے اعتبار سے بالغ تھا۔ اس نے بھی قتل سے انکار نہیں کیا۔ اس نے قتل کیوں کیا؟ اس نے اس سوال کا جواب نہ دیا بلکہ مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے کبھی کسی یورپی کو جیل میں دیکھا ہے۔ کیا کبھی کوئی یورپی بھی کسی الجزائری کے قتل کے بعد گرفتار

ہو کر جیل پہنچا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے واقعی کبھی کسی یورپی کو جیل میں نہیں دیکھا۔

''اوراس کے باوجود ہر روز الجزائری قتل ہوتے ہیں، نہیں ہوتے کیا؟''

''ہاں ہوتے ہیں۔''

''تو پھر صرف الجزائری ہی جیل میں کیوں نظر آتے ہیں؟ آپ مجھے اس کی وجہ بتا سکتے ہیں؟''

''نہیں۔لیکن تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اس لڑکے کو جو تمہارا دوست تھا، قتل کیوں کیا؟''

''میں آپ کو بتاتا ہوں کیوں۔آپ نے رواط کا قصہ سنا ہے؟''(27)

''ہاں''

''اس میں میرے گھر کے دوافراد مارے گئے تھے۔گھر والے کہتے تھے کہ فرانسیسیوں نے ہم سب کوایک ایک کر کے قتل کر ڈالنے کی قسم کھائی ہے۔تو کیا انہوں نے ان تمام الجزائریوں کے لئے جو وہاں قتل ہوئے کسی ایک فرانسیسی کو بھی گرفتار کیا؟''

''مجھے علم نہیں۔''

''خیر۔ایک شخص بھی گرفتار نہیں ہوا۔میں پہاڑوں پر جانا چاہتا تھا لیکن میں بہت چھوٹا تھا۔ لہٰذا میں نے اور ''ک'' نے مل کر سوچا کہ ہم ایک یورپی کو قتل کریں۔''

''کیوں؟''

''تو آپ کے خیال میں کیا کرنا چاہئے تھا؟''

''میں کہہ نہیں سکتا۔لیکن تم تو بچے ہو اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو بڑوں کا معاملہ ہے۔''

''لیکن وہ تو بچوں کو بھی قتل کرتے ہیں.....''

''لیکن یہ تو دوست کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوئی۔''

''خیر قتل اسے میں نے کر دیا ہے۔اب آپ جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں۔''

''کیا تمہارے دوست نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''اچھا؟''

''اچھا تو بس پھر یہی بات ہے.....''

کیس نمبر 2:۔ ایک بائیس سالہ الجزائری نوجوان میں احساس جرم سے پیدا شدہ ہذیانی کیفیت اور خودکشی کا میلان جس نے ''دہشت پسند سرگرمی'' کی شکل اختیار کی۔

فرانسیسی عدالتی حکام نے یہ مریض ہمیں ہسپتال میں بھیجا۔ یہ قدم الجزائر میں کام کرنے والے فرانسیسی ماہرین نفس طب کے طبی وقانونی مشورے پر اٹھایا گیا۔ مکمل غیر متوازن ذہنی کیفیت میں مبتلا یہ مریض سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے۔ اس کا جسم خراشوں سے بھرا ہوا تھا اور جبڑے کی دو ہڈیوں کے ٹوٹ جانے کے سبب خوراک کا حلق میں جانا ناممکن تھا۔ اس لئے دو ہفتوں سے زیادہ عرصے سے اسے مختلف ٹیکوں کی مدد سے خوراک بہم پہنچائی جا رہی تھی۔

دو ہفتے بعد اس کے ذہن کا خلا کچھ کم ہوا تو ہم اس سے رابطہ قائم کر سکے اور ہم نے اس نوجوان کی ڈرامائی کہانی کو ترتیب دے لیا۔

لڑکپن میں ہو بے حد اشتیاق کے ساتھ سکاؤٹنگ میں شامل ہوا۔ اس کا شمار مسلم سکاوٹ تحریک کے قائدین میں ہونے لگا۔ لیکن انیس برس کی عمر میں اس نے اپنے پیشے کے علاوہ تمام مصروفیات ختم کر دینے کے لئے سکاؤٹنگ کو مکمل طور پر ترک کر دیا۔ وہ متعدد نقول تیار کرنے والی مشینیں بناتا تھا۔ اس نے سخت محنت کی اور اپنے پیشے میں بہت بڑا ماہر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ پہلی نومبر 1954 کو وہ محض اپنے پیشہ ورانہ مسائل میں منہمک تھا۔ اس وقت اس نے قومی جدوجہد میں کسی دلچسپی کا مطلق اظہار نہ کیا۔ وہ پہلے ہی سے اپنے پرانے ملنے والوں کی صحبت ترک کر چکا تھا۔ اس نے اپنے بارے میں خود یہ کہا کہ ''وہ اس دور میں اپنی فنی استعداد بڑھانے پر تلا ہوا تھا''

''تاہم 1955 کے وسط میں، جب وہ اپنے کنبے کے ساتھ ایک شام گذار رہا تھا تو اچانک اسے یہ تاثر ملا کہ اس کے والدین اسے غدار سمجھتے ہیں۔ چند روز بعد یہ اڑتا ہوا تاثر محو ہو گیا لیکن اس کے ذہن کی تہہ میں ایک اندیشہ قائم رہا، ایک طرح کی بے اطمینانی جسے وہ سمجھ نہ پایا۔

اس بنا پر اس نے جلد از جلد اپنا کھانا کھا لینے، کنبے کے حلقے سے الگ رہنے اور اپنے کو کمرے میں بند رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ہر قسم کے رابطوں سے گریز کرنے لگا.... اس قسم کے حالات تھے کہ آفت درمیان میں کود پڑی۔ ایک روز تقریباً ساڑھے بارہ بجے کے قریب عین بازار کے بیچ اسے ایک صاف آواز سنائی دی جو اسے بزدل کہہ کر پکار رہی تھی۔ وہ پیچھے مڑا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر

لی اور فیصلہ کر لیا کہ اب سے وہ کام پر نہ جائے گا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی پڑا رہا اور کھانا بھی نہ کھایا۔ رات کے وقت وہ پھر ذہنی بحران سے دو چار ہوا۔ تین گھنٹے تک اسے رات کی تاریکی میں ہر قسم کی ہتک آمیز باتیں سنائی دیتی رہیں اور اس کے ذہن میں یہ آواز گونجتی رہی۔ غدار، غدار، بزدل.... تمہارے سب بھائی شہید ہو رہے ہیں.... غدار، غدار....''

اسے نا قابل بیان اضطراب نے گھیر لیا۔ ''اٹھارہ گھنٹے تک میرا دل 130 دھڑکنیں فی منٹ کی رفتار سے چلتا رہا۔ میں نے سوچا کہ میں مرنے والا ہوں۔''

اس کے بعد سے مریض ایک لقمہ بھی نہ نگل سکا۔ وہ دیکھتے دیکھتے دبلا ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنے آپ کو مکمل تاریکی میں بند کر لیا اور اپنے والدین کے لئے بھی دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ تیسرے روز سے اس نے نماز میں پناہ لی۔ اس نے بتایا کہ وہ ہر روز سترہ سے اٹھارہ گھنٹے تک مسلسل سجدے میں جھکا رہتا۔ چوتھے روز ''ایک دیوانے کی طرح'' لہر میں آ کر ''بڑی ہوئی داڑھی کے ساتھ جو اس کی دیوانگی کی نمائش کے لئے کافی تھی۔'' کوٹ یا ٹائی پہنے بغیر وہ باہر نکل آیا۔ ایک بار سڑک پر آ نکلا تو سمجھ نہ آیا کہ کہاں جائے لیکن اس نے چلنا شروع کر دیا۔ اور تھوڑی دیر بعد اپنے آپ کو شہر کے یورپی مرکز میں پایا۔ شاید اس کی شکل وصورت نے (وہ شکل وصورت سے یورپی لگتا تھا) اسے پولیس کے گشتی دستوں کی باز پرس سے بچائے رکھا۔

اس کے برعکس، اس کے علاوہ دوسرے الجزائری مرد اور عورتیں گرفتار کئے جاتے، ان کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا، توہین کی جاتی اور تلاشی لی جاتی۔ متناقص طور پر اس کے پاس کوئی کاغذات بھی نہ تھے۔ اس کے لئے دشمن کے دستوں کا یہ غیر متوقع لحاظ اس کے وہم کو تقویت دے رہا ہے کہ ''ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ فرانسیسیوں کے ساتھ ہے۔ حتیٰ کہ سپاہیوں کو بھی حکم ملا ہوا اور وہ بھی اسے کچھ نہیں کہتے۔''

پھر ان گرفتار شدہ الجزائریوں کی نظریں بھی، جن کے ہاتھ گردنوں کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور جو اپنی تلاشی کے منتظر تھے، اسے نفرت سے بھری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ شدید ہیجانی صورت حال میں وہ تیزی سے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس لمحے وہ ایک عمارت کے سامنے پہنچا جو فرانسیسی سٹاف صدر دفتر تھی۔ پھاٹک پر کئی سپاہی مشین گنیں لیے کھڑے تھے۔ وہ سپاہیوں کی طرف گیا، ان میں سے ایک پر جھپٹا اور یہ چلاتے ہوئے کہ ''میں الجزائری ہوں'' اس کی مشین گن چھینٹے کی کوشش کی۔

فوراً ہی اسے قابو میں کرلیا گیا اور پولیس کے پاس لایا گیا جہاں انہوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے افسروں کے نام بتائے اور اس سازشی جال کے مختلف اراکین کے نام بھی بتائے جس سے (ان کے مفروضے کے مطابق) وہ منسلک تھا۔ چند روز بعد پولیس اور فوجیوں کو احساس ہوا کہ ان کا واسطہ ایک بیمار آدمی سے پڑ گیا ہے۔ ایک ماہر سے مشورہ لیا گیا جس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ ذہنی مرض میں مبتلا ہے اور اسے ہسپتال بھیج دینا چاہئے۔ اس نے بتایا کہ ''میں صرف مرنا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ پولیس کی بیرکوں میں بھی میں نے یہی سوچا اور توقع کی کہ جب وہ اذیت پہنچا چکیں گے تو پھر وہ مجھے ہلاک کرڈالیں گے۔ میں مار کھا کر خوش تھا۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اب میں خاموشی سے بلا کچھ کئے وہ الزام دینے والی آوازیں نہیں سن سکتا تھا میں بزدل نہیں ہوں۔ میں عورت نہیں ہوں۔ میں غدار نہیں ہوں۔''(28)

کیس نمبر 3:۔ ایک فرانسیسی عورت جس کا باپ بلند مرتبے پر فائز سرکاری افسر اچانک ایک گھات میں مارا گیا۔

یہ لڑکی، اکیس سالہ طالبہ، اضطرابی الجھن کی بعض معمولی علامتوں کے سلسلے میں ہم سے مشورہ لینے آئی جو اس کی تعلیم اور اس کے سماجی تعلقات میں حارج ہو رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ مسلسل گیلے رہتے، بعض اوقات جب ان میں سے پسینہ بہہ ''نکلتا'' تو وہ بڑی پریشان کن علامت بن جاتے۔ رات کے وقت دردسر کے ساتھ سینہ بھی جکڑ جاتا۔ وہ اپنے ناخن کاٹتی رہتی۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ نمایاں تھی وہ رابطہ قائم کرنے میں غیر معمولی آسانی تھی، رابطہ جو بلاشبہ بہت ہی تیزی سے قائم ہو گیا۔ گو ظاہری رسائی کے نیچے شدید فکرمندی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ مریضہ نے باپ کی موت کا ذکر جو اگر تاریخ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو حال ہی میں واقع ہوئی تھی، اتنی رواداری میں کیا کہ ہم نے فوراً اپنی تفتیش کا رخ باپ سے تعلقات کی جانب موڑ دیا۔ وہ بیان جو اس نے ہمیں دیا صاف اور بے حد واضح تھا، ایک ایسی وضاحت جو بے حسی کی حدوں کو چھوتی تھی اور جس نے بعد میں، صرف اپنی عقلیت کی بنا پر لڑکی کے اضطراب اور اس کی الجھن کی ماہیت اور بنیاد کو ظاہر کیا۔

''میرا باپ اعلیٰ عہدے پر فائز ایک سرکاری افسر تھا۔ وہ ایک بہت بڑے دیہاتی علاقے کا ذمہ دار تھا۔ جونہی ہنگاموں کا آغاز ہوا اس نے دیوانہ وار طیش کے ساتھ خود کو الجزائری عوام کے شکار پر لگا

دیا۔ وہ بغاوت کچلنے کے سلسلے میں اتنا بے تاب تھا کہ اکثر نہ کچھ کھاتا اور نہ ہی سوتا۔ میں اپنے باپ کی اس بتدریج کایا پلٹ کو بے بسی سے دیکھا کرتی۔ بالاخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس سے ملنے نہ جایا کروں گی بلکہ شہر میں ہی مقیم رہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی بھی میں گھر گئی میں نے تمام راتیں جاگتے گذاریں کیونکہ نیچے سے چیخوں کی آوازیں سننا کس قدر بھیانک بات ہے۔ بعض اوقات میں حیران ہوا کرتی تھی کہ اذیت تو درکنار کوئی انسان تکلیف سے نکلنے والی ان چیخوں کو کس طرح برداشت کرسکتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ پھر میں گھر کبھی نہیں گئی۔ شاذ نادر جب میرا باپ مجھ سے ملنے شہر آیا تو میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے بہت زیادہ خوف اور پریشانی محسوس کرتی۔ اب میرے لئے اسے پیار کرنا بہت تکلیف دہ امر تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ میں نے گاؤں میں ایک طویل مدت گذاری تھی۔ اور وہاں کے رہنے والے تقریباً تمام گھرانوں کا جانتی تھی۔ میں اور میری عمر کے الجزائری لڑکے، جب ہم چھوٹے تھے تو اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ جب کبھی بھی میں گھر جاتی تو میرا باپ مجھے بتاتا کہ نئے لوگ گرفتار کئے گئے ہیں۔ آخر میں تو مجھے اتنی جرات بھی نہ ہوتی باہر نکلوں۔ مجھے یقین تھا کہ ہر جگہ مجھے نفرت سے دیکھا جائے گا۔ اپنے دل میں میں یہ چاہتی تھی کہ الجزائری حق پر ہیں۔ اگر میں الجزائری لڑکی ہوتی تو میں بھی مجاہدین میں شامل ہوگئی ہوتی''

ایک روز اسے ایک تار ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کا باپ شدید زخمی ہوگیا ہے۔ وہ ہسپتال گئی اور اپنے باپ کو بے ہوش پایا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ مر گیا۔ جب وہ فوج کے ایک حصے کے ساتھ دیکھ بھال کرنے کی مہم پر تھا تو زخمی ہوا۔ اس کا گشتی دستہ الجزائری فوج کی لگائی ہوئی ایک گھات کے ہتھے چڑھ گیا۔

اس نے مزید کہا ''تجہیز و تکفین نے مجھے بہت بیزار کیا۔ وہ تمام افسران جو میرے باپ کی موت پر رونے آئے تھے جس کی ''اعلیٰ اخلاقی خوبیوں نے مقامی باشندوں کا دل موہ لیا تھا۔'' مجھے بہت برے لگے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے۔ وہاں ایک فرد بھی ایسا نہ تھا، جسے علم نہ ہو کہ اس علاقے کے باز پرس کے تمام مراکز میرے باپ کی نگرانی میں تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اذیت رسانی کی وجہ سے اموات دن میں دس دس تک پہنچ گئی تھیں اور اب وہ میرے باپ کے ایثار، اس کی قربانیوں اور اس کی حب الوطنی وغیرہ کے بارے میں جھوٹ بولنے آئے تھے۔ مجھے یہ کہنا چاہئے کہ یہ الفاظ میرے لئے اب

کوئی معنی نہیں رکھتے۔ بہرطور پر ان میں شاید ہی کوئی معنی ہو اس کے بعد میں سیدھی شہر چلی گئی اور تمام حکام سے ملنے سے احتراز کرتی رہی۔ انہوں نے مجھے الاؤنس دینے کی پیش کش کی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ مجھے ان کی دولت نہیں چاہئے تھی۔ یہ اس خون کی قیمت تھی۔ جو میرے باپ نے بہایا تھا۔ مجھے یہ نہیں چاہئے میں خود کام کروں گی۔''

کیس نمبر 4:۔ دس برس سے کم عمر کے بچوں میں کرداری اختلال۔

یہ بچے پناہ گزین تھے، فرانسیسیوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے مجاہدین یا شہریوں کے بچے۔ انہیں تیونس اور مراکش کے مختلف مراکز میں بھیجا گیا۔ یہ بچے اسکولوں میں داخل کئے گئے اور ان کے لئے کھیلوں اور سیر و تفریح کا بندوبست کیا گیا۔ ڈاکٹر باقاعدگی سے ان کا معائنہ کیا کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان میں سے بعض کو دیکھنے کا موقع ملا۔

(الف) ان مختلف بچوں میں سے ہر ایک میں تصور والدین کے لئے ایک بہت نمایاں محبت موجود ہے۔ ہر اس چیز کو جس کی ماں سے یا باپ سے مشابہت ہو، یہ بچے بڑی ہی شدت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے جذبے کے ساتھ اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

(ب) بالعموم ان سب کو آواز کا خوف لاحق ہے اور یہ ان نمایاں حد تک ہے۔ یہ بچے ڈانٹ ڈپٹ سے بہت زیادہ تاثر لیتے ہیں۔ سکون اور شفقت کے بہت بھوکے ہیں۔

(ج) ان میں سے متعدد بے خوابی اور نیند میں چلنے کے مرض میں مبتلا ہیں۔

(د) گاہے گاہے سوتے میں بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔

(ھ) اذیت پسندر رجحانات۔ ان کا ایک عام کھیل کاغذ پھیلا کر اس میں تیزی سے سوراخ کرنا ہے۔ تکلیف دہ باقاعدگی کے ساتھ ان کی پنسلیں چبائی ہوئی اور ان کے ناخن دانتوں سے کترے ہوئے ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر گہری محبت کے باوجود وہ اکثر آپس میں لڑتے ہیں۔

کیس نمبر 5:۔ پناہ گزینوں میں زچگی ذہنی اختلال۔

''زچگی ذہنی اختلال'' کا نام ان ذہنی امراض کو دیا جاتا ہے جو عورتوں میں بچے کی پیدائش کے قریب پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے امراض بچے کی پیدائش سے کچھ پہلے یا کئی ہفتوں بعد بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایسی بیماریوں کی وجوہات بہت پیچیدہ ہوتی ہیں۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ بنیادی سبب رطوبتی غدودوں

کے فعل میں کوئی خرابی اور کسی ''جذباتی دھچکے'' کا وجود ہوتا ہے۔ موخر الذکر عنوان گومبہم ہے لیکن اس کی ذیل میں وہ چیز بھی آجاتی ہے جسے لوگ ''شدید جذبہ'' کہتے ہیں۔

جب سے فرانسیسی حکومت سینکڑوں میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی زمین کو نذر آتش کرنے کی نئی حکمت پر عمل درآمد شروع کیا ہے۔ تیونس اور مراکش کی سرحد پر تین لاکھ پناہ گزین ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔ وہ جس تباہ حالی کا شکار ہیں اس کا سب کو علم ہے۔ عالمی صلیب احمر کمیٹیاں بار بار ان جگہوں پر گئی ہیں اور بے حد غربت اور بدحالی کے مظاہر دیکھنے کے بعد انہوں نے عالمی تنظیموں سے ان پناہ گزینوں کی امداد میں اضافہ کرنے کی سفارش کی ہے۔ لہٰذا خوراک کی کمی کو دیکھتے ہوئے جوان کیمپوں میں عام ہے یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہاں کی حاملہ عورتوں میں ''زچگی ذہنی اختلال'' کے زیادہ ہی امکانات ہوں گے۔

مستقل عدم تحفظ کی اس فضا کو جس میں یہ پناہ گزیں زندہ ہیں، ''تعاقب اور گرفتاری کے حق'' کو استعمال کرتے ہوئے، فرانسیسی فوجوں کے اکثر حملے، ادھر اسے بمباری اور گولے باری مسلسل قائم رکھتی ہے۔ سبھی کو علم ہے تیونسی اور مراکش علاقوں پر فرانسیسی فوج کی بمباری کے سلسلے میں کہ اس کی تباہی کی سب بڑی مثال تیونس کی ساقیت سیدی یوسف تھا، اب مزید کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور اس کے ساتھ ہجرت کے نتیجہ کے طور پر گھروں کی تباہی بھی اپنی طرف کوئی مزید توجہ مرکوز نہیں کرتی۔ سچ پوچھئے تو بہت کم ہی ایسی الجزائری عورتیں ہوں گی جوان حالات میں بچے جنتی ہوں اور ذہنی امراض میں مبتلا نہ ہوتی ہوں۔

یہ امراض مختلف صورتیں اختیار کرنے میں۔ بعض اوقات یہ ہیجانی کیفیات میں نمایاں ہوتے ہیں جو بعد میں غضبناکی میں بدل جاتی ہیں۔ بعض اوقات گہرا اضمحلال اور قت بخش بے حسی پیدا ہو جاتی ہے جس کے ساتھ خودکشی کی کوشش شامل ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات ایسی اضطرابی کیفیات پیدا ہوتی ہیں جن میں اشکباری، آہ و بکا اور رحم کی فریادیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح سے واہمے بھی جو صورتیں اختیار کرتے ہیں وہ بھی متعدد ار متنوع ہوتی ہیں۔ ہمیں کسی فرانسیسی کے بارے میں یہ واہمہ بھی نظر آسکتا ہے کہ وہ نوزائیدہ بچے کو یا اس بچے کو جو ابھی پیدا نہیں ہوا قتل کر دینا چاہتا ہے۔ یا پھر ماں کو اپنی فوری موت کا تاثر ہوتا ہے۔ اس حالت میں وہ نظروں سے غائب جلاد سے اپنے بچے کی زندگی کی بھیک مانگتی ہے۔

یہاں ہمیں ایک بار پھر اس بات کی وضاحت کرنی چاہئے کہ امراض کی مراجعت کروانے اور انہیں ٹھنڈا کر دینے سے اس مسائل کی بنیادی نوعیت ختم نہیں ہو جاتی۔ ان مریضوں کے حالات جو صحت پا

چکے ہیں، قائم رہتے ہیں اوران کی مریضانہ گتھیوں کی پرورش کرتے رہتے ہیں۔

سلسلہ ''ج''

اذیت کے بعد جذباتی وذہنی تبدیلیاں اور ذہنی امراض

اس سلسلے میں ہم خاصی تشویشناک حالت والے ان مریضوں کو اکٹھا کریں گے، جن کے امراض اذیت کے دوران میں یا فوراًبعد نمودار ہوئے۔ہم اس زمرے میں مختلف النوع خصوصیات کے مریضوں کوشامل کریں گے۔اس لئے کہ ہمارا خیال ہے کہ مرض کی مختلف خصوصیات، اذیت رسانی کے مختلف طریقوں کے مطابق ہوتی ہیں اوران کا شخصیت پرمرتسم شدہ برے اثرات سے،خواہ وہ نمایاں ہوں یا پوشیدہ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

پہلی قسم:۔ بلاامتیاز نام نہاد انسدادی اذیت کے بعد۔

یہاں ہمارا اشارہ ان وحشیانہ طریقوں کی طرف ہے جن کا مقصد حقیقی اذیت دینے کی بجائے محض قیدیوں کو بولنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں یہ اصول خاص اہمیت کا حامل ہے کہ ایک خاص حد کے بعد تکلیف نا قابل برداشت ہوجاتی ہے،مقصد یہ ہوتا ہے کہ جلد سے جلد قیدی کو اس حد پر لے آیا جائے۔ کوئی تکلف یا تصنع نہیں برتا جاتا۔ایک اجتماعی حملہ ہوتا ہے۔جوکئی صورتیں اختیار کرسکتا ہے،متعدد پولیس والے ایک قیدی کوایک ساتھ مارتے ہیں۔چار سپاہی قیدی کو درمیان میں کھڑا کرکے آگے پیچھے ہر طرف مارتے ہیں، جب کہ ایک اوراس کی چھاتی کوسگریٹ سے جلاتا ہے اور ایک دوسرا اس کے پاؤں کے تلوؤں پر چھڑی مارتا ہے۔الجزائر میں استعمال ہونے والے اذیت کے طریقوں میں سے بعض ہمیں خاص طور پر بہت ظالمانہ نظر آتے ہیں۔ان لوگوں کے بتائے ہوئے حالات کو جنہوں نے اذیتیں سہی ہیں، یہاں حوالے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

(الف) منہ کے راستے پانی کی پچکاری سے پانی داخل کرنا اوراس کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ دباؤ کے ساتھ صابن والے پانی سے حقنہ دینا۔(29)

(ب) مقعد میں بوتل کا دخول۔

دو طرح کی اذیتیں جنہیں ''بے حرکت اذیت'' کا نام دیا جاتا ہے۔

(ج) قیدی کو، اس کے ہاتھ زمین کے متوازی کر کے، گھٹنوں کے بل کھڑا کر دیا جاتا ہے، اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں اوپر کی طرف اور اس کی کمر اور سر سیدھا رکھا جاتا ہے۔ حرکت کرنے کی ذرا بھی اجازت نہیں دی جاتی۔ قیدی کے پیچھے ایک پولیس والا کرسی پر بیٹھا ہنٹر مار مار کر اسے حرکت کرنے سے باز رکھتا ہے۔

(د) قیدی کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کیا جاتا ہے، بازو اوپر اٹھے ہوئے اور ہتھیلیاں دیوار کی طرف یہاں بھی اگر وہ ذرا حرکت کرے یا ذرا بھی ڈھیلا پڑے تو پٹائی شروع ہو جاتی ہے۔

اب ہم یہ کہتے چلیں کہ دو قسم کے لوگوں کو اذیت دی جاتی ہے۔

(الف) وہ جو کچھ جانتے ہیں۔

(ب) وہ جو کچھ بھی نہیں جانتے۔

الف وہ لوگ جو کچھ جانتے ہیں بہت کم ہی ہسپتال میں پہنچتے ہیں۔ غالباً یہ تو سب لوگوں کو ہی معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی جیل میں فلاں اور فلاں کو اذیت دی گئی لیکن اس سے مریض کے طور پر ملاقات کبھی نہیں ہوتی۔(30)

(ب) اس کے برعکس وہ جو کچھ نہیں جانتے اکثر ہم سے مشورہ لینے آتے ہیں۔ یہاں ہم ان الجزائریوں کا ذکر نہیں کر رہے جنہیں عام گرفتاری میں پکڑا جاتا ہے، وہ بھی ہمارے پاس مریض بن کر نہیں آتے۔ ہم خاص طور پر ان الجزائریوں کا ذکر کر رہے ہیں جن کا کسی تنظیم سے تعلق نہیں ہوتا اور جنہیں گرفتار کر کے اذیت کے لئے پولیس کے دفتر میں یا ان مقامات پر لایا جاتا ہے جہاں باز پرس کے مراکز قائم ہیں۔(31)

نفسی طب کے کیسوں کی علامتیں جو سامنے آئیں:

(الف) ہیجان آمیز اعصابی اضمحلال۔ چار کیس۔

یہ وہ مریض ہیں جو فی الحقیقت کسی اضطراب کے بغیر غمگین رہتے ہیں۔ وہ مضمحل رہتے ہیں اور اکثر بستر پر دراز ہوتے ہیں، وہ رابطے سے پرہیز کرتے ہیں اور کسی لمحے بھی اچانک ایسے شدید ہیجان میں مبتلا ہو سکتے ہیں جس کی اہمیت سمجھنا ہمیشہ مشکل ہوتی ہے۔

(ب) ذہنی وجوہات کی بنا پر بھوک کا اڑ جانا.... پانچ کیس۔

یہ مریض بے حد مشکل پیدا کرتے ہیں، کیونکہ ہر ذہنی عدم اشتہا کے ساتھ دوسرے شخص سے جسمانی اتصال کا خوف بھی منسلک ہوتا ہے۔ نرس کو جو مریض کے قریب آ کر اسے چھونے کی کوشش کرتی یا اس کا ہاتھ تھامنا چاہتی ہے مریض فوراً دھکیل کر پیچھے کر دیتا ہے۔ مصنوعی طور پر خوراک دینا یا دوا پلانا ممکن ہی نہیں ہے۔(32)

(ج) حرکی عدم توازن.... گیارہ کیس۔

یہاں ہمارا سابقہ ان مریضوں سے پڑتا ہے جو حالت سکون میں نہیں رہ سکتے۔ وہ تنہا رہنے پر اصرار کرتے ہیں اور انہیں اس بات پر تیار کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کے کمرے میں بند ہوں۔

اذیت زدہ لوگوں کی پہلی قسم میں ہمیں وہ احساس زیادہ نظر آتے ہیں

پہلا یہ کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ دن رات کی بلا سبب اذیت ان لوگوں میں کسی شے کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ان اذیت زدگان میں سے خاص طور پر ایک کو زیادہ تکلیف دہ تجربہ ہوا تھا۔ کئی روز تک بیکار کی اذیت دینے کے بعد پولیس کو احساس ہوا کہ ان کا واسطہ ایک پر امن شخص سے ہے جو قومی محاذ آزادی کے جال کے کسی بھی شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ قائل ہو جانے کے باوجود ایک پولیس انسپکٹر نے کہا "اسے اسی طرح نہ جانے دو۔ ذرا اور مرمت کر لو تا کہ جب باہر جائے تو بھی خاموش ہی رہے۔"(33)

دوسرے یہ کہ وہ اخلاقی دلائل کے بارے میں لاتعلق ہوتے ہیں۔ ان مریضوں کے لئے کوئی بات بھی برحق نہیں ہوتی۔ وہ نصب العین جس میں اذیت ملے کمزور العین ہے۔ لہٰذا نصب العین کی حربی قوت کو ہر قیمت پر بڑھانا چاہئے، اس کے برحق ہونے کے متعلق کوئی سوال نہ اٹھانا چاہئے محض طاقت ہی وہ چیز ہے جس کی حقیقی اہمیت ہے۔

دوسری قسم۔ بجلی سے اذیت کے بعد

اس زمرے میں ہم نے وہ الجزائری محبِّ وطن رکھے ہیں جنہیں بنیادی طور پر بجلی کے جھٹکوں سے اذیت دی گئی۔ گو یہ حقیقت ہے کہ بجلی پہلے بھی اذیت کے ایک عومی طریقے کے طور پر استعمال ہوتی تھی

لیکن ستمبر 1956 کے بعد سے تو کچھ باز پرس محض بجلی کے ذریعے ہی ہونے لگی۔

نفسی طب کے کیسوں کا بیان جو سامنے آئے۔

(الف) مقامی یا عمومی سینستھو پیتھی....تین کیس۔

ان مریضوں کے اپنے پورے جسم میں ''سوئیاں اور کانٹے'' چبھتے محسوس ہوتے تھے، ان کے ہاتھ کٹے ہوئے لگتے تھے، ان کے سر پھٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ان کی زبانیں نکلی جا رہی ہیں۔

(ب) بے حسی، عدم ارادہ اور عدم دلچسپی....کیس۔

یہ وہ مریض ہیں جو داخلی طور پر غیر متحرک ہوتے ہیں۔ وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں، اور وہ دن کے دن زندہ رہتے ہیں۔

(ج) بجلی کا خوف

بجلی کا سوئچ چھوٹے سے خوف، ریڈیو لگانے سے، ٹیلی فون سے خوف۔ ڈاکٹر کا آخری علاج کے طور پر بجلی کے جھٹکے کے استعمال کے امکان کا ذکر کرنا بھی قطعی طور پر ممکن ہوتا ہے۔

تیسری قسم ''ٹرتھ سیرم'' کے بعد

اکثریت اس علاج کے بنیادی اصول کو جانتی ہے۔ ایسے مریض کا علاج کرتے وقت جو کسی لاشعوری داخلی الجھن میں مبتلا نظر آتا ہے اور جس الجھن کو گف وشنید سے باہر لانا ناممکن ہوتا ہے، ڈاکٹر کو تفتیش کے کیمیائی ذرائع پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ پینٹو تھال، جسے نس کے ٹیکے کے ذریعے داخل کیا جاتا ہے، مریض کو اس الجھن سے نجات دلانے کے لئے بطور سیرم بالعموم مستعمل رہے، جو اس کی قوت مطابقت کی حدود سے باہر نکل گئی ہو۔ ڈاکٹر مریض کو اس ''عضو خارجیہ'' سے نجات دلانے کے لئے مداخلت کرتا ہے۔ (34)

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس طریقے کو استعمال کرتے وقت نفسی عمل کی بتدریج شکست وریخت کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا کہ مریض کی حالت نمایاں طور پر بگڑ گئی اور نئی ناقابل تشریح علامتیں ابھر آئیں۔ لہٰذا بالعموم اس طریقے کو کم وبیش ترک ہی کر دیا گیا ہے۔

الجزائر میں فوج کے ڈاکٹروں اور نفسی طب کے ماہروں کو پولیس کوارٹروں میں تجربات کے لئے بہت بڑا میدان میسر آیا۔ یوں کہ اگر اعصابی مریضوں میں پینٹوتھال کا استعمال رکاوٹوں کو توڑ کر ان کی داخلی کش مکش کو نمایاں کر سکتا ہے تو الجزائری محبان وطن کے سلسلے میں بھی اسے سیاسی رکاوٹوں کو توڑ کر، بجلی کے استعمال کے بغیر ہی، قیدیوں کے اعترافات کے حصول میں آسانی پیدا کرنی چاہئے۔ طبی روایات کا تقاضا بھی تو یہی ہے کہ تکلیف سے بچایا جائے۔ طب کی یہ وہ صورت ہے جو ''تخریبی جنگ'' اختیار کرتی ہے۔ منظر کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ''میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ میں یہاں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔'' اس طرح چند روز میں قیدی کا اعتماد حاصل کر لیا جاتا ہے۔ (35)

اس کے بعد ''چونکہ تمہیں بہت بری طرح صدمہ پہنچا ہے اس لئے میں تمہیں چند ٹیکے لگاؤں گا۔'' چند دنوں کے لئے کسی قسم کا بھی علاج کیا جاتا ہے، وٹامن دیئے جاتے ہیں، دل کی تکلیف کا علاج کیا جاتا ہے، شربت دیئے جاتے ہیں۔ چوتھے یا پانچویں دن پینٹوتھال کا وریدی ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ اب باز پرس شروع ہو جاتی ہے۔

نفسی طبی علامتیں

الف ایک ہی جملے کی تکرار

مریض مسلسل اس قسم کے فقرے دہراتا ہے کہ ''میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ میری بات پر یقین کرو۔ میں نے کوئی بات نہیں کی۔'' اس قسم کی تکرار کے ساتھ ایک مستقل اضطراب کی کیفیت بھی جاری رہتی ہے۔ حقیقت میں مریض کو خود بھی علم نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی معلومات فراہم کی ہیں یا نہیں۔ اس نصب العین کے ساتھ جس کے لئے وہ لڑ رہا تھا اور اپنے ان بھائیوں کے ساتھ جو برسر پیکار ہیں اور جن کے نام اور پتے ممکن ہے اس نے بتا دیئے ہوں، اس کا احساس جرم اس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ ڈرامائی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے شکستہ ضمیروں کو کسی قسم کی یقین دہانی سے سکون نہیں ملتا۔

(ب) ذہنی یا حسی ادراک دھندلا جاتا ہے۔

مریض کسی بھی نظر آنے والی شئے کے وجود کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہتا۔ عقل سے کام لیتا ہے لیکن بلا امتیاز کے۔ سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کی بنیادی اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہر شے بیک

وقت صحیح اور غلط ہوتی ہے۔

(ج) نجی گفتگو سے مرض کی حد تک خوف

خوف اس گہرے تاثر سے پیدا ہوتا ہے کہ کسی لمحے پوچھ گچھ کا تازہ سلسلہ شروع ہو سکتا ہے۔

(د) اجتناب

مریض ہمیشہ خبردار رہتا ہے۔ وہ سوال کا ایک ایک لفظ اچھی طرح ذہن نشین کرتا ہے اور اپنے جواب کے ایک ایک لفظ کی وضاحت کرتا ہے۔ اس طرح نفسیاتی سست رفتاری، فقروں کی شکست، تکرار اور ہکلاہٹ کے باعث ایک نیم اجتناب کا تاثر ہوتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ اس قسم کے مریض بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ ہر قسم کے وریدی ٹیکے لگوانے سے انکار کر دیتے ہیں۔

چوتھی قسم۔ ذہن شوئی کے بعد

حال ہی میں الجزائر میں ''نفسیاتی طریق کار'' کے بارے میں بہت کچھ جا چکا ہے۔ ہمارا ارادہ ان طریقوں کا غائر جائزہ لینے کا نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف ان کے نفسی طبی نتائج کو سامنے لانے پر ہی اکتفا کریں گے۔ الجزائر میں دو طرح کے مراکز ہیں جہاں ذہن شوئی کے ذریعے سے اذیت رسانی کی جاتی ہے۔

1- دانشوروں کے لئے

یہاں اصول یہ ہے کہ قیدی سے کوئی کردار ادا کرایا جاتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ طریقہ نفسی عمرانیات کے ایک خاص مکتب فکر پر انحصار کرتا ہے۔(36)

(الف) تعاون کا کھیل

دانشوروں کو تعاون کی دعوت دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی تعاون کی وجہ بھی سامنے لائی جاتی ہے۔ اس طرح وہ ایک دوہری زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی حب الوطنی کے لئے مشہور ہوتا ہے اور اسے انسدادی طور پر جیل میں ڈال دیا گیا ہے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے قومی شعور کے عناصر پر اندرونی طور پر سے حملہ کیا جائے۔ دانشور سے محض تعاون کی ہی توقع نہیں کی جاتی بلکہ حکم دیا جاتا ہے کہ

وہ ان لوگوں کے ساتھ ''کھل کر'' معاملات پر بحث کرے جو اس کے نقطہ نظر کے مخالف ہیں یا پھر انہیں قائل کرے جو اس کے نقطہ میں شریک نہیں ہیں۔ اس کی توجہ دوسرے محبان وطن پر مرکوز کرانے کا یہ ایک سلیقہ مند طریق ہے۔ اس طرح وہ اطلاع دہندہ بن جاتا ہے۔ اگر اتفاق سے وہ کہہ دے کہ اسے تو کوئی مخالف نظر نہیں آتا تو اسے مخالفین بتائے جاتے ہیں یا اسے کہا جاتا ہے کہ وہ اس طرح کا رویہ اختیار کرے جیسے وہ مخالفین سے پیش آ رہا ہو۔

(ب) فرانسیسی ورثہ اور استعماریت کی خوبیوں پر عوام کے سامنے بیان دلوانا۔

یہ کام ہر ممکن طور پر بہتر انداز میں سرانجام دینے کے لئے دانشور کے گرد ''سیاسی مشیر'' یعنی مقامی معاملات سے متعلقہ افسران، یا بہتر صورت میں ماہرین نفسیات، ماہرین سماجی نفسی طب، ماہرین عمرانیات وغیرہ گھیرا ڈال لیتے ہیں۔

(ج) الجزائری انقلاب میں جانے والے دلائل کو ایک ایک کر کے رد کرنا۔ الجزائر ایک قوم نہیں ہے۔ وہ نہ کبھی ایک قوم رہا، اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔

''الجزائری عوان'' کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

الجزائری حب الوطنی بکواس ہے۔

فلاحین محض ذاتی اغراض رکھنے والے کاشتکار ہیں، مجرم اور افلاس زدہ بے راہ رو لوگ۔

دانشور سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ایک ایک موضوع پر باری باری بحث کرے اور اس کی بحث معقول ہو۔ اس کے نمبر (مشہور عام ''انعام'') دیئے جاتے ہیں اور ہر ماہ کے آخر میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان نمبروں سے یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آیا دانشور کو چھوڑا جائے یا نہیں۔

(د) مکمل مریضانہ اجتماعی زندگی گذارنا۔

تنہا ہونا ایک باغیانہ فعل ہے، لہٰذا ہر وقت دانشور کے ساتھ کوئی نہ کوئی ہوتا ہے۔ خاموشی بھی ممنوع ہے۔ سوچنا بھی با آواز بلند پڑے گا۔

ذہن شوئی کی شہادت

یہ کیس ایک یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ شخص کا تھا جس کی قید میں ذہن شوئی ہوئی جو کہ کئی ماہ تک جاری رہی۔ ایک روز کیمپ کے افسروں نے اسے اس ترقی پر جو کہ اس نے کی تھی مبارکباد دی اور اعلان کیا

کہ جلد ہی اسے آزاد کر دیا جائے گا۔

وہ دشمن کی چالوں کو سمجھتا تھا۔لہٰذا اس نے اس خبر پر سنجیدگی سے توجہ نہ دی۔ درحقیقت ان کا طریق کار یہ ہے کہ قیدیوں کے سامنے یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ انہیں آزاد کیا جا رہا ہے اور مقررہ تاریخ سے چند روز پہلے ایک اجلا کا انتظام کیا جاتا ہے جس میں اجتماعی طور پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔ اجلاس کے اختتام پر ان کی آزادی اکثر ملتوی کر دی جاتی ہے، کیونکہ وہ صحت یابی کی واضح نشانیاں ظاہر کرتے نظر نہیں آتے۔ یہ اجلاس، یوں کہیے کہ وہاں موجود ماہرین نفسیات، قوم پرستانہ زہر کی جانب توجہ مبذول کرانے کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔

تاہم اس مرتبہ کوئی بہانہ نہ تھا۔ قیدی کو واقعی ہی آزاد کر دیا گیا۔ جب وہ ایک بار باہر نکل آیا اور اپنے گاؤں اور اپنے کنبے میں پہنچ گیا تو اس نے اپنے آپ کو مبارک باد دی کہ اس نے اپنا کردار اتنے اچھے طریقے سے ادا کیا۔ وہ بہت خوش ہوا کہ وہ ایک بار پھر قومی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل ہو گیا ہے اور اس نے فوراً ہی اپنے رہنماؤں سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب اس کے ذہن میں ایک خوفناک اور شدید شبہ پیدا ہوا۔ غالبًا اس نے کبھی کسی کو دھوکا نہ دیا، نہ اپنے جیل کے حاکموں کو، نہ اپنے ساتھی قیدیوں کو اور نہ ہی اپنے آپ

آخر یہ کھیل ختم کہاں ہو گا؟

یہاں ایک بار پھر ہمیں مریض کو یقین دلانا پڑا اور یوں اسے احساس جرم کے بوجھ سے نجات دلائی۔

پیش آنے والی طبی علامتیں:۔

(الف) ہر قسم کے اجتماعی بحث و مباحثہ سے خوف۔ جونہی تین یا چار لوگ اکٹھے ہو جائیں اجتناب پھر سے سامنے آ جاتا ہے اور سب پر بے اعتباری اور کم گوئی چھا جاتی ہے۔

(ب) کسی بھی خاص نقطہ نظر کی وضاحت یا جماعت ناممکن ہو جاتی ہے۔ ہر خیال کے ساتھ تضاد سامنے آ جاتا ہے۔ ہر چیز جس کا اقرار کیا جاتا ہے، اسی لمحے، اسی قوت کے ساتھ اس کا انکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ امر ہمارے سامنے آیا۔ الجزائر میں سامراجی مقاصد کے لئے استعمال ہونے والے ''نفسیاتی عمل'' کا پھل ایک خبط الحواس شخصیت ہے۔

2- غیر دانشوروں کے لئے

ایسے مراکز میں، مثلاً ''بیرو آغیا'' کے مرکز میں فرد کے رویے کو بدلنے کے لئے داخلیت کو نقطہ آغاز نہیں بنایا جاتا۔ اس کے برعکس جسم پر توجہ دی جاتی ہے۔ اسے اس امید پر توڑا جاتا ہے کہ اس سے قومی شعور تباہ برباد ہوگا۔ یہ زدوکوب بھرپور ہوتی ہے۔ ''انعامات'' کا مطلب اذیت کی عدم موجودگی یا کھانے کے لئے خوراک ملنے کا امکان ہوتا ہے۔

(الف) آپ کو اعلان کرنا پڑے گا کہ آپ کو تعلق قومی محاذ آزادی نہیں ہے۔ آپ کو با آواز بلند لوگوں میں یہ بات کہنی ہوگی۔ آپ کو مسلسل کئی کئی گھنٹوں تک اسے دہرانا پڑے گا۔

(ب) اس کے بعد آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ آپ ایک مرتبہ قومی محاذ آزادی میں تھے لیکن اب آپ کو علم ہوگیا ہے کہ قومی محاذ آزادی ایک بری چیز ہے۔ لہٰذا قومی محاذ آزادی مردہ باد۔

اس منزل کے بعد دوسری منزل آتی ہے۔ الجزائر کا مستقبل فرانسیسی اقتدار ہے۔ فرانسیسی ہونے کے علاوہ یہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

فرانس کے بعد الجزائر قرون وسطیٰ کے دور میں لوٹ جائے گا۔ اور بالآخر، ہم فرانسیسی ہیں۔ فرانس زندہ باد۔

یہاں جنم لینے والے امراض زیادہ تشویشناک نہیں ہوتے۔ محض اذیت ہوتی ہے، دکھی جسم آرام اور چین چاہتا ہے۔

سلسلہ ''د''

نفسی جسمانی امراض

الجزائر میں استعماری جنگ کے نتائج صرف ذہنی امراض میں ایک نمایاں اضافہ اور ایسے حالات کی تشکیل ہی نہیں ہے جو مخصوص مریضانہ مظاہر پیدا کرنے میں مدد ہوں۔ اذیت کی مرضیات سے قطع نظر الجزائر میں فضا کی مرضیات بھی پھل پھول رہی ہے۔ یہ ایسے حالات ہیں جن میں اگر ماہرین طب کا سامنا کسی ایسے مرض سے ہو جس کو وہ سمجھ نہ پائیں۔ تو وہ یہ کہتے ہیں۔ جب یہ کمبخت جنگ ختم ہوگی تو

سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ہمارا ارادہ اس چوتھے حصے میں ان الجزائریوں کو پیش آنے والی بیماریوں کو جمع کرنے کا ہے، جن میں سے کچھ قیدیوں کے اجتماعی کیمپ میں رہے تھے۔ ان بیماریوں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نفسی جسمانی قسم کی ہیں۔

''نفسی جسمانی مرضیات'' کا نام جسمانی امراض کے اس عمومی گروہ کو دیا جاتا ہے جن کی نشو ونما میں کش مکش کی صورت حال نے حصہ لیا ہو۔ (37)

نفسی جسمانی کا نام اس لئے استعمال ہوتا ہے کہ مرض کی وجہ بنیادی طور پر نفسی کیفیات ہوتی ہیں۔ اس مرضیات کو ایک طریق کار خیال کیا جاتا ہے جس کے ذریعے ردعمل حاصل کیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اس کش مکش کے ساتھ اس عضویہ کی مطابقت پیدا کی جاتی ہے جس سے وہ دوچار ہوتا ہے۔ اور اس طرح مرض بیک وقت علامت بھی اور علاج بھی۔ زیادہ وضاحت سے یوں کہیے کہ یہ سمجھا جاتا ہے (ایک بار پھر ہم قشری احشائی وحدت (کارٹیکو ویسٹرل وحدت) کی بات کر رہے ہیں، یعنی پرانے وقتوں کی نفسی جسمانی وحدت کی کہ عضویہ غیر اطمینان بخش طریقے سے لیکن بحیثیت مجموعی کفایت شعارانہ طریقے سے کش مکش کو حل کر لیتا ہے۔ دراصل عضویہ تباہی سے بچنے کے لئے نسبتاً کم تر برائی کا انتخاب کرتا ہے۔

بحیثیت مجموعی اس مرضیات سے آج لوگ بخوبی واقف ہیں، تاہم مجوزہ مختلف معالجاتی طریقے (مثال کے طور پر آرام والقا) ہمیں بہت غیر یقینی نظر آتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں انگلستان میں ہوائی حملوں کے دوران اور سوویت یونین میں شہروں کی محصور آبادی میں، خاص طور پر سٹالن گراڈ کی آبادی میں، ایسی بیماریوں کے وقوع کی خبریں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ آج ہم یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ جنگ کی حقیقت سے ذہنی اور جسمانی طور پر بیماری میں مبتلا ہونے کے لئے ایک گولی سے زخمی ہونا ضروری نہیں ہے۔ دوسری تمام جنگوں کی طرح الجزائری جنگ نے بھی قشری احشائی (کارٹیکو ویسٹرل) مریضوں کا ایک جتھا پیدا کیا ہے۔ شق ''ز'' کے علاوہ جس کا بیان حسب ذیل ہے، الجزائر میں پیش آنے والے تمام امراض کو ''روائتی'' جنگوں کے دوران میں پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔ شق (ز) کا مرض ہمیں صرف الجزائر کی استعماری جنگ میں ہی مخصوص طور پر نظر آیا ہے۔ مرض کی یہ ایک خاص صورت (سارے پٹھوں کا کھنچاؤ) انقلاب کے آغاز سے پہلے ہی اپنی جانب توجہ مبذول کر چکی تھی۔ لیکن ڈاکٹروں نے اسے

مقامی باشندے کی ایک پیدائشی علامت مرض اور اس کے اعصابی نظام کا ایک شاخسانہ بتایا اور یہ بھی کہی گئی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مقامی باشندے کے اعصابی نظام میں کچھ ایسی بھی چیزیں ہوتی ہوں جو اس کے دماغ کی تنظیم سے باہر ہوں۔(38) پٹھوں کا یہ کھنچاؤ درحقیقت مقامی باشندے کے ضبط کا جسمانی اظہار ہوتا ہے، اس کی ہٹ دھرمی اور استعماری حاکیت کو تسلیم کرنے سے انکار کا عضلاتی اظہار ہے۔

پیش آنے والی نفسی طبی علامتیں:۔

(الف) شکم کا ناسور۔ بہت ہی عام۔ درد زیادہ تر رات کے وقت ہوتا ہے، اس کے ساتھ خاصی متلی بھی ہوتی ہے، وزن گھٹ جاتا ہے، رنجیدگی اور رکھائی اور بعض مریضوں میں چڑ چڑا پن بھی ہوتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان مریضوں کی اکثریت نوجوانوں کی ہوتی ہے، اٹھارہ برس سے پچیس برس کی عمر کے لوگ۔ ایک عام اصول کے طور پر ہم کبھی جراحی مداخلت کا مشورہ نہیں دیتے۔ دو موقعوں پر شکمی جراحی کی گئی تھی لیکن ان دونوں صورتوں میں اسی سال دوبارہ جراحی مداخلت کی ضرورت پیش آئی۔

(ب) درد گردہ

یہاں پھر ویسے ہی درد نظر آتے ہیں جن کی شدت رات کو بے حد بڑھ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ گردے میں پتھری تو شاذ ہی کبھی ہوتی ہو۔ یہ درد، گو بہت کم، چودہ سال سے سولہ سال تک کے مریضوں میں بھی ہو سکتے ہیں۔

(ج) عورتوں میں حیض کی تکلیف

اس مرض کے بارے میں سب کو علم ہے، ہم اس پر زیادہ وقت صرف نہیں کریں گے۔ یا تو متاثر عورت تین یا چار ماہ حیض کے بغیر رہتی ہے یا پھر حیض کے ساتھ خاصا درد ہوتا ہے اور اس کے اثرات کردار اور رویوں پر بھی پڑتے ہیں۔

(د) مریضانہ کپکپی کے باعث شدید بے خوابی

مریض بالغ نوجوان ہیں جن کے لئے ایک عمومی ہلکی ہلکی کی وجہ سے، جو مکمل طور پا کنن کے مرض کی یاد دلاتی ہے، تمام آرام حرام ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی ''سائنسی مفکر'' یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرض ان کے اعصابی نظام میں دماغی تنظیم سے خارج کسی شے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

(ھ) بالوں کی جلد سفید ہو جانا

باز پرس کے مراکز سے بچے ہوئے لوگوں کے بال اکثر اچانک سفید ہو جاتے ہیں۔ بعض حلقوں میں تھوڑے تھوڑے اور بعض حلقوں میں مکمل طور پر۔ اس کے ساتھ اکثر شدید ضعف اور جنسی نامردی شامل ہوتی ہے۔

(و) دورے کا اختلاج قلب

دھڑکن قلب اچانک تیز ہو جاتی ہے، 120، 130، 140 فی منٹ۔ اس اختلاج قلب کے ساتھ اضطراب بھی شامل ہوتی ہے اور فوری موت کے خدشے کا تاثر بھی۔ اس بحران کا خاتمہ شدید پسینے کے دورے کے ساتھ ہوتا ہے۔

(ز) عضلات کی سختی کے ساتھ عمومی کھنچاؤ

یہ علامتیں ان مرد مریضوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے لئے بعض مخصوص حرکتیں کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے (دو مریضوں میں تو علامتیں اچانک پیدا ہوئیں) مثلاً سیڑھیوں پر چڑھنا، تیز سے چلنا یا بھاگنا۔ اس تکلیف کا سبب ایک مخصوص تناؤ ہوتا ہے جو ہمیں ناگزیر طور دماغ کے بعض حصوں (سلپٹی مرکز) کی کمزوری کی جانب لے جاتا ہے۔ نچلے اعضا کا جھکاؤ تو تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ کسی قسم کا آرام نہیں مل سکتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مریض ایک ہی ٹکڑے سے بنا ہوا ہے اور ایک اچانک کھنچاؤ کے باعث جسم میں معمولی سی خود اختیاری نرمی بھی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ چہرہ سخت ہو جاتا ہے لیکن ایک نمایاں استعجاب کا اظہار کرتا ہے۔

مریض ''اپنی اعصابی کش مکش کو ختم کرنے'' کے قابل نظر نہیں آتا۔ وہ ہمیشہ تنا رہتا ہے، اور زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہتا ہے۔ اسی لئے ایسے ایک مریض نے ایک بار ہم سے یہ کہا ''دیکھا آپ نے.... میں ایک لاش کی طرح اکڑ گیا ہو'' (39)

شمالی افریقیوں میں پائے جانے والے مجرمانہ محرکات جن کی جڑیں قومی جنگ آزادی میں ہیں۔

اپنے عوام کی آزادی کے لئے صرف لڑنا ہی کافی نہیں ہے۔ ہمیں ایک بار پھر لوگوں کو سکھانا ہوگا، اور اس سے پہلے خود سیکھنا ہوگا کہ انسان کا مکمل رتبہ کیا ہے اور یہ آپ کو اس وقت تک کرتے رہنا ہوگا

جب تک کہ جنگ جاری رہتی ہے۔ آپ کو تاریخ میں واپس لوٹنا ہوگا، انسانوں کی اس تاریخ میں جسے دوسرے انسانوں نے روند ڈالا ہے، اور اپنے عوام اور دوسرے انسانوں کو یکجا کرنا اور اس یکجائی کو ممکن بنانا ہوگا۔

دراصل وہ سپاہی جو قومی جنگ کی مسلح جدوجہد میں الجھا ہوا ہے، دانستہ طور پر روز بروز ان تمام ذلتوں کے مجموعے کو ناپتا رہتا ہے جو استعماری جبر نے انسان پر عائد کی ہیں۔ عمل میں شامل انسان کو بعض اوقات یہ قطعی تاثر ہوتا ہے کہ اسے تمام لوگوں کو بحال کرنا ہوگا اور ان میں سے ہر ایک کو گڑھوں اور تاریکیوں سے نکالنا ہوگا۔ وہ اکثر محسوس کرتا ہے کہ اس کا کام محض دشمنوں کا شکار کرنا ہی نہیں بلکہ اس گہری مایوسی کو ختم کرنا بھی ہے جس نے مقامی باشندے کے وجود کو منجمد کر دیا ہے۔ جبریت کا دور تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن تصادم کچلے ہوئے لوگوں کو بحال کر کے، تعمیر نو کے ایک ایسے عمل کو جاری کر دیتا ہے جو انتہائی بار آور اور فیصلہ کن ہوتا ہے۔ عوام کی فتحیاب جنگ نہ صرف اپنے حقوق کی فتح کو متبرک بنا دیتی ہے بلکہ لوگوں کو استقامت، ہم آہنگی اور یکسانیت بھی دیتی ہے۔ استعماریت نے محض فرد کی شخصیت ہی ختم نہیں کی بلکہ اسے نوآبادیاتی بنایا ہے۔ اس طرح شخصیت کا یہ خاتمہ اجتماعی سطح پر بھی محسوس کیا جاتا ہے یعنی معاشرتی ڈھانچے کی سطح پر۔ نوآبادیاتی عوام محسوس کرتے ہیں کہ وہ افراد کے ایک ایسے گروہ میں تبدیل کر دیئے گئے ہیں جو محض استعماری قوم کی موجودگی میں مربوط ہوتے ہیں۔

آزادی کے لئے عوامی جنگ عوام کو اس سمت میں لے جاتی ہیں جہاں وہ حالات کے مطابق، ان نام نہاد حقائق کا پول کھولتے ہیں یا ان سے انکار کر دیتے ہیں، جنہیں استعماری انتظامیہ، فوجی قبضے، اور اقتصادی استحصال نے ان کے شعور میں مستحکم کیا تھا۔ صرف مسلح تصادم ہی انسانی ذہن سے اس دروغ کو خارج کر سکتا ہے۔ جو ہم میں سے سب سے زیادہ توانا ذہنوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے اور جو لفظاً و معناً ہمیں لنجا کر دیتا ہے۔

پیرس، الجریا، ایکس، یا باسپیتیر میں، ہم نے کتنی ہی بار استعمار زدہ ملکوں کو لوگوں کو بڑے اشتعال کے ساتھ سیاہ فام لوگوں کو، الجزائریوں اور ویت نامیوں کی نام نہاد کاہلی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے سنا ہے۔ لیکن کیا یہ سیدھی سادی حقیقت نہیں ہے کہ استعماری حکومت کے تحت اپنے کام میں منہمک کسان.....اور خود پر آرام حرام جاننے والے نیگرو دراصل ذہنی مریض ہیں؟ مقامی باشندے کی

کاہلی استعماری نظام کا تختہ الٹنے کے لئے ایک شعوری عمل ہے۔ حیاتیاتی سطح پر یہ ایک شاندار خود حفاظتی نظام ہے اور بہرصورت یہ پورے ملک پر قابض قوت کی گرفت کے خلاف ایک یقینی رکاوٹ ہے۔

جنگلات اور دلدل غیر ملکی مداخلت میں مزاحمت کرتے ہیں اور یوں مقامی باشندوں کے فطری اتحادی ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا نقطہ نظر سمجھ لینا چاہئے، اب اعتراضات بند کرنے کا وقت آ گیا ہے اور اب یہ اعلان کر دینا چاہئے کہ نیگرو بے تحاشا کام کرنے کا اہل ہے اور عرب زمین ہموار کرنے میں ماہر ہے۔ استعماری حکومت کے دور میں عرب اور نیگرو کے لئے جو بات درست تھی وہ یہ تھی کہ انہیں اپنا ہاتھ تلک نہیں ہلانا چاہئے اور جابر کی مدد اس بات میں ذرا بھی نہ کرنی چاہئے کہ وہ اپنے شکار میں پنجے مضبوطی سے گاڑ سکے۔ اس مقامی باشندے کا فرض، جو سیاسی شعور کی پختگی کو نہیں پہنچ پایا ہے اور جو جبر کو واپس پھینک دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہے، حقیقتاً کچھ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ ذرا بھی حرکت نہ کرے۔ یہ عدم تعاون کا یا کم سے کم تعاون کا ایک ٹھوس اظہار ہے۔

یہ مشاہدات جن کا تعلق مقامی باشندے اور اس کے کام کے ساتھ ہے، مقامی باشندے کے اس احترام پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں جو وہ جابروں کے قوانین، چنگیوں اور ٹیکسوں کی باقاعدہ ادائیگی اور استعماری نظام سے اپنے تعلقات کے بارے میں رکھتا ہے۔ استعماری حکمرانی میں اظہار تشکر اخلاص اور احترام کھوکھلے لفظ ثابت ہوتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں میں نے ایک بنیادی کلاسیکی تصور کی تصدیق کے مواقع حاصل کئے ہیں اور وہ یہ کہ احترام، وقار اور عزت کے لفظ صرف قومی اور بین الاقوامی یکسانیت کے پس منظر میں ہی معنی پا سکتے ہیں۔ اس لمحے جب آپ کو اور آپ جیسوں کو کتوں کی طرح ختم کیا جانے لگے تو آپ کے پاس اپنی انسانی اہمیت برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا آپ کو جس قدر بھی شدت سے ممکن ہو اپنے اذیت رساں کے جسم پر بوجھ ڈالنا پڑتا ہے تاکہ اس کی روح بھی، جو کہیں درمیانی راستوں میں گم ہو چکی ہے، بالآخر ایک بار پھر عالمی جہت تلاش کر سکے۔ ان پچھلوں برسوں میں مجھے اس بات کے مشاہدے کے مواقع ملے ہیں کہ جنگ کے دنوں میں الجزائر میں، ذات کی قربانی، زندگی کی محبت اور موت سے نفرت نے کوئی عام سی صورت اختیار کی۔ لڑنے والوں کی تعریف میں نغمے الاپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا واسطہ ایک بہت ہی عام بیان سے ہے جو متشدد ترین استعماری بھی دینے سے باز نہ آئے اور وہ یہ کہ جنگجو الجزائریوں کا لڑنے اور

مرنے کا طریقہ غیر معمولی ہے۔ اسلام اور جنت کا کوئی حوالہ اس ایثار ذات کی وضاحت نہیں کر سکتا جن کا مظاہرہ وہ اپنے عوام کی حفاظت اور اپنے بھائیوں کو بچانے کے لئے کرتے ہیں۔ اور پھر وہ بے تحاشا خاموشی...لیکن بلاشبہ جسم تو چلاتا ہی ہے۔ وہ خاموشی جو اذیت دینے والے کے سر پر چھا جاتی ہے۔ ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہاں پھر ہمیں وہ قدیم قانون نظر آتا ہے کہ جب قوم قدم بڑھانے لگے تو وہ کسی عنصر کو خواہ وہ کچھ بھی ہو غیر متحرک نہیں رہنے دیتی۔ اس وقت انسان اپنی لامحدود انسانیت کی بیک وقت توثیق بھی کرتا ہے اور اس کا دعویٰ بھی۔

الجزائری عوام کی ان خصوصیات میں سے جو استعماریت کے مشاہدے میں آئیں، ہم خاص طور پر ان کی خوفناک جرائم پسندی کا جائزہ لیں گے۔ 1954 سے پہلے مجسٹریٹوں، پولیس والوں، بیرسٹروں، صحافیوں اور قانونی ڈاکٹروں کا بیک زبان اس بات پر اتفاق تھا کہ الجزائر میں جرائم ایک مسئلہ بن گئے ہیں۔ یہ بات مسلم تھی کہ الجزائری پیدائشی مجرم ہوتا ہے۔ اس طرح ایک نظریہ قائم کیا گیا اور اس کی حمایت کے لئے سائنسی ثبوت مہیا کئے گئے۔ یہ نظریہ بیس سال سے زائد مدت تک یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا رہا۔ طب کے الجزائری طالب علموں نے یہ تعلیم حاصل کی۔ استعماریت سے سمجھوتے کے بعد ان دانشوروں نے الجزائری عوام کی پیدائشی بیماری کے تصور سے بھی مصالحت کر لی کہ الجزائری پیدائشی کاہل، چور، پیدائشی دروغ گو، پیدائشی ڈاکو اور پیدائشی مجرم ہوتے ہیں۔

ہمارا ارادہ اس سرکاری نظریئے کو دہرانے کا ہے اور ان ٹھوس بنیادوں اور سائنسی دلائل کی یاد تازہ کرنے کا ہے جو اس نظریئے کی تخلیق میں استعمال کئے گئے۔ بعد ازاں ہم حقائق کو لے کر ان کی ازسرنو تعبیر کرنے کی کوشش کریں گے۔

الجزائری اکثر دوسرے لوگوں کو قتل کرتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے۔ مجسٹریٹ آپ کو بتائے گا کہ عدالت میں پیش ہونے والے پانچ مقدموں میں سے چار ضربات اور زخموں سے متعلق ہوتے ہیں۔ الجزائر میں جرائم کا تناسب دنیا میں سب سے زیادہ اور سب سے شدید ہے۔ کم از کم مجسٹریٹ یہی کہتے ہیں۔ معمولی جرائم تو ہوتے ہی نہیں۔ جب الجزائری، اور یہ بات تمام شمالی افریقیوں پر صادق آتی ہے، قانون شکنی پر اترتا ہے تو اس کی انتہا کر دیتا ہے۔

الجزائری وحشیانہ طریقے سے قتل کرتا ہے۔

اول تو مقبول ترین ہتھیار چاقو ہے۔مجسٹریٹوں نے ''جو اس ملک کو اچھی طرح جانتے ہیں،، اس موضوع پر ایک چھوٹا سا فلسفہ تخلیق کر لیا ہے۔مثال کے طور پر قبائلی پستول یا بندوق کو ترجیح دیتے ہیں۔ میدانی علاقوں کے عرب چاقوں کو بہتر سمجھتے ہیں۔کچھ مجسٹریٹوں کو تو شک ہے کہ الجزائری کے لئے خون دیکھنا ایک داخلی ضرورت ہے۔آپ کو بتایا جاتا ہے کہ الجزائری تازہ خون چھونا چاہتا ہے اور مقتول کے خون میں نہانا چاہتا ہے۔مجسٹریٹ، پولیس والے اور ڈاکٹر بڑی سنجیدگی سے مسلمانوں کی روح اور خون کے درمیان تعلق پر اپنے خیالات مرتب کرتے ہیں۔(40)

بعض مجسٹریٹ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ الجزائری بنیادی طور پر کسی آدمی کو قتل اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس کا گلا کاٹنا چاہتا ہے۔الجزائریوں کا وحشی پن خاص طور پر ان کے لگائے ہوئے زخموں کی تعداد میں نظر آتا ہے، جن میں سے بعض تو غیر ضروری طور پر، مقتول کے مرنے کے بعد لگائے جاتے ہیں۔لاشوں کے معائنے ایک بات کو تو مکمل طور پر ثابت کر دیتے ہیں اور وہ یہ قاتل ایک ہی شدت کے متعدد زخم لگا کر یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ ان گنت مرتبہ قتل کرنے کے خواہش مند ہے۔

الجزائری بغیر کسی وجہ کے قتل کرتا ہے

اکثر مجسٹریٹ اور پولیس والے قتل کے محرک کے بارے میں حیران و پریشان رہ جاتے ہیں۔ قتل کسی اشارے پر، کسی پرانے حوالے، کسی مبہم بیان پر، زیتون کے درخت کی مشترکہ ملکیت کے جھگڑے پر، یا کسی مویشی پر جو ایک ایکڑ کا آٹھواں حصہ بھٹک کر دوسرے کے کھیت میں جا نکلا ہو، ہوسکتا ہے۔جب کبھی ایسا قتل سامنے آتا ہے، یا بعض اوقات دوہرا اور تہرا قتل بھی، تو اس کی وجہ یا متوقع محرک کی تلاش، جو ایسے اقدام کا جواز مہیا کر سکے یا اس کی بنیاد بن سکے، بالعموم مایوس کن حد تک نہایت معمولی بات منتج ہوتی ہے۔اس سے عام تاثر یہ اخذ ہوتا ہے کہ محرکات درحقیقت پورے معاشرے میں پوشیدہ ہیں۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ الجزائریوں کی ڈاکہ زنی کی وارداتوں میں نقب زنی بھی شامل ہوتی ہے خواہ اس کے ساتھ قتل ہو یا نہ اور ہر صورت میں مالک مکان کے ساتھ تشدد ضرور برتا جاتا ہے۔ الجزائریوں کی مجرمانہ ذہنیت کے گرد مجتمع یہ تمام عناصر اس کی ماہیت کی بخوبی تخصیص کرتے ہیں اور اس طور

انہیں کم وبیش ایک نظام میں ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

اس طرح کے، اس سے کچھ کم وزنی تصورات تیونس اور مراکش کے بارے میں بھی پیش کئے گئے اور اس طور شمالی افریقہ کی جرائم پسندی کے متعلق سوال اٹھنے لگا۔ تیس سال سے زائد مدت تک پروفیسر پوروکی زیر ہدایت، جو الجیریا میں شعبہ نفسی طب سے متعلق تھے، متعدد ٹیمیں اس جرائم پسندی کے اظہار کی صورتیں متعین کرنے اور ان کی عمرانیاتی، عملی اور ابدانی وضاحت وتشریح کے کام میں مشغول رہیں۔

ہم یہاں اس موضوع پر الجیر زفیکلٹی کے طبی اسکول کی بنیادی تحقیقات پیش کریں گے۔ آیئے ذہن میں تازہ کرلیں کہ بیس برس سے زائد عرصے تک کئے جانے والے تحقیقی کام کا نتیجہ دراصل نفسی طب کے شعبے میں دیئے جانے والے مستند لیکچروں کا ہی ماحصل تھا۔

یہی سبب ہے کہ الجیریا کے ڈاکٹر جو الجیر زفیکلٹی کے گریجویٹ ہیں یہ سننے اور سیکھنے پر مجبور ہیں کہ الجزائری پیدائشی مجرم ہوتے ہیں۔ مزید برآں میں اپنوں میں سے کچھ ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے سیکھے ہوئے ان نظریات کو بڑے خلوص کے ساتھ برقرار رکھا اور مزید ترقی دی۔ وہ یہ بھی کہتے رہے ''اسے تسلیم کرنا مشکل ہے، لیکن یہ بات سائنسی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔''

شمالی افریقی مجرم ہوتے ہیں۔ ان کی سفاکانہ جبلت کو سب جانتے ہیں، ان کی شدید جارحیت ہر ایک کو نظر آجاتی ہے۔ شمالی افریقی انتہا پسند ہوتے ہیں اس لئے ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج وہ بہترین دوست ہیں تو کل بدترین دشمن۔ وہ معنی کی باریکیوں سے نابلد اور دیکارتے کی تعلیمات سے تو بنیادی طور پر بیگانہ ہوتا ہے۔ احساس توازن، قول وفعل کو تولنے پرکھنے کی صلاحیت، یہ بات اس کی انتہائی اندرونی فطرت سے ہی متصادم ہوتی ہے۔ شمالی افریقی متشدد انسان ہوتا ہے اور تشدد اسے وراثت میں ملتا ہے وہ خود تنظیمی اور داخلی محرکات کو بہتر صورتوں میں ڈھالنے کا اہل نہیں ہوتا۔ ہاں.... الجزائری تو شکم مادر سے ہی جبلی محرکات کا اسیر پیدا ہوتا ہے۔

لیکن ہمیں اختصام سے کام لینا چاہئے۔ یہ محرکات زیادہ تر جارحانہ اور عام طور پر قاتلانہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ ممکن ہو پاتا ہے کہ ہم مالیخولیا کے شکار الجزائریوں کے غیر روائتی کردار کی تشریح کر سکیں۔ الجزائر میں موجود فرانسیسی ماہرین نفسی طب اپنے آپ کو ایک مشکل مسئلے سے دوچار پاتے ہیں۔ وہ تو مالیخولیا کے مریض کا علاج کرتے وقت اس خدشے سے دوچار رہنے کے عادی تھے کہ وہ کہیں خودکشی نہ

کرلے۔لیکن اب الجزائری مالیخولیا کا مریض خودقتل پراتر آتا ہے۔اخلاقی شعور کا یہ مرض، جس کے ساتھ ہمیشہ خودکوالزام دینے اور خودکوتباہ کرنے کے میلانات شامل ہوتے ہیں، الجزائری مالیخولیا کا مریض خودکشی نہیں کرتا۔ وہ قتل کرتا ہے۔ یہ وہ قاتلانہ مالیخولیا ہے جس کا پروفیسر پورونے، اپنے شاگرد مونیرات کے مقالہ کے مطابق، بڑی تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔

اب الجزائری مکتب اس قسم کی بے ربطی کو کس طرح بناہتا ہے اول الجیریا کے مکتب کا یہ کہنا ہے کہ خودکشی اپنی ذات میں سمٹنا اور خود اپنی مخالفت ہے۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدمی خودکو دیکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں باطن کا مشاہدہ کرتا ہے۔لیکن الجزائری داخلی زندگی سے تعلق نہیں رکھتا۔ جہاں تک شمالی افریقی کا تعلق ہے اس کے پاس داخلی زندگی ہوتی ہی نہیں۔اپنی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے گردوپیش کے لوگوں پر پل پڑتا ہے۔ وہ تجزیہ نہیں کرتا۔اب چونکہ مالیخولیا اپنی تعریف کے اعتبار سے ہی اخلاقی ضمیر کا مرض ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ الجزائری میں صرف نیم مالیخولیا ہی ہوسکتا ہے۔اس لئے کہ اس کے ضمیر کی گڑبڑ اور اس کے اخلاقی احساس کی کمزوری پہلے ہی سے مشہور ہے۔اگر ہم اسباب کی ان دو درجہ بندیوں کی جانب توجہ کریں جو فرانسیسی مصنفوں نے قائم ہیں تو کسی صورت حال کا تجزیہ کرنے اور ایک ذہنی تناظر قائم کرنے میں الجزائری کی نااہلی واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

پہلے تو ہمیں ذہنی میلانات کا جائزہ لینا چاہئے۔الجزائری کی ایک اہم خصوصیت ذہنی کمزوری ہے۔ اگر ہم اس مفروضے کو واقعی سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں الجزائری نفسی طب کے مکتب کے قائم کئے ہوئے علم تشخیص کی جانب رجوع کرنا پڑے گا۔ان کا کہنا ہے کہ مقامی باشندہ مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہے۔

جذبہ انگیزی کی مکمل یا کم وبیش مکمل عدم موجودگی۔

انتہا سے زیادہ اثر پذیر اور ضعیف العتقادی۔

ہٹ دھرمی میں ثابت قدم۔

ذہنی طفولیت مگر اس کے ساتھ مغربی بچوں کے احساس تجسّس کی عدم موجودگی۔

حادثوں اور طاقت کے اظہار کی جانب میلان۔(41)

الجزائری کسی مسئلے کو بحیثیت مجموعی نہیں دیکھتا۔اس کے سوالات صرف تفصیلات سے ہوتا ہے

اور وہ کلی ترکیب سے عاری ہوتا ہے۔ وہ منتشر الخیال ہوتا ہے۔ اشیا سے چمٹا ہوا، تفصیلات میں کھویا ہوا، خیالات سے بے حس اور تصورات سے غیر متاثر۔ لفظی اظہار کم سے کم ہوتا ہے۔ اس کے اعمال ہمیشہ جبلی اور جارحانہ ہوتے ہیں۔ کل پر نظر ڈالے تو تفصیلات کا جائزہ نہیں لے سکتا۔ عناصر کو مطلق اور جز کو کل سمجھنے لگتا ہے۔ لہٰذا جب کبھی کسی مخصوص اشتعال سے یا غیر اہم اسباب سے جیسے انجیر کا درخت یا کوئی اشارہ یا کھیت میں گھس آنے والی بھیڑ سے اس کا سامنا ہو تو اس کا ردعمل مکمل ہوگا۔ اس کی پیدائشی جارحیت معمولی بہانے پر بھی اپنے اظہار کے راستے تلاش کر لیتی ہے۔ یہ جارحیت کی خالص صورت ہوتی ہے۔(42)

بیانہ منزل کو چھوڑ کر الجزائری مکتب اب تشریحی منزل کی سمت چلتا۔ یہ 1935 کی بات ہے کہ ذہنی و اعصابی امراض کے ماہرین کی کانگریس میں پروفیسر پورو نے اپنے نظریات کی سائنسی بنیادوں کی تشریح کی تھی۔ اس بحث میں جو باروک کی ہسٹریا پر رپورٹ کے بعد چھڑ گئی، انہوں نے بتایا کہ شمالی افریقہ کا باشندہ جس کی اعلیٰ اور دماغی صلاحیتیں بہت کم ارتقا پذیر ہوئی ہیں، ایک قدیم مخلوق ہے جس کی بنیادی طور پر نباتاتی اور جبلی زندگی کا انحصار سب سے زیادہ اس کے ''ڈائی انیسیفلون'' پر ہے۔

پروفیسر پورو کی اس دریافت کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فقاریہ (ریڑھ کی ہڈی والے) جانوروں سے موازنہ کرتے ہوئے نوع انسانی کی خصوصیت کارٹکس مغز (دماغ) کی موجودگی نکلتی ہے۔ ڈائی انیسیفلون، دماغ کا ایک بہت ابتدائی حصہ ہے، اور انسان بہر طور پر ایک ایسا فقاریہ ہے جس میں کارٹکس مغز (دماغ) غالب ہوتا ہے۔

پروفیسر پورو کے نزدیک شمالی افریقہ کے باشندے کی زندگی پر ڈائی انیسفلی محرکات غالب ہوتے ہیں۔ یہ بات اس کے مترادف ہے کہ شمالی افریقہ کا مقامی باشندہ کارٹکس مغز سے محروم ہوتا ہے۔ پروفیسر پورو اپنے اس تضاد سے نہ ہچکچاتے ہوئے اپریل 1939 میں ''سدرن میڈیکل اینڈ سرجیکل گزٹ'' میں اپنے شاگرد سوٹر کی رفاقت میں جو آج الجیریا میں نفسی طب کے پروفیسر ہیں، واضح طور پر لکھتے ہیں۔ ''پس ماندگی کا مطلب بلوغت کی کمی نہیں ہے اور نہ ہی یہ ذہنی نفسیات کی نشو و نما میں کوئی نمایاں ٹھہراؤ ہے۔ یہ ایک معاشرتی حالت جو اپنے ارتقا کی حد کو پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک ایسی زندگی کے ساتھ منطقی مطابقت ہے جو ہماری زندگی سے مختلف ہے۔'' اور آخر میں یہ پروفیسر ان اپنے نظریہ کی بنیاد پر آتے ہیں۔ ''پس ماندگی محض ایک طرز حیات نہیں ہے۔ جو کسی خاص پرورش کا نتیجہ ہو۔ اس کی جڑیں زیادہ گہری ہیں۔

ہم اس امکان کو یوں بھی دیکھتے ہیں کہ اس کی بنیاد ذہن کے تعمیری سانچے کے ایک خاص رجحان میں ہوگی، یا کم از کم اعصابی مرکز کی حرکی درجہ بندی میں۔ ہمارے سامنے کردار کا ایک مربوط سلسلہ موجود ہے اور مربوط زندگی بھی موجود ہے کہ جس کی سائنسی طور پر تشریح کی جاسکتی ہے۔ الجزائریوں میں کارٹکس مغز نہیں ہوتا یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ کمتر فقاریوں کی طرح اس میں بھی ڈائی انیسیفلون غالب ہوتا ہے۔ کارٹکس مغز کا عمل اگر ہو بھی تو بھی بہت کمزور ہوتا ہے، اور عملی طور پر انسانی وجود کی حرکت سے غیر مربوط ہوتا ہے۔ اس طرح سے اس میں نہ تو کوئی راز ہے اور نہ ہی تناقص۔ مقامی باشندے کو ذمہ داری سونپ دینے میں استعماری کی پس وپیش نہ تو کوئی نسل پرستی پر مبنی ہے اور نہ ہی عوام کی آزادی سلب کرنے کی رجحان پر، بلکہ یہ ایک سیدھے سادھے طریقے سے مقامی باشندوں کے امکانات حیاتیاتی حدود کی سائنسی تاویل ہے۔

آیئے اس تبصرے کو عالمی ادارہ صحت کے ماہر ڈاکٹر اے کیروتھرز کی رائے کے ساتھ ختم کریں جو انہوں نے افریقہ کے موضوع پر ظاہر کی ہے۔ اس عالمی ماہر نے اپنے مشاہدات کے بنیادی اجزا کو اپنی ایک کتاب مطبوعہ 1954 میں جمع کیا ہے۔ (43)

ڈاکٹر کیروتھرز نے تحقیقات تو وسطیٰ اور مشرق افریقہ میں کیں لیکن ان کے نتائج شمالی افریقہ کے مکتب کے ساتھ منطبق ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ عالمی ماہر یہ کہتا ہے کہ ''افریقی اپنے مغز کے سامنے کے گوشوں (فرنٹل لوبس) کا استعمال بہت کم کرتا ہے۔ افریقی نفسی طب کی تمام خصوصیات مغز کے اس حصے کو نہ استعمال کرنے میں کاہلی پر مرتکز کی جاسکتی ہیں (44)

اپنے نکتہ کی وضاحت کے لئے ڈاکٹر کیروتھرز ایک جاندار موزانہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ افریقی ایک ''ایسا یوروپی'' ہے جس کے بعض دماغی گوشے کاٹ دیئے گئے ہوں۔ (لوبوٹو مائزڈ یوروپی)۔ ہمیں علم ہے کہ اینگلوسیکن مکتب فکر کا خیال تھا کہ انہوں نے دماغ کے کسی خاص اہم حصے کو کاٹ کر ذہنی امراض کی بعض شدید صورتوں کا فوری علاج دریافت کرلیا ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ بات طے پاگئی کہ اس قسم کا طریقہ شخصیت کو بہت شدید نقصان پہنچاتا ہے لہٰذا اسے ترک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کیروتھرز کے مطابق ایک عام افریقی اور اس یوروپی کے درمیان جس پر لوباٹامی کا اپریشن کیا گیا ہو بڑی نمایاں یکسانیت ملتی ہے۔ (45)

افریقہ میں کام کرنے والے مختلف مصنفین کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر کیروتھرز

ایک ایسا نتیجہ نکالتے ہیں جو افریقیوں کے بارے میں ایک مکمل تصور کی بنیاد بنتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''مسئلہ زیر بحث کے بارے میں حقائق یہی ہیں اور ان کا یورپی اقسام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں مشرقی، مغربی اور شمالی افریقہ کے مختلف علاقوں سے اکٹھا کیا گیا اور بحیثیت مجموعی ہر مصنف دوسرے مصنف کی تحقیقات کے بارے میں کوئی علم نہ رکھتا تھا۔ لہٰذا ان تحقیقات کی بنیادی یکسانیت بہت ہی قابل غور ہے۔''

اختتام سے پہلے ہمیں اس امر کا ذکر بھی کر دینا چاہئے کہ ڈاکٹر کیروتھرز نے ماؤ ماؤ بغاوت کی تعریف کرتے ہوئے اسے لاشعوری ''محرومی الجھن'' کا اظہار بتایا جس کے دوبارہ وقوع کو سائنسی طور پر نمایاں نفسیاتی مطابقت پیدا کر کے روکا جا سکتا ہے۔

لہٰذا یہی وہ غیر معمولی رویہ تھا۔ یعنی افریقیوں کی عام جرائم پسندی، ان کے محرکات کی بے مائیگی، ان کے لڑائی جھگڑے کی قاتلانہ اور خونی نوعیت جس نے منصروں کے ذہنوں میں ایک مسئلہ پیدا کر دیا۔ وہ مجوزہ تشریح، جسے یونیورسٹیوں میں ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، اپنے آخری تجزیے کو طور پر کچھ اس طرح ہے کہ شمالی افریقیوں کی دماغی ساخت ہی ان کی کاہلی اور ان کی ذہنی اور معاشرتی کم مائیگی اور ان کی کم و بیش حیوانی محرکات کی ذمہ دار ہے۔ شمالی افریقیوں کے مجرمانہ محرکات ان کی کرداری ہیئت پر ایک خاص قسم کے اعصابی نظام کے اثرات کا حاصل ہیں۔ یہ ایک ایسا ردعمل ہے جو اعصابی طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اشیاء کی ماہیئت سے ہی واضح ہے۔ یہ حیاتیاتی طور پر منظّم شے کا ردعمل ہے۔ دماغ کے حرکی عمل سے مغز کے ان گوشوں کا غیر مربوط ہونا ہی افریقیوں کی کاہلی، ان کی ڈاکہ زنی، ان کے جرائم، ان کی زنا کاری اور ان کی دروغ گوئی کی تشریح ہے۔ ایک نائب پریفکٹ بن گئے ہیں، میرے سامنے اس بات کا یوں اظہار کیا ''ان فطری حیوانوں کو جو اندھا دھند اپنی فطرت کے اصولوں کی پیروی کرتے ہیں ہمیں ایک سخت گیر اور بے رحم حکمران طبقے کی مدد سے روکنا چاہئے۔ ہمیں فطرت کو قائل کرنے کی بجائے مغلوب کرنا چاہئے۔'' ''نظم وضبط'' ''تربیت'' ''حاکمیت'' اور آج کل ''مجالی امن'' یہ وہ الفاظ ہیں جو استعماری مقبوضہ علاقوں میں بکثرت استعمال کرتے ہیں۔

اگر ہم نے استعماری سائنس دانوں کے پیش کئے ہوئے نظریات کا جائزہ لینے کے لئے زیادہ وقت صرف کیا ہے تو ہمارا مقصد ان کے ذہنی افلاس اور لغویت کو نمایاں کرنے سے زیادہ ایک نہایت اہم اصولی اور عملی مسئلہ پیش کرنا تھا۔ دراصل، الجزائری جرائم پسندی ان سوالوں کا محض ایک جزوی حصہ ہے جو

انقلاب نے اٹھائے ہیں، اور جسے سیاسی بحث وتمحیص اور عقلی دلائل سے حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ اس موضوع پر گفتگو ہوئی وہ اتنی سودمند تھی کہ ان کے باعث ہمیں معاشرتی اور انفرادی آزادی کے تصور کو زیادہ عمیق حد تک سمجھنے اور شناخت کرنے میں مدد ملی۔ جب انقلابی عمل کے دوران میں، رہنماؤں اور مجاہدوں کی موجودگی میں الجزائری جرائم پسندی کا سوال اٹھایا جاتا ہے، جب ماقبل انقلاب کے جرائم، بے ہودگیوں اور ڈکیتیوں کے اوسط کا حوالہ دیا جاتا ہے، جب اس امر کی تشریح کی جاتی ہے کہ جرائم، کی نوعیت اور قانون شکنی کی کثرت کا انحصار، مرد اور عورت اور افراد وحکومت کے درمیان تعلقات پر ہے۔ جب ہر شخص یہ بات سمجھ لیتا ہے، جب ہم اپنی آنکھوں کے سامنے الجزائری یا شمالی افریقی کی جرائم پیشگی کے تصور کو پاش پاش ہوتا دیکھتے ہیں جو الجزائریوں کے شعور میں رچ بس چکا ہے ''ہم گرم مزاج، جھگڑالو اور برے لوگ ہیں، اسی لئے...'' اس وقت یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انقلاب ارتقا پذیر ہے۔

اہم اصولی مسئلہ یہ ہے کہ انسانیت کی اس توہین کو جو اشخاص کے دلوں میں جاگزیں ہے۔ ہر وقت اور ہر مقام پر عیاں کیا جائے، اسے واشگاف اور پامال کیا جائے۔ ہمیں اس وقت کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ قوم نئے افراد پیدا کرے۔ ہمیں اس وقت تک انتظار نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ افراد انقلابی عمل کی وجہ سے نامحسوس طور پر دوامی تجدید کے حامل نہیں ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں عمل ضروری ہیں، لیکن شعور کی مدد کی جانی چاہئے۔ انقلابی نظریئے کا اطلاق، اگر مکمل طور پر آزادی دلانا اور خاص طور پر بارآور ہونا ہے، یہ تقاضہ کرتا ہے کہ کوئی شے ایسی باقی نہ رہنی چاہئے جو خلاف معمول ہو۔ ہمیں شدت سے یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ واقعات کا میزان لگایا جائے، ہر شے کو اپنے ساتھ لے کر چلا جائے، ہر شے کو طے کیا جائے اور ہر شے کی ذمہ داری قبول کی جائے۔ اب ضمیر ماضی میں واپس جانے سے یا اگر ضرورت پڑے تو وقت گزارنے سے پس وپیش نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مقام پر جنگی دستے کی فتح یا کسی گھات کے خاتمے کا مطلب آرام نہیں ہے بلکہ یہ شعور کی پیش قدمی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہر چیز کو ساتھ قدم ملا کر چلنا ہوگا۔

ہاں تو الجزائری اپنے طور پر مجسٹریٹوں اور پولیس والوں کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہیں۔ (46) لہٰذا ہم نے الجزائری جرائم پسندی کو، جسے نرگیست کی سطح پر محسوس کیا تھا، مستند مردانگی کے طور پر قبول کیا اور اس مسئلہ کو استعماری تاریخ کی سطح پر رکھا۔ مثلاً ہم نے یہ واضح کیا کہ فرانس کے الجزائری اپنے مجرمانہ

رجحانات میں ان الجزائریوں سے بنیادی طور پر مختلف ہیں جو براہ راست استحصال کا شکار ہوئے ہیں۔

ایک اور چیز کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ الجزائر میں الجزائری جرائم پسندی ایک محدود طبقے میں ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ الجزائری آپس میں ہی ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں، ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں، ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ الجزائر میں الجزائری شاذ نادر ہی کسی فرانسیسی پر حملہ کرتا ہے اور بالعموم فرانسیسیوں کے ساتھ جھگڑے سے احتراز کرتا ہے۔ اس کے برعکس فرانس میں تارک وطن الجزائری معاشرتی اور طبقاتی سطح پر جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

فرانس میں الجزائری جرائم پسندی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اب اس کا رخ خاص طور پر فرانسیسیوں کی طرف ہے اور اس کے محرکات مکمل طور پر نئے ہیں۔ ایک خاص متناقص صورت حال نے مجاہدین کو آگاہی بخشنے میں ہماری خاصی مدد کی ہے۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ 1954 سے عام قانونی جرائم کم و بیش غائب ہو چکے ہیں۔ اب کوئی تنازعے نہیں ہوتے اور نہ ہی کوئی غیر اہم بات جو کسی شخص کی جان لینے کا باعث بنتی ہو۔ اب غیض و غضب کے زوردار دھماکے کے محض اس لئے نہیں ہوتے کہ میرے ہمسائے نے میری بیوی کی پیشانی یا اس کا بایاں کندھا دیکھ لیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قومی تحریک نے سارے غیض و غضب کے لئے نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اور تمام تر تاثراتی وجذباتی محرکات کو قومی ملکیت بنالیا ہے۔ فرانسیسی جج اور بیرسٹر پہلے ہی یہ بات سمجھ چکے تھے، لیکن مجاہدین کا اس امر کا احساس دلانا پڑا اور انہیں اس کی وجوہات سمجھانی پڑیں۔

ابھی اس کی وضاحت باقی ہے۔

کیا یہ کہنا چاہئے کہ جنگ، اس جارحیت کا بہتر اظہار جو بالآخر معاشرتی صورت اختیار کر لیتی ہے، تمام پیدائشی قاتلانہ اعمال کو قابض قوت کی طرف منتقل کر دیتی ہے؟ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ بڑے بڑے معاشرتی ہنگامے جرائم اور ذہنی امراض کی کثرت کم کر دیتے ہیں۔ اس طرح الجزائری جرائم پسندی کی مراجعت کی تشریح بھی ایک ایسی جنگ کے وجود سے کی جا سکتی ہے جس نے الجزائر کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور عدالتی اور انتظامی مشین کو دشمن کی طرف ڈال دیا۔

لیکن افریقہ کے مغرب کے ان ملکوں میں بھی جو آزاد ہو چکے ہیں، یہی سلسلہ جو آزادی کے بعد سے اور زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ اس لئے یہی نظر آئے گا کہ کہ جرائم پسندی کی وجوہات کی تعبیر نو کے

لئے بنیادیں مہیا کرنے میں استعماری سیاق وسباق اصل حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی کام ہم نے اپنے مجاہدین کے لئے کیا۔ آج ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ جرائم پسندی نہ تو الجزائری کے موروثی کردار کا نتیجہ ہے اور نہ ہی ان کے اعصابی نظامی ترتیب کا اثر۔ الجزائری جنگ بھی قومی آزادی کی تمام جنگوں کی طرح حقیقی کرداروں کو سامنے لاتی ہے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں استعماری سیاق وسباق میں دیسی باشندے آپس میں لڑتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو پردے کے طور پر استعمال کرنے مائل ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے پڑوسی سے بھی قومی دشمن کو چھپا کر رکھتا ہے، جب دن کے سولہ گھنٹے کے کڑے کام سے تھک ہار کر مقامی باشندہ سونے کے لئے اپنی چٹائی پر لیٹتا ہے تو درمیان میں لٹکے ہوئے ٹاٹ کے دوسری جانب سے ایک بچہ رونا شروع کر دیتا ہے اور اسے سونے نہیں دیتا اور یہ بچہ بھی ایک ننھا الجزائری ہی ہے۔ جب وہ پنساری انکار کر دیتا ہے تو اس کے اندر نفرت کے شدید جذبات اور قتل کے بے پناہ خواہش ابھرتی ہے اور وہ پنساری بھی الجزائری ہی ہے۔ جب ہفتوں تک اس کی نظروں سے غائب رہنے کے بعد ایک دن پیرا سے گھیر لیتا ہے اور اپنے ''نذرانہ'' کا مطالبہ کرتا ہے، تو وہ یورپی منتظم کے خلاف نفرت کا مزا بھی محسوس نہیں کرتا، البتہ اس کے سامنے موجود پیر اس کی نفرت کا مرکز بن جاتا ہے .....اور پیر بھی الجزائری ہی ہے۔

الجزائری کے لئے قتل کی ترغیبات ہر روز موجود ہوتی ہیں....قحط، کرایہ ادا نہ کر سکنے کی صورت میں کمرے سے نکالا جانا، ماں کی سوکھی ہوئی چھاتیاں، ہڈیوں کا ڈھانچہ بچے، عمارت کی تعمیر جو روک دی گئی ہے، بے روزگار جو کوؤں کی طرح مستری کے گرد منڈلاتے ہیں،....ایسی صورت میں مقامی باشندے کو اپنا پڑوسی بھی ایک سفاک دشمن نظر آتا ہے۔ اگر اس کا ننگا پاؤں سڑک کے درمیان میں پڑے ہوئے کسی پتھر سے ٹکرا جائے تو کسی مقامی باشندے نے ہی وہ پتھر وہاں رکھا ہوگا۔ وہ چند زیتون جو وہ توڑنے جا رہا تھا، رات کے وقت ''ک'' کے بچے کھا گئے۔ الجزائر میں اور دوسری جگہوں پر بھی استعماری دور میں بہت چیزیں محض چند شیر آٹے کے لئے کی جا سکتی تھیں۔ اس کے لئے متعدد لوگ قتل کئے جا سکتے تھے۔ اسے سمجھنے کے لئے آپ کو اپنا تخیل استعمال کرنا پڑے گا، اپنا تخیل یا پھر اپنا حافظہ۔ قیدیوں کے اجتماعی کیمپوں میں روٹی کے ایک ایک ٹکڑے پر آدمی قتل کئے گئے۔ مجھے ایک دہشت ناک منظر یاد ہے۔ یہ 1944 میں اور ان کا ذکر ہے۔ اس کیمپ میں جہاں ہم جہاز کے لنگر اٹھنے کے منتظر تھے، سپاہی چھوٹے چھوٹے الجزائری

بچوں کے سامنے روٹی کے ٹکڑے پھینک رہے تھے اور وہ ان ٹکڑوں کے لئے بڑے غصے اور نفرت کے ساتھ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ جانوروں کے ڈاکٹر ہمیں اس مشہور ''ٹھونگ مارنے کے قانون'' کی یاد دلا کر جس کا مشاہدہ مرغیوں کے بارے میں کیا جا سکتا ہے، ایسے مسئلوں پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ وہ دانہ جو مرغیوں کو ڈالا جاتا ہے دراصل شدید مقابلے کا باعث بنتا ہے۔ بعض مرغیاں جو زیادہ طاقتور ہوتی ہیں سارا دانہ نگل جاتی ہیں اور باقی جو نسبتاً کم جارحیت پسند ہوتی ہیں دن بدن دبلی چلی جاتی ہیں۔ ہر نوآبادی ایک بڑا اباڑا بنتی جاتی ہے جہاں صرف چاقو کا قانون ہی چلتا ہے۔

الجزائر میں جب سے قومی آزادی کی جنگ شروع ہوئی ہے، ہر چیز بدل گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک پورے خاندان یا پہاڑی بستی کی خوراک کا تمام ذخیرہ کسی شام کو گزرتی ہوئی فوجی کمپنی کو دے دیا جائے۔ ممکن ہے کنبے کا واحد گدھا زخمی مجاہد کی سواری کے لئے دے دیا جائے اور جب چند روز بعد مالک کو یہ علم ہو کہ اس کے جانور کو ہوائی جہاز سے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ تو وہ دھمکیوں اور گالیوں کی ابتدا نہیں کرتا، وہ اپنے گدھے کی ہلاکت کے بارے میں معلومات نہیں کرتا بلکہ بڑی بے تابی سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا زخمی سپاہی زندہ سلامت ہے؟

استعماری دور میں روٹی کے ایک ٹکڑے یا ایک ناتواں بھیڑ کے لئے کوئی کام بھی کیا جا سکتا ہے۔ استعماری دور میں گرد و پیش کے حقائق کے ساتھ، خارجی دنیا کے ساتھ اور تاریخ کے ساتھ انسانی تعلقات محض خوراکی تعلقات ہوتے ہیں۔ جبریت کے ساتھ جد وجہد کے دوران میں جیسا کہ الجزائر میں ہے، استعمارہ زدہ شخص کے لئے زندگی گزارنے کا مفہوم اخلاقی اقدار کی تشکیل یا دنیا کی مربوط اور سودمند ترقی میں اپنا مقام پیدا کرنا نہیں ہے۔ زندہ رہنے کا مطلب وجود کو برقرار رکھنا ہے۔ ہر روز فتح کا روز ہے، یہ فتح کام کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ زندگی کو برقرار رکھنے پر محسوس کی جاتی ہے۔ لہٰذا کھجوریں چرانا یا اپنی بکری کو پڑوسی کی گھاس چرنے دینا دوسروں کے حق ملکیت کو تسلیم کرنے سے انکار کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی قانون کی خلاف روزی اور نہ ہی دوسروں کے لئے احترام کی عدم موجودگی۔ یہ قتل کرنے کی کوشش ہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ چوری کوئی غیر قانونی یا عداوتی فعل نہیں بلکہ قتل کی کوشش ہے، ضروری ہے کہ آپ نے قبائلی عورتوں اور مردوں کو کئی کئی ہفتے نیچے وادی کے نشیب میں جاتے اور وہاں سے چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں مٹی بھر کر اوپر لاتے دیکھا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ واحد تناظر پیٹ ہی ہے جو روز بروز سکڑتا جاتا ہے اور جو کم سے کم کا

طالب ہے لیکن جسے اس کے باوجود بھرنا چاہئے۔ آخر سزا کسے ملے؟ فرانسیسی لوگ پولیس، فوج اور ٹینکوں کے ساتھ نیچے میدانوں میں ہیں۔ پہاڑوں پر صرف الجزائری ہیں۔ اوپر جنت ہے، موت کے بعد نئی زندگی کا وعدہ، اور نیچے فرانسیسی، میں، جیل، کوڑے اور پھانسی کا بہت ہی ٹھوس وعدہ، آخر آپ اپنے ہی خلاف کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہمیں خود نفرتی کی اس اصلیت کا پتہ چل جاتا ہے جو نسلی تخصیص کے معاشروں میں نسلی تنازعات کی روح ہے۔

لہٰذا الجزائری کی جرائم پسندی، اس کے جبلی محرکات اور اس کا قاتلانہ تشدد نہ تو اس کے اعصابی نظام کی تربیت کا نتیجہ ہے اور نہ ہی اس کا کرداری وصف، بلکہ استعماری صورت حال کا براہ راست ماحصل ہے۔ یہ حقیقت کہ الجزائر کے سپاہی اس مسئلے پر گفتگو کر چکے ہیں، کہ وہ معتقدات پر اعتراض کرنے سے بھی خوفزدہ نہیں ہیں جو استعماریت نے ان کے اندر پرورش کئے ہیں، کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص نے اپنے ہمسائے کو پردے کے طور پر استعمال کیا اور درحقیقت ہر شخص نے، جب وہ اپنے ہمسائے کے لئے نکلا تو خودکشی کی، ان سب باتوں کی انقلابی ضمیر میں بنیادی اہمیت حاصل ہونی چاہئے۔ اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ اس مقامی باشندے کا مقصد جو اپنے ہی خلاف لڑتا ہے، استعماری تسلط کا خاتمہ کرنا ہے۔ لیکن اس ان تمام غلط بیانیوں کو تلف کرنے پر بھی برابر کی توجہ دینی چاہئے جو جبریت نے اس کے وجود میں سمو دی ہیں۔ ایسے استعماری نظام حکومت میں جیسا کہ الجزائر میں تھا، استعماریت کے پیش کئے ہوئے خیالات نہ صرف یورپی اقلیت پر اثر انداز ہوئے بلکہ انہوں نے الجزائریوں کو بھی متاثر کیا۔ مکمل آزادی وہ چیز ہے جس کا شخصیت کے تمام شعبوں سے تعلق ہو۔ گھات یا حملہ، اذیت یا بھائیوں کا قتل عام فتح کے عزم کو اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے، غافل کو جگا دیتا ہے اور تخیل کی نشو و نما ہے۔ جب قوم بحیثیت مجموعی کروٹ لیتی ہے تو نیا انسان قوم کے تجربے کا نچوڑ نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے ساتھ موجود رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فتحیاب ہوتا ہے۔ یہ جدلیاتی ضرورت اس ہٹ دھرمی کی وضاحت کرتی ہے جو استعماریت کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی کوششوں اور ظاہری اصلاحوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی۔ آزادی کوئی طلسماتی لفظ نہیں ہے بلکہ یہ ان مردوں اور عورتوں کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے جو حقیقی معنوں میں آزاد ہو چکے ہیں یا بہ الفاظ دیگر ان تمام مادی وسائل کے مالک ہیں جو معاشرے کی انقلابی قلب ماہیت کو ممکن بناتے ہیں۔

حرف آخر

تو پھر آؤ ساتھیو! بہتر ہوگا کہ ہم فوراً اپنے طور طریقے بدلنے کا فیصلہ کرلیں۔ ہمیں اس گہری تاریکی کو کاٹ کر پیچھے چھوڑنا ہوگا جس میں ہم اب تک دھنسے ہوئے تھے۔ نئے دن کو جو ہمارے سامنے ہے ہمیں ثابت قدم، عقلمند اور عزم پانا چاہئے۔

ہمیں اپنے خوابوں کو پس پشت ڈال دینا چاہئے، اپنے قدیم عقائد کو ترک اور ماقبل حیات کے زمانے سے دوستی ختم کردینا چاہئے۔ ہمیں بنجر دعاؤں اور مکروہ نقالی میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے۔ یورپ کو اپنے حال پر چھوڑو کہ وہاں لوگ انسان کے موضوع پر بات کرتے ہیں تھکتے، لیکن جہاں بھی انہیں انسان نظر آتا ہے اسے قتل کردیتے ہیں۔ اپنی ہر سڑک کو موڑ پر.... دنیا کے گوشے گوشے میں۔ صدیوں تک انہوں نے نام نہاد روحانی واردات کے نام پر کم وبیش پوری انسانیت کا گلا گھونٹے رکھا ہے۔ ذرا انہیں آج دیکھئے، ایٹمی اور روحانی انتشار کے درمیان لٹک رہے ہیں۔

اور اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ کامیاب رہا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ کامیاب رہا۔

یورپ نے دنیا کی رہنمائی کا کام سرگرمی، بے لحاظی اور تشدد کے ساتھ سرانجام دیا۔ دیکھو اس کے محلوں کے سائے کس قدر دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں! اس کی ہر حرکت نے مکانی وتصوراتی حدود کو اڑا کر رکھ دیا۔ یورپ نے انکساری وعاجزی ترک کردی ہے، بلکہ اس نے لجاجت وملائمیت سے بھی منہ پھیر لیا ہے۔

اس نے انسانوں کے متعلق اپنی بخیلی اور کنجوسی ہی دکھائی ہے اور محض انسانوں ہی کو اپنا لقمہ بنایا ہے اور قتل کیا ہے۔

میرے بھائیو، تو پھر ہم اتنی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ ہمارے پاس اس یورپ کی پیروی سے زیادہ بہتر کام ہیں۔

آج یورپ کے بارے میں، جہاں لوگ انسان کے متعلق باتیں کرنے اور یہ اعلان کرنے سے کبھی نہیں رکتے کہ وہ محض انسانی فلاح وبہبود کے لئے ہراساں ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ انسانیت نے ان کی ہر ذہنی فتح کے لئے کتنے دکھوں کی قیمت ادا کی ہے۔

تو میرے ساتھیو، اب یورپی کھیل ختم ہوچکا ہے، ہمیں کچھ اور تلاش کرنا چاہئے۔ آج ہم سب کچھ کر

سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم یورپ کی نقالی نہ کریں، بشرطیکہ یورپ کی ہمسری کی خواہش کے خط میں مبتلا نہ ہوں۔

تو میرے ساتھیو، اب یورپی کھیل ختم ہو چکا ہے، ہمیں کچھ اور تلاش کرنا چاہئے۔ آج ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم یورپ کی نقالی نہ کریں، بشرطیکہ یورپ کی ہمسری کی خواہش کے خبط میں مبتلا نہ ہوں۔

یورپ آج ایک ایسی دیوانگی اور ناعاقبت اندیشی کی دوڑ میں مبتلا ہے کہ اب اس نے تمام تر ہدایت و دانش سے قطع نظر کر لی ہے اور دوسرے کے بل ایک گہری کھائی میں گر رہا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم یورپی تیز رفتاری کے ساتھ اس سے بچنے کی کوشش کریں۔

تاہم یہ بھی درست ہے کہ ہمیں ایک نمونہ چاہئے۔ ہمیں نقشوں اور مثالوں کی ضرورت ہے۔ ہم میں سے بہتوں کے لئے یورپی نمونہ سب سے بڑھ کر خیال افروز ہے۔ اسی لئے ہم پچھلے صفحات میں دیکھ آئے ہیں کہ اس قسم کی نقالی نے ہمیں کن اذیت ناک الجھنوں میں ڈال دیا ہے ہمیں اب یورپی کارناموں، یورپی تکنیک اور یورپی اسالیب پر ریجھ کر اپنا توازن نہیں کھونا چاہئے۔

جب میں یورپی تکنیک اور یورپی اسالیب میں ''انسان'' کی تلاش کرتا ہوں تو مجھے صرف انسانوں کی نفی کا سلسلہ اور ان کی ہلاکتوں کے حادثات نظر آتے ہیں۔

انسانی حالات، نوع انسان کے لئے منصوبے اور ان کارناموں کے لئے جو انسانیت کے کل مجموعے میں اضافہ کرتے ہیں، انسان کے درمیان لین دین، ایسے نئے مسائل ہیں جو نئی دریافتوں اور ایجادات کے متقاضی ہیں۔

آیئے ہم یورپ کی نقالی ترک کرنے کا فیصلہ کر لیں۔ آیئے ہم اپنے بازو اور اپنے ذہن ایک نئی سمت میں متحد کر لیں۔ آیئے ہم اس مکمل انسان کی تخلیق کریں جسے یورپ احساس فتحمندی کے ساتھ جنم دینے میں ناکام رہا ہے۔

دو صدیاں گذریں ایک سابق یورپی نوآبادی نے یورپ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں اسے اس قدر کامیابی ہوئی کہ اب ریاست ہائے متحدہ امریکہ ننگ انسانیت مخلوق بن گیا جس میں یورپی آلودگی، بیماری اور غیر انسانیت خوفناک سمتیں اختیار کر گئی ہیں۔

ساتھیو، کیا ہمارے پاس ایک تیسرا یورپ تخلیق کرنے کے سوا کوئی اور کام نہیں ہے؟ مغرب نے خود کو ایک روحانی مہم کے طور پر دیکھا۔ روح کے نام پر، یورپ نے غاصیت روا رکھی، اس نے اپنے جرائم کا جواز پیدا کیا اور اس غلامی کو عائد کیا جس میں اس نے انسانیت کے اسی فیصد حصے کو جکڑ رکھا ہے۔

ہاں یورپی روح کی جڑیں بہت عجیب ہیں۔ یورپی فکر نے ایسے علاقوں میں خود کو پھیلایا جو ویران تھے، اور جو چٹانوں سے گھرے ہوئے تھے اور اسی لئے ان علاقوں میں یہ رواج پڑ گیا کہ اب انسان انسان سے نہیں ملتے۔

اپنی ذات کے ساتھ مستقل مکالموں اور بڑھتی ہوئی مکروہ نرگیست نے نیم ہذیاتی صورت حال کے لئے راستہ ہموار کر دیا، جہاں ذہنی کام اذیت بن گیا اور حقیقت ایک زندہ انسان کی حقیقت ایک زندہ انسان کی حقیقت نہ رہی جو عمل کرتے ہوئے اپنی تخلیق کر رہا ہو۔ اب حقیقت لفظوں میں آ گئی لفظوں کی مختلف تراکیب میں اور لفظوں کے معنی سے پیدا ہونے والی کش مکش میں۔ تاہم کچھ یورپی محنت کشوں کو اس بات پر آمادہ کرتے رہے کہ وہ نرگیست کو پاش پاش کر دیں۔ اس عدم حقیقت کو توڑ ڈالیں۔

لیکن عام طور پر یورپ کے محنت کشوں نے ان آوازوں پر لبیک نہیں کہا۔ کیونکہ محنت کش بھی یہی سمجھتے رہے کہ وہ یورپی روح کی اس گراں قدر مہم کا ایک حصہ ہیں۔

انسانیت کے عظیم مسائل حل کرنے کے لئے تمام عناصر مختلف اوقات میں یورپی فکر میں موجود رہے ہیں۔ لیکن یورپ والوں نے عملی طور پر کام سرانجام نہ دیا جو ان کے ذمے تھا، جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ پوری شدت سے اپنا پورا زور ان عناصر کے لئے صرف کرتے تا کہ وہ اپنے ڈھانچے اور اپنی فطرت کو بدل سکتے اور اس طرح خود کو تبدیل کر کے بالآخر نوع انسانی کے مسائل کو بلند ترین سطح پر لے آتے۔

آج ہم یورپ کے جمود میں کھڑے ہیں۔ ساتھیو آؤ اس جامد حرکت سے بھاگ نکلیں، جہاں لغویات بتدریج توازن کی منطق میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ آؤ ہم نوع انسانی کے سوال کا از سر نو جائزہ لیں۔ آؤ دماغی حقیقت کا اور دنیا کے تمام انسانوں کے دماغوں کے مسئلے کا پھر سے جائزہ لیں، جن کے روابط بڑھنے چاہئیں، جن کی راہیں متنوع ہونی چاہئیں اور جن کے پیغامات میں پھر سے انسانی روح ڈالنی چاہیے۔

آؤ بھائیو، عقبی محافظ دستے کا کام کرنے کے لئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ یورپ جو چاہتا تھا وہ کر

چکا اور بحیثیت مجموعی اچھی طرح کیا، ہمیں اس پر الزام تراشی بند کر دینی چاہئے لیکن اسے وثوق سے یہ بتا دینا چاہئے کہ اب وہ اپنے گیت گانا اور خوشی سے ناچنا بند کر دے۔ اب ہمیں اس سے کوئی ڈر نہیں ہے۔ لہٰذا آیئے اس سے حسد کرنا ترک کر دیں۔

آج تیسری دنیا اپنے کثیر انبوہ کے ساتھ یورپ کے سامنے ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ ان مسائل کے حل کی کوشش کرے جس میں یورپ ناکام رہا ہے۔

ہمیں ایک بات واضح طور پر سمجھنی چاہئے کہ اہم بات یہ ہے کہ اب ہمیں پیداواری مقدار، کام میں شدت اور آہنگ کار کی باتیں کرنی بند کر دینی چاہئیں۔

فطرت کی طرف لوٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب ہمارے سامنے ٹھوس مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو تباہی کی طرف نہ جانے دیا جائے اور انسانی ذہن پر وہ آہنگ مسلط نہ کیا جائے جو اسے ختم اور برباد کر دے۔ کسی سے مقابلے کا بہانہ اس لئے استعمال نہیں ہونا چاہئے کہ انسان کو ادھر ادھر دھکیلا جائے، انہیں اپنی ذات سے یا نجی زندگی سے کاٹ دیا جائے، انہیں کچلا اور ہلاک کیا جائے۔

اب ہمیں کسی کی ہمسری نہیں کرنی ہے۔ ہم جو چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ''انسان کی رفاقت میں، تمام انسانوں کے ساتھ مل کر، ہمہ وقت، دن رات، آگے کی طرف گامزن رہیں۔ قافلہ کو زیادہ پھیلنا نہیں چاہئے کہ اس صورت میں پیچھے کی صف آگے کی صفوں کو دیکھ نہ سکے گی۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے کم سے کم ملتے ہیں اور ایک دوسرے سے کم سے کم گفتگو کرتے ہیں۔

اب مسئلہ تیسری دنیا کا ہے جو ایک نئے انسان کی تاریخ کا آغاز کر رہی ہے۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہو گی جو یورپ کی اس تحقیق کو بھی سامنے رکھے گی جو کبھی عظیم الشان سمجھی جاتی تھی، لیکن جو یورپ کے جرائم کو بھی نہیں بھولے گی جن میں سے سب سے خوفناک جرم تو انسانی دل کے خلاف کیا گیا۔ مرضیات کی سطح پر انسانی افعال کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور اس کی مجموعی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ اجتماعیت کے ڈھانچے امتیازات، طبقات اور جماعتوں کی پروردہ خوں آشام کش مکش رکھی گئی۔ اور آخر میں انسانیت کی عظیم سطح پر، نسل پرستانہ نفرت، غلامی اور استحصال تھا اور سب سے بڑھ کر غیر خونی قتل عام جس نے دنیا کی ڈیڑھ ارب آبادی کو ایک کنارے لگا دیا تھا۔

لہٰذا ساتھیو! آؤ ہم یورپ سے فیضان حاصل کرنے والی ریاستیں، ادارے اور مجلسیں قائم کر کے

اسے مزید خراج عقیدت پیش نہ کریں۔

انسانیت اب ہم سے کچھ اور تقاضے کرتی ہے محض نقالی نہیں کہ نقالی اب نہایت فحش و مکروہ ہیئت اختیار کرے گی۔

اگر ہم افریقہ کو ایک نئے یورپ میں اور امریکہ کو ایک نئے یورپ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ تو آیئے اپنے ملکوں کی تقدیر کو یورپ کے ہاتھوں میں دے ڈالیں۔ وہ ہمارے دانشوروں سے بھی زیادہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کام بہتر طور پر کیسے کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ انسانیت ایک قدم اور آگے بڑھائے، اگر ہم انسانیت کو اس سطح سے جو یورپ نے اسے دی ہے ایک مختلف سطح دینا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں دریافتیں اور ایجادیں کرنی ہوں گی۔

اگر ہم اپنے عوام کی توقعات پر پورا اترنا چاہتے ہیں تو ہمیں یورپ کی بجائے کسی دوسری جگہ سے تاثرات حاصل کرنے چاہئیں۔

مزید برآں اگر ہم یورپ کے عوام کی توقعات کا ہی جواب دینا چاہتے ہیں تو انہیں کے معاشرے اور فکر کا، جس سے وہ گاہے بگاہے بے پناہ بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، انعکاس، مثالی انعکاس لوٹا دینے کا کیا فائدہ۔

یورپ کے لئے اپنے لئے اور انسانیت کے لئے، ساتھیو ہمیں تاریخ کا ایک نیا ورق الٹنا چاہیے، ہمیں نئے تصورات پیش کرنے چاہئیں، اور نئے انسان کو اس کے قدموں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حوالہ جات

1- ڈئین بین پھو میں فرانسیسی فوجوں کی زبردست شکست نے ہند چین کی جنگ ختم کر دی تھی۔

2- ٹامس رابرٹ بوگو والا پیکانوی 1784-1849 ڈیوک آف ازے، فرانسیسی افواج کے مارشل جو الجزائر کی فتح میں فوجی کارناموں کے لئے مشہور ہیں۔ وہ 1840 میں الجزائر کے گورنر مقرر ہوئے۔

3- مانی کے مذہب کے ماننے والے جو خیر و شر دونوں کو الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ (مترجم)

4- باب پنجم۔ نوآبادیاتی جنگ اور ذہنی امراض

5- اینگلس۔ اینٹی ڈوھرنگ، حصہ دوم، باب سوم، تشدد کا نظریہ، سوشلسٹ ایڈیشن صفحہ 199

6- یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گرفتار رہنما فی الحقیقت نوآبادیاتی عوام کا نمائندہ ہو۔ ایسی صورت میں استعمار اس کی گرفتاری کی مدت کو نئے رہنماؤں کی تشکیل کے لئے استعمال کرے گا۔

7- افسروں کی ایک جماعت جس کا کام الجزائری باشندوں سے غیر فوجی معاملات میں تعلقات استوار کرنا تھا۔

8- یہاں اشارہ میرابو کے مشہور قول کی طرف ہے۔ ''میں عوام کی مرضی سے یہاں ہوں، اور محض سنگینوں کی طاقت ہی مجھے ہٹا سکتی ہے۔''

9- ظاہر ہے کہ یہ صفائی اس چیز کو بھی صاف کر دیتی ہے جسے یہ محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ سارتر اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''مختصراً انہیں (نسل پرستانہ خیالات کو) دہرانے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقامی باشندوں کے خلاف ہر کس و ناکس کا اتحاد قابل عمل نہیں ہے۔ ایسا اتحاد مختلف اوقات میں ہی ہوسکتا ہے اور پھر یہ محض اس وقت عملی گروہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے جبکہ مدعا مقامی باشندوں کا قتل عام ہو۔ یہ ایک مہمل مگر نوآبادکار کے لئے پرکشش بات ہے۔ اور اگر یہ ممکن العمل ہوئی بھی تو محض اس طرح کامیاب ہوگی کہ استعمار کو ایک ہی جھٹکے میں ختم کر دے۔

10- ایمی سیزیر: ہتھیاروں کے معجزے۔

11- الجزائر کی فرانسیسی حکومت کے اس فیصلہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس دور کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ الجزائری مزاحمت'' نمبر 4- مورخہ 28 مارچ 1957 سے ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی خواہشات کے جواب میں فرانسیسی حکومت نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ شہری رضا کار فوج قائم کی جائے۔ اقوام متحدہ نے کہا'' بہت خون بہایا جا چکا ہے'' لاکوستے نے جواب دیا۔ ''ہمیں رضا کار فوج قائم کرنی چاہئے۔''

12- اقوام متحدہ کی اسمبلی نے مشورہ دیا'' جنگ بندی کی جائے۔'' لاکوستے چیخا ہمیں شہریوں کو مسلح کرنا چاہئے۔'' ایسے وقت میں جب کہ آمنے سامنے صف آرا دونوں فریقوں کو اقوام متحدہ کی سفارش پر

ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی دعوت گئی ہے تاکہ وہ سمجھوتہ کرسکیں اور مسئلے کا کوئی پرامن اور جمہوری حل تلاش کرنے کی سعی کریں، لاکوستے نے یہ قانون نافذ کیا ہے کہ اب سے ہر یورپی باشندے کو مسلح کیا جائے۔ تاکہ جو شخص بھی مشکوک نظر آئے وہ اسے گولی کا نشانہ بنادے۔ اسمبلی میں یہ بھی طے پایا تھا کہ حکام کو ہر قیمت پر ایسے وحشیانہ اور ظالمانہ جبر وتشدد کی مخالفت کرنی چاہئے جس نسل کشی کے حدود میں آتا ہو۔ لیکن لاکوستے کی جانب سے اس کا جواب یہ ہے۔ ''ہمیں جبر وتشدد کو منظّم کرکے الجزائر میں باضابطہ انسانی شکار کرنا چاہئے'' اور اس کی علامت کے طور پر وہ فوج کو شہریوں کے اختیارات اور شہریوں کو فوجی اختیارات سونپتے ہیں۔ اس طرح یہ دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ جس کے درمیان غیر مسلح، قحط زدہ، جکڑا ہوا، دھتکارا ہوا، پٹا ہوا، مارا ہوا، الجزائری مشکوک ہونے کے باعث جلد ہی قتل ہو جائے گا۔ آج الجزائر میں کوئی فرانسیسی ایسا نہیں ہے جسے اپنے ہتھیار رکھنے کا اختیار نہ ہو اور یہ کہ اسے ان کے استعمال کی دعوت نہ دی جاتی ہو۔ اقوام متحدہ کی امن کی اپیل کے ایک ماہ بعد الجزائر میں ایک بھی فرانسیسی ایسا نہیں ہے جسے اس بات کی اجازت نہ ہو اور جس کا یہ فرض نہ ہو کہ وہ مشکوک لوگوں کی چھان بین کرے، انہیں تلاش کرے۔ اور ان کا پیچھا کرے۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی آخری قرارداد پاس ہونے کے ایک ماہ بعد الجزائر میں ایک یورپی باشندہ بھی ایسا نہیں ہے جو عہد جدید کے انتہائی دہشتناک نسلی استیصال کے کام میں شامل نہ ہو۔ یہ ہے جمہوری حل؟ ٹھیک ہے! لاکوستے کو کہنا ہے کہ ہمیں الجزائریوں کے قتل عام سے شروعات کرنی چاہئے اور اس کام کے لئے ہمیں شہریوں کو مسلح کرکے انہیں مکمل اختیارات دے دینے چاہئیں۔ بحیثیت مجموعی پیرش کے اخبارات نے اپنی آرا محفوظ رکھتے ہوئے مسلح گروہوں کی تشکیل کا خیر مقدم کیا ہے۔ ان گروہوں کو فاشٹ ملیشیا کہا گیا ہے۔ لیکن انفرادی سطح پر، انسانی حقوق کی سطح پر، ایسا استعمار جس کی جڑیں روایتی نوآبادیاتی ملک میں گہری ہوں۔ اگر فاشزم نہیں تو اور کیا ہے؟۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ انہیں تو باقاعدہ منظّم کیا گیا ہے لیکن کیا الجزائر کے جسم پر لگے ہوئے ایک سو تیس برس پرانے زخم زیادہ پھیلتے اور بڑھتے نہیں جارہے ہیں۔ کیا وہ تعداد اور گہرائی کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہورہے ہیں؟۔ پارلیمان میں ایم۔ آر۔ پی کے نمائندے موسیو کنے وگنس یہ رائے دیتے ہیں۔ ''ذرا ہوشیار ہو جایئے، کیا ہم اس رضاکار فوج کی تشکیل سے الجزائر کی دونوں قومیتوں کے درمیان فاصلہ بڑھانے کا خطرہ مول نہیں لے رہے

ہیں؟'' یہ صحیح ہے۔مگر کیا نو آبادیاتی نظام ایک پوری قوم کو غلامی کی سطح پر لانے کی منظّم کوشش میں ہے؟۔ الجزائر کا انقلاب اسی غلامی اور اسی قعر مذلت کی مثبت نفی ہے۔الجزائری انقلاب قابض قوم سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہتا ہے۔''الجزائر کے خون آلود جسم سے اپنے پنجے نکالو! الجزائری عوام کو بولنے دو!''

ان کا کہنا ہے کہ رضا کار فوج کی تشکیل اصل فوج کا کام ہلکا کر دے گی۔اس کی باعث فوج کے کچھ دستے فارغ ہو جائیں گے جن کے ذمہ مراکش اور ٹیونس کی سرحدوں کی حفاظت ہو گی۔الجزائر میں چھ لاکھ کی تعداد میں کثیر فوج موجود ہے۔تقریباً تمام بحری اور ہوائی فوج بھی یہاں مقیم ہے۔چاق و چوبند پولیس ان گنت تعداد میں ہے جس نے خوفناک حد تک اعلیٰ کارنامے سرانجام دیئے ہیں اور جس میں مراکش اور ٹیونس کے سابق اذیت دہندگان شامل کر لے گئے ہیں۔ایک لاکھ کی کثیر تعداد میں مقامی فوجی دستے بھی ہیں۔بہر حال فوج کے کاموں کو ہلکا کرنا ہی ہے لہٰذا ہمیں شہری رضا کار فوج کی تشکیل بھی کرنی چاہئے یہ حقیقت ہے لاکوستے اپنا ہذیانی اور مجرمانہ جنون بالغ نظر فرانسیسی عوام پر بھی ٹھونس رہا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ رضا کار فوج کی تشکیل اپنے تضادات کو خود اپنے جواز میں بھی ظاہر کرتی ہے۔فرانسیسی فوج کا کام کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔نتیجتاً جب انہیں الجزائری عوام کا منہ بند کرنے کا کام سونپا جاتا ہے تو مستقبل کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند سمجھنا چاہئے۔مزید برآں الجزائری انقلاب کا تجزیہ کرنا، اسے سمجھنا، اس کی گہرائی اور وزن کا اندازہ کرنا بھی ممنوع ہے۔شعبہ جاتی رہنما، رہائشی بستیوں کے رہنما، گلیوں کے رہنما، گھروں کے رہنما، زمینوں کی حفاظت کرنے والے رہنما.....اور آج تو صورت حال یہ ہے کہ اس اوپری سطح کے نقشہ کے علاوہ زیر زمین کام کرنے والوں کا بھی ایک جال بچھا ہوا ہے۔

اڑتالیس (48) گھنٹوں میں دو ہزار رضا کاروں کی بھرتی ہوئی۔یورپی باشندوں نے لاکوستے کی دعوت قتل پر فوراً لبیک کہا، طے پایا کہ اب سے ہر یورپی اپنے علاقے کے تمام زندہ الجزائریوں پر نگاہ رکھے۔علاوہ ازیں وہ اطلاعات کی بہم رسانی، دہشت پسندی کے ہر فعل کے ''فوری جواب''، مشکوک لوگوں کی نشاندہی، فرار کنندگان کی گرفتاری اور پولیس کے کاموں میں امداد کرنے کا ذمہ دار بھی ہو گا۔یقیناً فوج کا بوجھ ہلکا کرنا چاہئے۔آج اوپری سطح کی صفائی کے ساتھ گہرائیوں کو ہموار کرنے کا کام بھی بڑھ گیا ہے۔آج اس قتل میں جو روزمرہ کا معمول تھا۔منصوبے کے تحت قتل کرنے کا کام بھی شامل ہو گیا ہے۔ اقوام متحدہ نے مشورہ دیا ''خونریزی بند ہو'' اور لاکوستے نے جواب دیا ''اس کے لئے سب سے بہتر طریقہ

یہ ہے کہ بہنے کے لئے خون ہی نہ چھوڑا جائے۔'' الجزائری عوام کو ماسو کی فوجوں سے سپرد کر دینے کے بعد شہری رضا کاروں کی حفاظت میں دے دیا گیا ہے۔ ان رضا کاروں کی تشکیل سے لاکوستے نہایت واضح انداز میں یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اب ''اپنی'' جنگ میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرے گا۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک بار انحطاط کا عمل شروع ہو جائے تو پھر اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اس وقت خود حالات کا اسیر ہے۔ لیکن خود کرنے کے بعد دوسروں کو کھینچ کھینچ کر گرانے میں کیا تسلی ملتی ہے!

اس قسم کے ہر فیصلے کے بعد الجزائری عوام کے اعصاب اور زیادہ تن جاتے ہیں اور وہ زیادہ تندی سے جنگ کرتے ہیں۔ اس قسم کے تمام منظّم قتل عام کے منصوبوں کے بعد الجزائری عوام کی خود آگہی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور ان کی مزاحمت زیادہ ہو جاتی ہے ہاں، فرانسیسی افواج کا دائرہ کا واقعی لامحدود ہے۔ اس لئے کہ الجزائری عوام کا اتحاد بھی تو لامحدود ہے۔

یہی سبب ہے کہ جب جنگ شروع ہوتی ہے تو قیدی نہیں بنائے جاتے۔ مقامی رہنماؤں کی سیاسی تربیت کے باعث ہی تحریک کے سربراہ عوام سے یہ باتیں تسلیم کرا لیتے ہیں کہ: (1) نوآبادکار ملک سے آئے ہوئے لوگ ہمیشہ اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کرتے اور بسا اوقات تو وہ جنگ سے بھی متنفر ہوتے ہیں۔ (2) تحریک کے لئے یہ بات سودمند ہوتی ہے کہ اس کی حمایت کرنے والے اپنے عامل سے یہ ثابت کریں کہ وہ بعض بین الاقوامی ضابطوں کا احترام کرتے ہیں۔ (3) فوج جب قیدی بناتی ہے تو وہ فوج ہوتی ہے، اور پھر اسے سرراہ لوٹ کرنے والوں کا گروہ تصور نہیں کیا جاتا۔ (4) خواہ حالات کچھ بھی ہوں، قیدیوں کی موجودگی دباؤ ڈالنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس بات کو کبھی بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اسی طرح ہم اپنے آدمیوں کی حفاظت کر سکتے ہیں جو دشمن کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔

13- آج کل کے بین الاقوامی حالات میں سرمایہ داری افریقی اور ایشیائی نوآبادیوں کی محض اقتصادی ناکہ بندی پر اکتفا نہیں کرتی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کاسترو کے خلاف ریشہ دوانیوں سے انسانی آزادی کی طویل جدوجہد کی کہانی میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی ہے۔ لاطینی امریکہ جو نوآزاد ریاستوں پر مشتمل ہے اور اقوام متحدہ میں بیٹھ کر طوفان کھڑے کرتا ہے، افریقہ کے لئے ایک سبق ہونا چاہئے۔ ان سابقہ نوآبادیوں نے اپنی آزادی کے بعد دہشت اور انتہائی غربت کے ساتھ مغربی سرمایہ

داری کے انتہائی شرمناک تسلط کا سامنا کیا ہے۔

افریقہ کی آزادی اور نوع انسانی میں شعور کی بیداری کی وجہ سے لاطینی امریکہ کے عوام کے لئے یہ ممکن ہوا ہے کہ وہ مطلق العنان حکمرانوں کے اس چکر سے علیحدہ ہوسکیں، جہاں ہر نئی حکومت پچھلی حکومت سے مکمل مطابقت رکھتی تھی۔ کاسترو نے کیوبا میں طاقت حاصل کی، اور اسے عوام کے حوالے کر دیا۔ امریکی نیکیوں کے لئے یہ بدعت پوری قوم کے لئے تازیانہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ریاست ہائے متحدہ انقلاب کے مخالف دستوں کی تنظیم اور انقلاب دشمنوں کی عبوری حکومت کی تشکیل کر رہی ہے، گنے کی فصلوں کو آگ لگا رہی ہے اور کیوبا کے عوام کو بے دردی کے ساتھ جکڑنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ لیکن یہ کام مشکل ہے۔ کیوبا کے لوگوں پر مشکلات تو ضرور پڑیں گی لیکن وہ فتح یاب ہوں گے۔ برازیل کے صدر جانتو کوآڈروس نے ایک تاریخی اہمیت کے اعلان میں کہا ہے کہ ان کا ملک ہر ممکن طریقے سے کیوبا کے انقلاب کی حفاظت کرے گا۔ ممکن ہے ریاست ہائے متحدہ کو بھی عوام کے واضح فیصلے کے سامنے پیچھے ہٹنا پڑے۔ جب وہ وقت آئے گا تو ہم فضا میں اپنے جھنڈے لہرائیں گے کیونکہ دنیا بھر کے مردوں اور عورتوں کے لئے وہ ایک فیصلہ کن لمحہ ہوگا۔ یہ خدائی قوت والا ڈالر، جس کے ضامن بہرطور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے غلام ہیں۔ یعنی مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخیروں میں، پیرو اور کانگو کی کانوں میں، یونائیٹڈ فروٹ یا فائر اسٹون باغات میں، اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ بھی ان غلاموں پر حکمرانی نہ کر سکے گا جنہیں اس نے غلام بنایا ہے اور جو اپنے خالی سر اور خالی پیٹ کے ساتھ اسے مسلسل اپنے خون سے سیراب کر رہے ہیں۔

14- بعض ممالک کو جن میں یورپی باشندوں کی بڑی بڑی آبادیاں تھیں، آزادی کے ساتھ پختہ مکان اور کھلی سڑکیں بھی ملیں۔ مگر وہ افلاس زدہ اور بھوکے علاقوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ ممالک ایک طرح کی رازدارانہ خاموشی سے تاثر یہ دیتے ہیں کہ ان کے شہر بھی آزادی کے وقت ہی بنے ہیں۔

15- یہ درست ہے کہ جرمنی نے اپنا تمام تاوان ادا نہیں کیا۔ ان جرمانوں کا جو شکست خوردہ قوم پر کئے گئے تھے۔ پوری طرح مطالبہ نہیں کیا گیا کیونکہ دعوے دار ممالک نے جرمنی کو بھی اشتراکیوں کے خلاف اپنے دفاعی نظام میں شامل کر لیا ہے۔ جب استعماری ممالک اپنی سابقہ نوآبادیوں سے، اگر مغربی دفاعی نظام میں مکمل شمولیت نہیں تو کم از کم فوجی اڈوں اور فوجی حصاروں کا مطالبہ کرتے ہیں، تو اس وقت

یہی بات ان کے لئے ایک مستقل محرک قوت ہوتی ہے۔ دوسری طرف انہوں نے نیٹو کی فوجی ضروریات کے پیش نظر اور آزاد دنیا کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے تمام مطالبات کو نظر انداز کر دینے کا متفقہ فیصلہ کر لیا ہے۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ جرمنی لاتعداد ڈالر اور مشینیں وصول کر رہا ہے۔ مغربی حلقے کے لئے ایک بار پھر ایسے جرمنی کی ضرورت تھی جو مضبوط اور طاقت ور ہو اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو۔ یہ بات نام نہاد آزاد یورپ کے سمجھے بوجھے مفاد میں تھی کہ ایک خوشحال اور از سر نو تعمیر شدہ جرمنی سامنے آئے جو آئندہ سرخ افواج کے لئے پہلی رکاوٹ بن سکے۔ جرمنی نے یورپی بحران سے قابل تعریف حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک اسی جرمنی سے جائز تلخی محسوس کرتے ہیں جو کل تک تو ان کے قدموں میں پڑا تھا۔ لیکن آج اقتصادی میدان کے گردن توڑ مقابلے میں ان سے آنکھیں ملا رہا ہے۔

16- یورپ میں سوشلزم کی تعمیر اور تیسری دنیا سے تعلق کے بارے میں (گویا اس سے ہمارا تعلق محض خارجی ہے) بنیادی فرق اس بات سے پیدا ہوگا کہ آیا ہم یہ جانتے ہیں یا نہیں جانتے کہ پسماندہ علاقوں کی آزادی کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی ورثہ کی تقسیم کے لئے بھی قدم اٹھانا ضروری ہے۔ وگرنہ یہ محض سامراجی ڈکیتی کی لوٹ مار کے سرمایہ کی بنیاد پر ایک پر لطف سوشلزم کی تنظیم کی خواہش ہوگی، جس طرح ڈاکوؤں کے گروہ کے اندر ناجائز مال برابر برابر تقسیم ہوتا ہے، البتہ ایک مختصر حصہ خیرات کے طور پر غریبوں میں بھی بانٹ دیا جاتا ہے۔ اور یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جن سے دراصل یہ مال چرایا گیا تھا۔

مارسل پیجو۔

مضمون ''ڈیگال کے لئے مرنا''.....

رسالہ

اکتوبر.....نومبر 1960

17- 1961 میں لکھا گیا (مترجم)

18- محمد الضیاء۔ نیسیاں افریکا نے اسے سالیدارتے مودیال پریس یونیورستیاری دا فرانس

19- محمد الضیاء حوالہ سابقہ

20- سیکوطورے ''سیاسی رہنما ایک تہذیبی نمائندے کے طور پر''

سیاہ فام مصنفوں اور فنکاروں کی دوسری کانگریش سے خطاب، روم 1959

21- ''رینے ڈیپسٹر۔فیس الانوی''

رینے شار.... پارتاژ فارمل

22-ڈالر میں اسکول کے آخری جلسہ تقسیم انعامات پر سینیگال جمہوریہ کے صدر لیو پولڈ سینگھور نے نیگروازم کے تصور کے مطالعے کو نصاب میں شامل کر لینے کا فیصلہ کیا۔اگر یہ فیصلہ تاریخی اسباب وعلل کے مطالعہ کی خواہش کے طور پر کیا گیا تو کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔اگر یہ سیاہ فام خود شعوریت پیدا کرنے کے لئے کیا گیا ہے تو یہ محض اس تاریخی حقیقت سے نگاہیں پھیر لینے کے مترادف ہے جو پہلے ہی سے یہ جان چکی ہے کہ نیگروؤں کی اکثریت غائب ہوتی جا رہی ہے۔

23-''الجزائری انقلاب کا پانچواں سال'' کے پہلے دو ایڈیشنوں کے غیر مطبوعہ تعارف میں ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ الجزائریوں کی ایک پوری نسل وحشیانہ قتل عام میں گھری ہوئی ہے اور جس کا نتیجہ وہ تمام نفسیاتی وجذباتی کوائف ہیں جو اس سے وابستہ ہیں۔اب یہی نسل الجزائر میں انسانی طور پر فرانس کی ورثہ دار ہوگی۔ وہ فرانسیسی لوگ جو الجزائر میں اذیت رسائی کی مذمت کرتے ہیں، مسلسل ایک ایسا نقطہ نظر اپنائے ہوئے ہیں جو مکمل طور پر فرانسیسی ہے۔ہم اس نقطہ نظر پر ان کی ملامت نہیں کرتے محض ان کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہیں۔وہ اصل اذیت دہندوں کے ضمیر کی حفاظت کے خواہش مند ہیں جن کے پاس آج کام جاری رکھنے کے لئے تمام تر قوتیں موجود ہیں۔اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ فرانس کے نوجوان اخلاقی طور پر آلودہ نہ ہوں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم مکمل طور پر اس رویے کے ساتھ ہیں۔ یہاں اکٹھے کئے گئے بعض نکات، خاص طور پر سلسلہ الف کے کیس نمبر 14 اور 5، اس غلبہ وہم کی افسوس ناک مثالیں اور جواز ہیں جو جمہوریت پر یقین رکھنے والے فرانسیسیوں کے ذہنوں پر مسلط ہے۔لیکن ہمارا مقصد بہر کیف، اس اذیت رسائی کو عیاں کرنا ہے، جو متوقع طور پر اذیر یافتہ شخص کی شخصیت کو بری طرح تہہ وبالا کر دیتی ہے۔

24-ان امراض کو جنم دینے والے حالات کئی وجوہات کی بنا پر دلچسپ ہیں۔اپنے ملک کے اعلان آزادی کے چندہ ماہ بعد اس مریض نے سابق استعماری قوت کے بعض افراد سے تعلقات پیدا کر لئے اور وہ لوگ اسے بہت اچھے لگے۔ان عورتوں اور مردوں بڑے جذبے کے ساتھ نو آزاد ملک کو مبارک باد دی

اوران محبان وطن کوخراج عقیدت پیش کیا جوقومی آزادی کی جدوجہد کے لئے لڑے تھے۔اس پر سابق رضا کار کووہ دورہ پڑا جسے سر چکرانا کہا جاتا ہے۔اسے گھبراہٹ کے احساس کے ساتھ یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں ان لوگوں میں جواس کے بم کا نشانہ بنے شناساؤں کی طرح کے لوگ بھی شامل نہ ہوں۔ یہ درست ہے کہ وہ قہوہ خانہ جسے نشانہ بنایا گیا۔بدنام نسل پرستوں کے اڈے کے طور پر مشہور تھا لیکن ایک بالکل عام راگیر کو جو وہاں کھانے پینے کے لئے داخل ہوگیا ہو، بچانے کا بھی تو کوئی بندوبست نہ تھا پہلے روز سے ہی جب اس کا چکرایا اس نے ان پرانے واقعات کے بارے میں سوچ بچار سے بچنے کی کوشش کی۔لیکن متناقص طور پر، اس خاص تاریخ سے چند روز پہلے ابتدائی علامتیں ظاہر ہوئیں اور پھر وہ علامتیں بڑی باقاعدگی سے ظاہر ہوتی رہیں۔

دوسرے الفاظ میں ہمارے افعال ہمیشہ ہمارا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔خواہ ان کی ترتیب، ان کے حالات اوران کے محرکات بھرپورطور پراثرات کے مطابق کیوں نہ تبدیل ہوجائیں۔ یہ محض ان پھندوں میں سے ایک ہے جو تاریخ اوراس کے مختلف اثرات ہمارے لئے تیار رکھتے ہیں۔لیکن کیا ہم اپنے سر کو چکرانے سے بچاسکتے ہیں؟اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ سر چکرانا پورے وجود پر مسلط نہیں ہوتا؟

25-طبی قانون کے ماہرین کی رپورٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے، جس میں اس فعل کی غرضیانہ نوعیت پرزوردیا گیا تھا، وہ قانونی کارروائی جسے جنرل سٹاف نے شروع کیا تھا، ختم کردی گئی۔

26-ان مشاہدات کے ساتھ ہم اپنے آپ کوایک ایسے مربوط نظام میں پاتے ہیں جو کسی شے کو بھی محفوظ نہیں چھوڑتا۔ایسا جلاد جسے پرندوں سے عشق ہواور جو کسی راگ یا گیت کے سکون سے لطف اندوز ہوتا ہے، اس پورے عمل کی محض ایک کڑی ہے۔اس سے آگے چل کر شاید ہمیں پوراوجود ہی مکمل اور حتمی ایذارسانی میں مبتلا نظر آئے۔

27-رواط ایک گاؤں ہے جو 1956 کے ایک خاص روز کے بعد الجیرز کے گردونواح میں شہرت پا گیا ہے۔وہ اس وجہ سے کہ اس شام اس گاؤں پر فوج نے حملہ کیا اور سوئے ہوئے آدمیوں کو بستروں کے باہر گھسیٹا، بعدازاں ان سب کو قتل کر دیا۔

28-1955 کے دوران میں الجزائر میں اس قسم کے بے شمار کیس ہوئے۔ بدقسمتی سے ایسے تمام مریضوں کا ایسا مقدر نہیں تھا کہ انہیں ہسپتال بھیجا جاتا۔

29-زیادہ دباؤ کے ساتھ دیئے گئے ایسے حقنے کے بعد انتڑیوں کی رطوبت خارج کرنے والی نرم جھلی لاتعداد خراشوں سے بھر جاتی ہے جس کے باعث انتڑیوں میں باریک باریک سوراخ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح گیس ایمبولزم اور پیٹ کی موٹی چربی پر ورم پیدا ہو جانے کی بیماریاں عام ہو جاتی ہیں۔

30-اس قسم کی اذیت اموات کی بہت بڑی تعداد کا باعث ہوتی ہے۔

31-ظاہر ہے کہ یہاں ہم ان الجزائریوں کا ذکر کر رہے ہیں جنہوں نے کچھ جانتے ہوئے بھی اذیت کر کسی بات کا اعتراف نہ کیا۔ یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ اس الجزائری کو جو اعتراف کر لے بعد میں فوراً مار دیا جاتا ہے۔

32-ہسپتال کے عملہ کے آدمی دن رات مریض کے پاس بیٹھ کر اسے معاملات سمجھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں پر ''ذرا سختی برتو'' کا کلیہ کسی کام نہیں آ سکتا۔

33-یہ انسدادی اذیت بعض علاقوں میں ''انسدادی جبریت'' بن جاتی ہے۔ لہٰذا رواط میں، جہاں باوجود اس کے کہ امن و امان تھا، نوآبادکار یہ نہ چاہتے تھے کہ وہ بےخبری کا شکار ہو جائیں گردونواح کے علاقوں میں سرگرمیاں شروع ہو گئی ہیں۔ اس لئے انہوں نے سیدھا سادا فیصلہ یہ کیا کہ قومی محاذ آزادی کے متوقع اراکین کو ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا ایک دن میں ہی چالیس سے زیادہ الجزائری مار ڈالے گئے۔

34-درحقیقت یہ ''خارجیہ'' ہرگز نہیں ہے۔ الجھن صرف شخصیت کے حرکی ارتقاء کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس میں کوئی ''عضو خارجیہ'' نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہمیں محض یہ کہنا چاہئے کہ مسئلہ محض ''جسم کی غلط تنظیم'' کا ہے۔

35-اسی طرح سے ہم یہاں ان ماہرین نفسی طب کا بھی حوالہ دے سکتے ہیں جو فرانس کی موجودگی کی تحریک کے سب سے بڑے محرک تھے اور جب انہیں کسی قیدی کے بارے میں پیشہ وارانہ رائے دینے کے لئے کہا جاتا تو شروع ہی سے وہ یہ دعویٰ کرنا شروع کرتے کہ قیدی کا دفاع کرنے والے وکیل کے ساتھ ان کی بہت دوستی ہے اور اس طرح قیدی کو یقین دلاتے کہ وہ دونوں (وکیل اور ماہر نفسی طب) اسے چھڑانے میں اس کی مدد کریں گے۔ وہ تمام قیدی جنہیں ماہرین کی پیشہ وارانہ رائے میسر آئی پھانسی پا گئے۔ یہ ماہرین نفسی طب نہایت سلیقہ سے ''رکاوٹوں'' پر قابو پانے کے اس طریق کار کو ہمارے سامنے بڑے فخر سے پیش کرتے تھے۔

36- ہم جانتے ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نفسی عمرانیات کی جانب ایک میلان پیدا ہو گیا ہے۔ اس مکتب فکر کے حامی یہ خیال کرتے ہیں کہ عہد حاضر کے فرد کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اب وہ کوئی کردار ادا نہیں کرتا اور آج کل کے سماجی حالات اسے محض مشین کے پرزے کے طور پر زندہ رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس سے ایک ایسے معالجے کی تجویز سامنے آتی ہے جو فرد کو عمل کے ٹھوس کھیل میں مختلف کردار ادا کرنے دیتا ہے۔ کوئی شخص کوئی بھی ادا کرسکتا ہے، بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی دن میں ایک شخص کا کردار بدل بھی جاتا ہے، علامتی طور پر آپ اپنے آپ کو کسی بھی شخص کی جگہ دے سکتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ کے کارخانوں کے ماہرین نفسی طب کارخانوں کے مزدوروں میں اس اجتماعی نفسی علاج کے سلسلے میں بڑے بڑے قدم اٹھا رہے ہیں۔ درحقیقت موخرالذکر خود کو ہیرو سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح کارخانہ دار اور مزدوروں کے کشیدہ تعلقات بڑی حد تک سدھر جاتے ہیں۔

37- یہ اصطلاح جو ایک آئیڈلسٹ تصور کا اظہار سے کم سے کم استعمال کی جاتی ہے۔ درحقیقت قشری احشائی (کارٹیکو ویسرل) کی اصطلاح جو روسی تحقیق بالخصوص پاؤلوف کی تحقیق سے مستعار ہے کم از کم یہ خوبی رکھتی ہے کہ اس نے دماغ کو اپنی جگہ پر رکھا ہے۔ گویا یہ دماغ کو وہ مرکزی عضو خیال کرتی ہے جہاں نفسی کیفیات اپنی پوری تفصیل کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔

38- جتنا کوئی شخص اعصابی سطح پر ترقی یافتہ ہوگا اتنی ہی کم اس میں وہ چیزیں ہوں گی جو دماغی تنظیم سے خارج ہوں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں ہر چیز میں مطابقت ہے۔

39- یہاں یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہاں ہسٹریائی تناؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

40- حقیقت میں ہم جانتے ہیں کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو اس وقت تک جانور کا گوشت کھانے سے منع کرتا ہے جب تک کہ یقین نہ ہو جائے کہ جانور کا تمام خون نکل چکا ہے۔ اسی وجہ سے جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے۔

41- پروفیسر اے پورو طبی نفسیاتی وقاع (میڈیکو سائیکلوجیکل اینگلس) 1918

42- الجزائر کی ایک عدالت کے ایک منصف اعلیٰ کی زبان میں الجزائریوں کی یہ جارحیت ''عجوبہ پسندی'' میں اپنا اظہار پاتی ہے۔ 1955 میں انہوں نے یہ کہا کہ ''اس ساری بغاوت کو سیاسی سمجھنے میں ہم غلطی پر ہیں۔ چھینا چپٹھی کی چاہت کو جوان لوگوں میں پائی جاتی ہے، وقتاً فوقتاً باہر آنا ہی پڑتا ہے۔''

ماہرین علم اللسان کے نزدیک آزمائشوں اور انعکاشی کھیلوں کا ایسا سلسلہ جو مقامی باشندوں کی آفاقی جارحانہ جبلتوں کے لئے نئی راہیں معین کرسکتا، 56-1955 میں ہی آوز رکی بغاوت کر سکتا تھا۔

43- کیروتھرز۔افریقیوں کی عام اور مریضانہ نفسیات (نارمل اینڈ پیتھو لاجیکل سائیکوجی آف افریقین نفسی اور نفسیاتی مطالعہ (ایتھنو سائیکوجیکل اسٹڈیز) ایڈیشن میسن

44-ایضاً صفحہ 176

45-ایضاً صفحہ 178

46-مزید برآں یہ واضح ہے کہ یورپیوں کی تخلیق کی ہوئی اس تمثالی تصویر کے ساتھ مطابقت متضاد کیفیات کی حامل ہے۔دراصل اس الجزائری کو جو متشدد، جوشیلا، وحشی، حاسد، متکبر اور دیدہ دلیر ہے اور جو کسی معمولی بات کے لئے یا ایک لفظ کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے، یورپی خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔مگر یہ خراج عقیدت بھی متضاد کیفیات کا حامل ہے۔ہمیں چلتے چلتے یہ بھی واضح کر دینا چاہئے کہ فرانس کے فرانسیسیوں کے ساتھ اپنے معاملات میں الجزائر کے یورپی خود کو فرانسیسی کردار کے مقابلے میں الجزائری کردار کے ساتھ زیادہ سے زیادہ متماثل کرتے ہیں۔

پڑھنے والوں سے

اس کتاب کو رضیہ سلطانہ نے marxists.org\urdu کے لئے کمپوز کیا۔

marxists.org کا اردو سیکشن آپ کا بہت شکر گزار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے مواد اور اس کے ترجمے کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم آپ کے شکر گذار ہوں گے۔

اپنی رائے کے لئے درج ذیل پتے پر ای میل کریں:

hasan@marxists.org

اس کے علاوہ اگر آپ اردو یا کسی اور زبان کے سیکشن کے لئے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کرنا چاہیں تو انسانی علمی ترقی میں آپ کا حصہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔